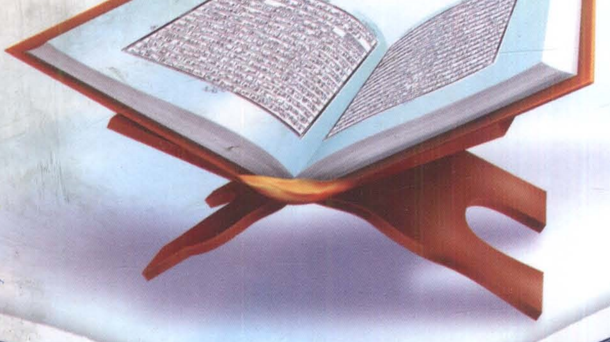
نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ

تفسیر سورۃ یوسف علیہ السلام

پروفیسر حافظ محمد سعید



اعداد

حافظ یوسف سراج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

هدية

لفضيلة الدكتور / [illegible] حسن [illegible] حفظه الله

أسأل الله أن ينفع به ، آمين

من أخيه ، [illegible]

بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ

تفسیر سورۂ یوسف

پروفیسر حافظ محمد سعید

تحریری قالب

حافظ یوسف سراج



دارالاندلس ® اسلام کی نشر واشاعت کا عالمی مرکز

۲ لیک روڈ چوبرجی لاہور پاکستان

Ph: 92-42-7230549
Fax: 92-42-7242639
www.dar-ul-andlus.com

نام کتاب

تفسیر سورۃ یوسف

دروس

پروفیسر حافظ محمد سعید

تحریری قالب

حافظ یوسف سراج

سرورق	ضیاء الرحمٰن
کمپوزنگ	محمد شفیق
ناشر	دار الاندلس
قیمت	

دار الاندلس ® اسلام کی نشر و اشاعت کا عالمی مرکز
۴-لیک روڈ، چوبرجی لاہور، پاکستان
Ph: 92-42-7230549 Fax: 92-42-7242639 www.dar-ul-andlus.com

تفسیر سورۃ یوسف

منصبِ رسالت پر الٰہی توضیحات

عرضِ ناشر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، اَمَّا بَعْدُ!

''تفسیر سورۂ یوسف'' محترم پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ کے ان دروس پر مشتمل ہے جو انھوں نے کارکنان کی تربیتی نشستوں میں ارشاد فرمائے اور جنھیں حافظ یوسف سراج نے تحریر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔

سورۂ یوسف قرآن مجید کی وہ واحد سورت ہے جو اپنے اسلوبِ بیاں، ترتیبِ بیاں اور حسنِ بیاں میں باقی سے منفرد اور نمایاں ہے۔ پوری سورۂ مبارکہ کا مضمون سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت کے نہایت اجلے پہلو، عفت و عصمت اور پاکیزہ سیرت و کردار پر مشتمل ہے۔

عصرِ حاضر میں جس طرح عفت و عصمت اور سیرت و کردار کو ثانوی حیثیت دے کر عریانی، فحاشی، بداخلاقی اور حیا باختگی کا چلن عام کیا جا رہا ہے۔ میڈیا کی یلغار سے جس طرح گھر اور بازار کا فرق مٹ رہا ہے اور جس طرح سے اخلاقیات پامال ہو رہی ہیں تو ان حالات میں لازم تھا کہ پورے مسلم معاشرے کو بالعموم اور کارکنانِ دعوت و جہاد کو بالخصوص اس شیطانی یلغار کے مقابل تحفظِ سیرت و کردار کے لیے قرآنی رہنمائی سے مسلح کیا جائے۔ سورۂ یوسف اس سلسلے میں بہترین انتخاب ہے کہ جس میں نہایت وضاحت سے بتا دیا گیا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کس جرأتِ اطوار اور کس پختگیٔ کردار سے پرکشش دعوتِ گناہ کو ٹھکرا دیا۔ کس طرح قید و بند اور زنجیر و زنداں کی صعوبتیں برداشت کر لیں مگر موتی سے جگمگاتے کردار اور ہیرے کی سی ٹھوس سیرت پر کوئی داغ نہیں آنے دیا۔ پھر بھائیوں کے ظلم و حسد کے مقابل جس فراخ حوصلے اور اعلیٰ ظرف کی تابناک مثالیں پیش کیں، انھیں بھی آج کے عہد میں سمجھنے، جاننے اور اپنانے کی از حد ضرورت ہے۔

محترم پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے کہ وہ جہاں تحریک

دعوت و جہاد کے میر کارواں ہیں وہیں امتِ مسلمہ کے اتحاد کے عظیم داعی بھی ہیں اس کا بہترین اظہار آپ سورۂ یوسف کی تفسیر میں بھی پائیں گے۔ آج کے پرفتن دور میں وارثانِ انبیاء کا کیا کردار ہونا چاہیے۔اپنوں کے لیے ''بریشم کی طرح نرم'' اور ''رزمِ حق و باطل کے لیے فولاد'' بننے والوں کے لیے اس سورۂ مبارکہ کی تفسیر کا مطالعہ نہایت لازم ہے۔

یہ عجب اتفاق ہے کہ جب محترم پروفیسر حافظ محمد سعید صاحب کی ''تفسیر سورۃ التوبہ'' ستمبر ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی تو اس وقت وہ جرمِ جہاد کی وجہ سے ''سب جیل شیخوپورہ'' میں نظر بند تھے اور آج جب ''تفسیر سورۂ یوسف'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں تو ان کے گھر کو سب جیل قرار دے کر ان کی آواز دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔لیکن ہم امید رکھتے ہیں کہ دشمن کے تمام عزائم ناکام ہوں گے اور دین حق کا پرچم دنیا کے ہر افق پر لہرائے گا۔ان شاء اللہ

دروس کو کیسٹ سے کاغذ پر بعینہٖ منتقل کرنے کا دقت طلب کام حافظ محمد شفیق غفور نے نہایت جانفشانی اور محبت سے سرانجام دیا۔کتاب کی کمپوزنگ محمد شفیق اور پروف ریڈنگ حافظ زاہد نے نہایت محنت سے کی۔اللہ سب کی محنت قبول فرما کر جزائے خیر سے نوازے۔آمین!

امید ہے کارکنان دعوت وارشاد، مسئولین اور تمام مسلمان مرد وخواتین اس مفید تحفے سے بھرپور استفادہ کریں گے۔خود پڑھ کر اپنی اصلاح کی کوشش کریں گے اور دوست احباب کو تحفے میں دے کر اصلاحِ معاشرہ اور دعوتِ دین کے فروغ میں اپنا کردار ادا کریں گے۔

سیف اللہ خالد

مدیر دارالاندلس

۲جمادی الاول ۱۴۳۰ھ/28اپریل 2009ء

مقدمہ تفسیر سورۂ یوسف

از

پروفیسر حافظ محمد سعید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى اَشْرَفِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ،

اَمَّا بَعْدُ!

قصص الانبیاء قرآن کا اہم موضوع ہے انبیاء کی دعوت، قوموں کے نبیوں کے ساتھ رویے اور نافرمانوں پر اللہ کے عذابات کا ذکر قصوں میں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے قصے قرآن میں زیادہ بیان ہوئے اور مختلف سورتوں اور مقامات میں موجود ہیں اور دیگر انبیاء کے عمومی تذکرے اور ان کے چیدہ چیدہ واقعات قرآن میں پھیلا کر بیان کیے گئے ہیں، لیکن یوسف علیہ السلام کا تذکرہ مختلف انداز سے ملتا ہے سورہ یوسف کے آغاز سے آخر تک یوسف علیہ السلام کا واقعہ تسلسل کے ساتھ مذکور ہے یہ قرآن کا بیان کردہ نادر انداز ہے۔ اسے خود قرآن نے احسن القصص قرار دیا ہے۔

ہم یہاں واقعہ کے کچھ پہلو بیان کرتے ہیں جنہیں قرآن نے بیان کر کے تربیت کے اسباق واضح کیے ہیں سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے والد یعقوب علیہ السلام کو اپنا خواب سناتے ہیں کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو اپنے لیے سجدہ کرتے دیکھا ہے۔ والد گرامی چونکہ نبی تھے سمجھ گئے کہ یوسف کو اللہ تعالیٰ چن لے گا اور بلند مقام عطا فرمائے گا۔ نصیحت فرمائی کہ خواب بھائیوں کو نہیں بتانا۔ مبادا کہ حسد کی وجہ سے نقصان پہنچائیں۔ لیکن اللہ کو منظور یہی تھا، بھائیوں کو پتہ چل گیا اور انہوں نے یوسف علیہ السلام کے خلاف منصوبہ بنالیا۔ پہلے ہی وہ یوسف کو باپ کی زیادہ توجہ اور محبت کا حامل سمجھتے تھے جب خواب کے بارے میں سنا تو یوسف کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

چنانچہ بڑے خیر خواہ بن کر باپ سے اجازت لے لی اور یوسف کو اپنے ساتھ بکریاں چرانے کے لیے لے گئے منصوبے کے مطابق کنعان کے ایک کنویں میں پھینک دیا اور خون آلود قمیص لا کر باپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ یعقوب علیہ السلام مطمئن نہ ہوئے بلکہ اسے ایک جھوٹ قرار دیا اور اللہ سے دعا اور صبر کا رستہ اختیار کیا۔ یعقوب علیہ السلام کا غم اتنا

شدید تھا کہ روتے روتے آنکھوں کا نور ختم ہو گیا۔ یہاں قرآن نے یعقوب علیہ السلام کے حوالے سے واضح کیا ہے کہ وہ چونکہ نبی تھے۔ اس لیے اپنے ذاتی مسئلے میں بھی صبر اور دعا ہی کرتے چلے گئے۔ اس میں اہل ایمان کے لیے سبق ہے کہ ہر تکلیف پر صبر کریں، ذاتی اور جماعتی معاملات اور مسائل کتنے ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہوں صبر ہی کرنا چاہیے۔ اللہ کو بندے کا صبر بہت پسند ہے اور اس کا بدلہ بھی بہت اعلیٰ دیتا ہے جیسا کہ بعد کے حالات سے معلوم ہو گا۔

ادھر کنویں میں یوسف علیہ السلام اللہ پر توکل اور صبر کا دامن تھامے اللہ کی مدد کے منتظر تھے، دیکھ رہے تھے کہ کوئی مدد کو نہیں پہنچ سکتا۔ جن بھائیوں سے مدد کی توقع ہو سکتی تھی وہ تو سب متفق ہو کر کنویں میں پھینک چکے تھے۔ لیکن مومن کا سہارا تو اللہ پر ہوتا ہے۔ اگر بھائی ظلم کریں تو اس کی شدت بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے لیکن مومن ہر حالت میں اللہ کے لیے صبر کرتا ہے مومن کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ وہ یقین رکھتا ہے کہ میرا اللہ مجھے اس حالت میں دیکھ رہا ہے۔ کوئی آئے نہ آئے میرا اللہ میری مدد ضرور کرے گا۔ یہی تربیت ہے قرآنی واقعات سے یہی تربیت امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کی جا رہی ہے۔

قرآن بیان کرتا ہے کہ ایک قافلہ کنویں کے پاس رکتا ہے، پانی لینے کی غرض سے ایک شخص ڈول کنویں میں ڈالتا ہے تو دیکھتا ہے کہ کنویں میں ایک شخص موجود ہے۔ وہ اہل قافلہ کو آواز دیتا ہے، خوشخبری سناتا ہے، یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالتا ہے اور قافلے والے چھپا کر یوسف علیہ السلام کو مصر لے جاتے ہیں۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں ان کا کوئی وارث نہ مل جائے۔ مصر پہنچ کر انہوں نے یوسف علیہ السلام کو چند کوڑیوں کے عوض بیچ ڈالا۔ خریدنے والا اگرچہ عزیز مصر تھا، ہو سکتا ہے کہ اس نے قیمت بھی اچھی لگائی ہو لیکن قرآن نے چند کوڑیاں کہا کہ یوسف علیہ السلام کو مصر میں کون جانتا تھا کہ یہ کس خاندان کا فرد ہے۔ ان کے باپ یعقوب، دادا اسحاق اور پردادا ابراہیم علیہم السلام جد الانبیاء تھے یہ نبیوں کا خاندان اور خاندانوں میں سے اللہ کا پسندیدہ ترین خاندان اور یوسف علیہ السلام خود بھی نبی بننے والے تھے۔ بعض مفسرین نے اس وقت یوسف علیہ السلام کی عمر سترہ برس بیان کی۔

عزیز مصر یوسف علیہ السلام کو خرید کر اپنے گھر لے گیا، بیوی سے کہا کہ خوبصورت نوجوان سے بڑے احترام سے پیش آنا کہ ہم اسے اپنا بیٹا بنائیں گے۔ عزیز مصر اگرچہ خرید کر لایا تھا لیکن یوسف علیہ السلام کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ وہ انہیں خریدا ہوا غلام کہنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ یوسف کو عزیز مصر نے گھر میں رکھا۔ اس کی حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آگے چل کر

یوسف علیہ السلام نے عزیزِ مصر کی مسئولیت پر فائز ہونا تھا اور یہ بھی کہ یہاں ایک امتحان سے گزرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف کے صبر اور تقویٰ کا مزید امتحان لینا تھا۔ یہی کچھ ہوا۔ اللہ نے اس مقام پر فرمایا کہ بظاہر یوسف تو خریدے گئے تھے کنویں سے نکالنے والوں نے قیمت وصولی کر لی تھی اور بھائیوں نے یوسف کو باپ سے دور کر کے کنویں میں ڈال دیا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [یوسف: ۲۱]
''یعنی اللہ اپنے ارادے پر غالب ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

بھائی نہیں جانتے تھے کہ یوسف کو کس سفر پر روانہ کر رہے ہیں، انھوں نے تو اسے موت کا کنواں سمجھا ہوگا۔ قافلے والوں نے مصر میں بیچ کر پیسے کمانے کا ذریعہ سمجھا ہوگا اور عزیزِ مصر نے خوبصورت دیکھ کر خریدا اور بے اولاد ہونے کی وجہ سے بیٹا بنانے کی کوشش کی، لیکن اللہ کا منصوبہ کچھ اور تھا۔ یہاں یہ عقیدہ پختہ کیا جا رہا ہے کہ معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ وہی انجام اور نتیجے پر قادر ہے۔ وہ شر سے خیر نکالتا ہے۔ اللہ پر توکل رکھنے والے، صبر اور تقویٰ کا دامن تھامنے والے کبھی خیر سے محروم نہیں ہوتے اللہ ان کے لیے خیر کے دروازے کھولتا ہے۔ واقعے کے آغاز پر ہی اللہ نے اپنے ارادے کا اظہار فرما دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض واقعہ بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود اہل ایمان کی تربیت ہے، ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ کی تدبیر ہی غالب ہوتی ہے۔ اللہ کے ہاتھ میں تقدیر ہے بندہ تدبیر تو کر سکتا ہے لیکن اللہ کی تقدیر میں اسے کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہاں وہ اچھی سے اچھی تدبیر کر کے اللہ سے دعا کرے تاکہ اللہ اسے شر سے محفوظ رکھے، حفاظت اللہ کی ہوتی ہے۔ اگر اللہ نہ چاہے تو بندہ کچھ بھی نہیں کر سکتا، اسے کچھ بھی اختیار نہیں مومن بندہ پورے یقین کے ساتھ دعا کرتا ہے اور جانتا ہے کہ ((اِنَّكَ تَقْضِیْ وَلَا یُقْضٰی عَلَیْكَ)) یعنی بیشک اے اللہ تو فیصلہ کرتا ہے اور تجھ پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث مبارکہ میں ہے کہ مومن کی دعا سے تقدیر کو اللہ تعالیٰ بدل دیتا ہے۔ عقیدے کے کمزور بعض لوگ غیر اللہ کے بارے میں یہی کچھ سمجھتے ہیں اور ان سے مدد مانگتے ہیں حالانکہ صحیح ایمان یہ ہے کہ کوئی نبی یا ولی تقدیر میں کوئی دخل نہیں رکھتا اور نہ اس کو بدل سکتا ہے، یعقوب علیہ السلام نبی تھے یوسف علیہ السلام کی جدائی میں بہت روئے حتی کہ بینائی ختم ہوگئی لیکن بھائیوں کو ساتھ لے جانے سے اور کنویں میں پھینکنے سے روک نہیں سکے البتہ خدشات کا اظہار کیا کہ تم یوسف کی حفاظت نہ کر سکو گے اور ڈرے کہ یوسف کو کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے اور جب اخوان یوسف نے جھوٹی خبر دی کہ یوسف کو

بھیڑیا کھا گیا تو کہا کہ خبر اگرچہ جھوٹی ہے لیکن میں صبر کروں گا اور تمہارے جھوٹ پر اللہ سے مدد مانگوں گا یہ نہیں کہا کہ اس کنویں سے نکالتا ہوں جہاں چھوڑ آئے ہو اور نہ ہی قافلے والوں کا پیچھا کیا، نہ علم رکھتے تھے اور نہ ہی کوئی اختیار۔ بس یہی کہا کہ "واللہ المستعان" اللہ سے مدد طلب کرتا ہوں، اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے اللہ نے عقیدہ تقدیر کا سبق پڑھایا ہے اور ایمان پر تربیت فرمائی ہے۔

عزیز مصر کے گھر میں امتحان:

عزیز مصر کی بیوی فتنے میں پڑ گئی خاوند کی خواہش تھی کہ بیٹا بنائے گا لیکن اس کے برعکس یوسف علیہ السلام کے ساتھ برائی کا ارادہ کر بیٹھی۔ یہ بھی صبر اور تقویٰ کا امتحان تھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام بھر پور جوانی میں صبر و ضبط کا کمال مظاہرہ فرماتے ہیں اور تقوی کا معیار پیش کرتے ہیں کہتے ہیں کہ میں اللہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ برائی سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بند کمرے سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بھاگتے ہیں، یہاں قرآن کی تربیت کی دعوت نرالی ہے واضح ہوتا ہے کہ برائی سے بچنے کے لیے کتنی کوشش کرنی چاہیے؟ جب بندہ کوشش کرتا ہے تو اللہ کی مدد کس قدر ہوتی ہے؟ اللہ نے بند دروازے کس طرح کھول دیئے، اس سے بڑا امتحان یہ پیش آیا کہ دروازے سے باہر آئے تو عزیز مصر دروازے پر موجود تھا۔ کیفیت یہ تھی کہ یوسف برائی سے بچنے کے لیے دروازے سے باہر آنا چاہتے ہیں اور عزیز مصر کی بیوی برائی کرنے کے لیے پیچھے بھاگتی ہے اور قمیص پکڑ کر کھینچتی ہے اس کیفیت میں خاوند اپنی بیوی کو اور اپنے زرخرید غلام کو دیکھتا ہے، جب عورت نے دروازے سے باہر اپنے خاوند کو دیکھا تو پینترا بدل گئی اور فوراً بولی یوسف نے میرے ساتھ برائی کا ارادہ کیا تھا اور تمہاری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اسے سخت سزا دیجیے اسے قید میں ڈالیے۔ یوسف علیہ السلام کی اس وقت کیا کیفیت ہوگی یہی کہ اپنے اللہ کو پکارا۔ اللہ کی مدد آئی عزیز مصر کے خاندان کا بچہ بولتا ہے اور یوسف علیہ السلام کی پاکیزگی بیان کرتا ہے۔ عزیز مصر پر بیوی کی غلطی واضح ہو جاتی ہے تو یوسف کی منت سماجت کرتے ہوئے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ عزیز مصر کو اپنی عزت کے بچانے کی فکر ہے کہ بیوی بدنام ہوگی تو خاوند کی عزت کہاں بچے گی۔ لیکن یوسف علیہ السلام کے سامنے ایمان بچانے کی فکر، کہ جس کا ایمان محفوظ رہ جائے اللہ اس کی عزت بھی بچا لیتا ہے اس بڑے امتحان میں اللہ نے اپنے بندے کو کس طرح سرخرو کیا؟ فرمایا: ﴿ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ

عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴾[یوسف : ٢٤] اللہ اپنا قاعدہ بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ میرے ساتھ مخلص ہو جائیں میں انھیں برائی سے کس طرح بچاتا ہوں؟ جو لوگ غلط کام کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان مومن بھی سمجھتے ہیں انہیں سبق حاصل کرنا چاہیے اور اپنا جائزہ لے کر اصل غلطی کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اصول یہ ہے کہ بندے کو اللہ کے ساتھ مخلص ہونا چاہیے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ مخلص کون ہے اور زبانی اخلاص کا دعویدار کون ہے؟ ایک شخص گناہ کرتا ہے، حرام کھاتا ہے اور حرام کاموں میں مشغول رہتا ہے اور ساتھ اپنی پارسائی کے زبانی دعوے بھی کرتا ہے تو ایسا شخص اللہ کی مدد سے محروم رہتا ہے اور شیطان اس پر طبع آزمائی کرتا رہتا ہے۔ اس کا برائی سے بچنا مشکل ہوتا ہے گناہ سے بچنے کیلئے اخلاص کے ساتھ کوشش ضروری ہے اللہ ایسی کوشش میں برکت ڈالتا ہے۔ بندہ اللہ کی مدد کے ساتھ گناہ سے بچتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے۔

مصر کا عمومی ماحول:

عزیز مصر کی بیوی کی باتیں مصر میں پھیلنے لگیں، ایسی باتیں کبھی چھپتی نہیں عزیز مصر باتوں کو چھپانا چاہتا تھا لیکن مصر کی عورتوں میں بات پھیل رہی تھی کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے غلام پر فریفتہ ہو کر شاہی آداب کو تباہ کر رہی ہے۔ عام لوگوں میں اپنی رسومات اور ''سٹیٹس'' کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، یعنی زنان مصر کے نزدیک بدکاری کوئی بری چیز نہیں تھی۔ وہ اس بات کو برا جانتی تھیں کہ شاہی خاندان کی عورت غلام سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کرے، جب عزیز مصر کی بیوی کو خبر ہوئی تو اس نے اپنی عزت بچانے کا جاہلی انداز اختیار کیا۔ یہاں سے واضح ہوتا ہے کہ جاہلی معاشرے میں عزت کس کو کہتے ہیں اور عزت کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے یہ تو ممکن نہیں کہ عزیز مصر بالکل بے خبر ہو اور اس کی بیوی اپنے گھر میں شاہی خاندان اور مصر کے اونچے طبقے کی عورتوں کی دعوت کرے، غالباً عزیز مصر کا پورا اعتماد بیوی کو حاصل ہو گا اور وہ سمجھتا ہو گا کہ جس طرح عزت بچتی ہے بچالی جائے۔ ادھر عزیز مصر کی بیوی دعوت میں خواتین کو جمع کر کے یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے پیش کرتی ہے۔ جب مصر کی شاہی عورتوں نے یوسف علیہ السلام کی ایک جھلک دیکھی تو ہاتھ زخمی کر لیے اور پکار اٹھیں کہ یہ کوئی عام انسان نہیں ایک معزز فرشتہ ہے، فرشتہ حسن کی وجہ سے کہا یا اس وجہ سے کہ یوسف علیہ السلام نے آنکھ اٹھا کر بھی عورتوں کی طرف نہیں دیکھا۔ یہاں بھی اللہ نے اپنے بندے کی عظمت کو قائم رکھا اور ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ مصر میں عورتوں

کا کلچر کیسا تھا۔ حسن پرستی اور بے حیائی عام تھی اس صورت حال میں یوسف علیہ السلام کا برائی سے بچنا، صبر وضبط اور عصمت وعفت کی حفاظت اور تقویٰ کا اعلیٰ معیار پیش کرنا اللہ کی طرف ان کے لیے ایک معجزہ تھا۔ یوسف علیہ السلام مصر کے شاہی ماحول کی گندگی سے بچنے کے لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر میں جیل میں بند ہو کر اپنے ایمان کی حفاظت کر سکتا ہوں تو مجھے جیل ہی پسند ہے سبحان اللہ! یوسف علیہ السلام کو مصر کا بدکاری اور بے حیائی کا معاشرہ جیل سے زیادہ برا لگتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ جیل میں کتنی تنگی ہوگی۔ لیکن ان کے نزدیک ایمان کی حفاظت سب سے اہم مسئلہ تھا۔ جب کوئی مخلص بندہ ایسے امتحان پاس کرتا ہے تو اللہ اسے بہت بلند مقامات پر پہنچاتا ہے۔ بظاہر یوسف علیہ السلام قید میں تھے، عزیز مصر کی بیوی نے انتقام لے لیا تھا مصری عورتوں کے سامنے اپنی جھوٹی عزت بچانے میں اپنے آپ کو کامیاب سمجھتی تھی اور عزیز مصر کے لیے بھی یوسف علیہ السلام کی قید ہی مسئلے کا حل تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ صبر و تقویٰ کے امتحان پاس کرنے والا یوسف کیا کچھ حاصل کرنے والا ہے اور خود یوسف علیہ السلام بھی نہیں جانتے تھے کہ اللہ کیا کچھ دینے والا ہے؟ وہ تو اپنے ایمان کی حفاظت میں لگے ہوئے تھے۔ اہل ایمان کے لیے یہ شاندار تربیت ہے۔

اقتدار کا حصول مطمح نظر نہیں ہونا چاہیے، اللہ اپنے بندوں کے ایمان اور اعمال صالحہ قبول کر کے حکومت کی نعمت کا نتیجہ عطا کرتا ہے:

نیک اعمال اور محنتیں اس لیے نہیں کرنی چاہییں کہ اس سے اقتدار اور حکومت ملے گی جیسا کہ بہت سے صالح لوگ اقتدار کے حصول کے لیے محنتیں فرما رہے ہیں بلکہ نیک اعمال محض اللہ کا حکم اور عبادت سمجھ کر کرنے چاہییں۔ اللہ تعالیٰ بندے کا ایمان اور اعمال صالح جب قبول کر لیتے ہیں تو بڑے بڑے انعامات سے نوازتے ہیں اللہ کی ایک بڑی دنیاوی نعمت اسلامی حکومت بھی ہے۔ اللہ خوش ہو کر بندوں کو خلافت اور حکومت عطا فرماتے ہیں، محنتوں کے نتیجے اللہ دیتا ہے۔ کیا یوسف علیہ السلام سب محنتیں اس لیے کر رہے تھے کہ انہیں مصر کی حکومت مل جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ انکے گمان میں بھی نہ تھا اور قرآن نے کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں دیا بلکہ قرآن نے اصول کے طور پر دو چیزیں بیان کی ہیں فرمایا کہ یوسف علیہ السلام نے صبر اور تقویٰ کی مسلسل محنت کی دونوں چیزیں مومن بندے کو محسن بنا دیتی ہیں اور اللہ کا قانون ہے کہ وہ اپنے محسن بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔ سورہ آل عمران میں معرکہ احد میں شامل مجاہدین کے حوالے سے فرمایا کہ اللہ محسن

بندوں کو دنیا اور آخرت کا اجر عطا فرماتے ہیں۔ بظاہر تو احد میں اللہ نے مسلمانوں سے بڑی قربانی لی تھی لیکن اپنے بندوں سے کامیابی کا وعدہ بھی اسی دن کیا تھا۔ جس طرح یوسف علیہ السلام کو اللہ نے حکومت سے نوازا اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مجاہدین کو بڑی بڑی حکومتوں سے نوازا۔ لیکن کوئی بھی صحابہ میں سے دنیاوی کسی مقصد کے لیے قربانی نہیں دے رہا تھا۔ اسی منہج کے ساتھ آج ہمیں بھی ایمان اور عقیدے کو پختہ کرنا ہے، علمی اور عملی طور پر اصلاح کرنی ہے اور اعمال صالح کی مسلسل محنت کرنی ہے۔ نماز سے لے کر جہاد تک تمام صالح اعمال کو اخلاص اور سنت کا رنگ دینا ہے۔ پھر ایک یا دو دن نہیں پوری زندگی اسی پر محنت کرنی ہے۔ اس محنت میں تقویٰ پر تربیت ہوگی۔ بھائیوں کے اخلاق سنوریں گے۔ اللہ کا قائم کردہ معیار سامنے رکھیں گے۔ یہ دعوت، اصلاح اور تربیت خود بہت بڑا وسیلہ ہیں۔ اگر کچھ بھی نہ ملے محض وہ لوگ اکٹھے ہو جائیں گے جو "اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ" اور "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" کی قرآنی تصویر ہوں، "رُكَّعًا سُجَّدًا" کا قرآنی معیار ہوں اور "يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا" کا قرآنی مقصود ہوں تو بجائے خود یہ بہت بڑا نتیجہ ہے۔ اگرچہ بعض دینی جماعتیں اسے حصول مقصد کا ذریعہ سمجھتی ہیں۔ جبکہ قرآن اسے مقصود عمل قرار دیتا ہے۔ ہمیں بھی ایسا ہی سمجھنا ہے۔ منہجی غلطیوں سے بچنا ہے۔ حکومت و اقتدار کے حصول کا ایک ہدف مقرر کر کے نماز اور نیک اعمال دعوت اور جہاد کو محض ذریعہ نہیں سمجھنا۔ محنت کے خود ساختہ دائرے میں محدود نہیں ہونا بلکہ نبوی منہج کو کتاب و سنت کے دلائل سے سمجھ کر اسوۂ رسول ﷺ پر احباب و اخوان کی تربیت کرنی ہے۔ یہ لوگ دعوت میں انبیاء کے منہج پر محنت کریں، جہاد میں خاتم النبیین ﷺ کے منہج پر قربانیاں دیں۔ کچھ نہیں تو انھیں کفار کے خلاف جہاد میں شہادتیں ہی مل جائیں تو یہ بھی قرآن کا بیان کردہ شاندار ہدف ہیں۔ یہ نہیں کہ ہمارے اتنے شہید ہو گئے تو ہمارا حکومت میں حصہ بن گیا۔ اصل میں یہ عقیدے کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ جمہوری دور ہے، عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حکومت لوگ دیتے ہیں۔ اپنا حق ثابت کرنا چاہیے وہ جیسے بھی ثابت ہو جائے، ووٹوں سے اگر حق ثابت ہو جائے تب بھی ٹھیک ہے۔ اگر کسی دوسرے طریقے سے حق ثابت ہو جائے پھر بھی حرج نہیں مقصد حکومت کا قیام ہے۔ ہمارے خیال میں یہ سطحی سوچ ہے۔ حکومت مقصد نہیں بلکہ وہ نتیجہ ہے جسے اللہ بطور نعمت اپنے مخلص بندوں کو کبھی عطا کرتا ہے، بہت مرتبہ نہیں بھی دیتا۔ کتنے نبی اور نبوی منہج پر کام کرنے والے کتنے ہی لوگوں کو حکومت و اقتدار نہیں ملا۔ کیا اللہ نے انھیں محروم رکھا اور کیا ان کی محنتیں ضائع ہو گئیں؟ ہرگز نہیں بلکہ

ان کی محنتیں دوسروں کے لیے دعوت اور سبق بن گئی ہیں اور بہت سے لوگوں نے ان کی تاریخ سے سبق حاصل کر لیے تو یہ بھی شاندار وسیلہ ہے۔ صحیح محنت ہمیں کرنی چاہیے اور نتیجہ اللہ کے سپرد کر دینا چاہیے اس سے جماعتوں اور افراد میں مایوسی نہیں پھیلتی، دائرے محدود نہیں ہوتے بلکہ کام بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے۔ حکومت کے حصول کی محنت پر لگے ہوئے لوگ جب دو تین مرتبہ حکومت کے حصول میں ناکام ہو جاتے ہیں تو انتشار کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ دعوت الی اللہ انبیاء کا منہج اور دعوت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ محمد رسول اللہ ﷺ کا منہج ہے۔ اسی پر آپ ﷺ نے اپنی جماعت کی تربیت فرمائی ہے جو امت کے لیے شاندار راستہ ہے۔ اگر مخلص لوگوں کو دنیا میں کوئی بھی نتیجہ نہ ملے تو آخرت کے اجر سے اللہ کبھی محروم نہیں رکھے گا۔ لیکن یقین کر لینا چاہیے کہ اللہ دنیا میں بھی بندوں کی محنتیں ضائع نہیں کرتا۔ البتہ اللہ کا یہ اصول ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جسے جتنا چاہتا ہے دے دیتا ہے۔ اللہ پر کسی کا کوئی حق نہیں۔ سبحان اللہ! ہمیں ہر حال میں اپنے اللہ کے ساتھ راضی رہنا چاہیے۔ اور صبح و شام کہتے رہنا چاہیے: ((رَضِیْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْإِسْلَامِ دِیْنًا وَ بِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا)) "میں اللہ کو رب مان کر اسلام کو دین مان کر اور محمد ﷺ کو نبی مان کر راضی ہو گیا۔" اللہ بھی ایسے لوگوں کو راضی کرتا ہے۔ سب سے اچھا وقت وہ ہوگا جب اللہ جنتی لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمائے گا کہ میں تم سے راضی ہوں کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔ جنت کی سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے۔ یہ ان کے لیے ہے جو دنیا میں ہر قسم کے حالات میں اپنے رب پر راضی رہتے ہیں۔ انھیں ابراہیم علیہ السلام کی طرح نمرود آگ میں پھینک دیں یہ تب بھی اللہ پر راضی رہتے ہیں۔ انھیں بڑے بڑے فرعون اذیتوں میں مبتلا کریں یہ اپنے رب پر راضی رہتے ہیں۔ پھر اللہ بھی اپنی مدد کے وہ نظارے دکھاتے ہیں کہ ساری دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ اسباب پر تکیہ کرنے والے کبھی نہیں سمجھ پاتے، اللہ اپنے بندوں کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیتے ہیں اور ان کی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ بس ایمان والے ہی اللہ کی توفیق سے سمجھتے ہیں۔ ایمان سے عاری اور دین سے غافل سب پیچھے رہ جاتے ہیں انھیں شک ہونے لگتا ہے۔ ہم دعوت دیتے ہیں کہ لوگو! آؤ! اللہ پر، اس کے نبی پر اس کی کتاب پر اور نبی کی سنت پر ایمان لاؤ اور صحابہ کے طریق پر دعوت، تربیت اور جہاد کا کام کرو۔ اللہ دنیا کے رنگ بدل دے گا۔ روم و ایران تمھارے قدموں میں ہوں گے۔ مشرکین ہند کہیں بھاگ کر نہیں جا سکیں گے۔ ایمان لا کر وہ شرک سے تائب ہو کر ہمارے مسلمان بھائی بنیں گے ورنہ ان خطوں پر اللہ کی توحید کے

جھنڈے لہرائیں گے اور بابری مسجد سے توحید و رسالت کی اذانیں گونجیں گی۔ ان شاء اللہ۔ مسلمانوں پر ظلم کرنے والی کوئی صلیبی یہودی قوت باقی نہیں رہے گی، ساری زمین پر اللہ کا کلمہ بلند ہوگا اور محمد ﷺ کے دین کے پھیلنے میں کوئی قوت مزاحم نہ ہو سکے گی۔ یہ وقت قریب ہے۔ آؤ میرے بھائیو! اللہ کے دین کو قرآن و حدیث سے سمجھو اور اپنے اسلامی کردار کا تعین کر کے فرقوں سے نکلو اور «لَا يَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ مَنْصُوْرِيْنَ» یعنی ''میری امت کا ایک گروہ حق پر قتال کرتا رہے گا اور اللہ کی مدد انھیں ملتی رہے گی۔'' کے صداق بن جاؤ اور اپنی دعاؤں میں زیادہ یہی دعا مانگو اور کوشش کرو۔ واللہ ولی التوفیق

یوسف علیہ السلام کو مصر کا تخت ملا، والدین ملے اور والدین کو یوسف ملے۔ یعقوب علیہ السلام کو دوبارہ آنکھیں مل گئیں اور صبر کے نتیجے میں مصر کے تخت پر بیٹے کے ساتھ بیٹھے اور سب نے یوسف علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کیا۔ یاد رکھیے تعظیمی سجدہ تب جائز تھا۔ امت محمد ﷺ کے لیے اس کی ممانعت ہے۔ ایسے ہی مسلمانوں کو عظمت رفتہ پھر سے مل جائے گی'' وما ذالك على الله بعزيز'' یعنی اللہ کے لیے یہ مشکل نہیں۔''

اگر یوسف علیہ السلام کو اللہ نے بلند مقامات عطا کیے اور انھیں شکر کی توفیق بھی دی تو اسی طرح اللہ مسلمانوں کو عظمت رفتہ دے گا۔ اگر جہاد کرو گے اور کفر کے تختہ دار سے نہیں ڈرو گے تو ان کے تخت اللہ ان سے چھین کر تمھیں دے گا۔ یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ اللہ کے ہاں پاس ہونے کی کوشش کیجیے۔ ابھی مسلمان اور مسلمانوں کے حکمران اور عوام کے طبقے فیل ہیں۔

ہمیں مان لینا چاہیے کہ ہم امتحان میں ہیں اور پاس فیل کا نتیجہ اللہ کے پاس ہے۔ اللہ کے ہاں عدل ہے وہ ظلم نہیں کرتا۔ اگر آج مسلمان کفر کے پنجے اور شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں اور بد ترین غلامی مسلمانوں کا اصل مسئلہ ہے تو مان لینا چاہیے کہ ہم نے خود اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالا ہے۔ کفر کے نظاموں کو پسند کر کے کافروں کی غلامی قبول کی ہے۔ ایک مسلمان ہو یا پوری مسلم امہ، یہ اللہ کے سوا کسی کے غلام رہ ہی نہیں سکتے۔ لا إله إلا الله محمد رسول الله پڑھنے والے غلامیاں قبول نہیں کر سکتے۔ اگر مسلمان عملاً غلام ہیں تو مان لیجیے کہ کلمہ محض رسمی ہے، ہم نے پڑھا ہے نہ سمجھا ہے۔ یہی کچھ قبر میں فرشتے کہیں گے اس جھوٹے منافق مسلمان کو کہ '' لَا دَرَيْتَ وَلَا تَلَيْتَ'' کہ تو نے سمجھا ہے نہ پڑھا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہماری غلطی واضح کر

رہے ہیں لیکن یہ قبر کا بیان ہے جو پہلی گھاٹی ہوگی جہاں حقیقتیں کھلیں گی اور دنیا کے دھوکے نہیں ہوں گے۔ آج وقت ہے کہ سنبھل جائیں۔ قبر میں وقت نہیں ہوگا۔

آیئے! ہم اپنے دینی کردار کو پختہ کریں۔ صرف ایک سورۂ یوسف بہت آنکھیں کھلواتی ہے۔ بہت کان کھلواتی ہے۔ اسی طرح سارا قرآن ہے، پھر حدیثِ رسول، یہ اسلام کا اصل ورثہ یعنی علم ہیں۔ اگر ہم اصلاح چاہتے ہیں اپنی، معاشرے، ملک اور امت کی، تو اصلاح کے لیے کوئی نیا فلسفہ نہیں آج کے حالات میں کوئی نیا طریقہ نہیں۔ بس وہی قرآن جو رسول اللہ ﷺ امت کو دے کر گئے ہیں اور اپنی سنت جو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ ہر گمراہی سے بچنے کا یہی راستہ اور دنیا و آخرت کی ہر کامیابی کے حصول کا یہی زینہ ہے۔

گنہگار اور ظالم بھائیوں کیلیئے معافی اور مسئلہ دہشت گردی، نبوی منہج کیا ہے؟

سورۂ یوسف کا ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ جب اخوان یوسف کی غلطی واضح ہوگئی اور بھائیوں کو بھی پتا چل گیا کہ مصر کے تخت پر بیٹھا شخص ہمارا وہی بھائی یوسف ہے جسے ہم نے باپ سے دور کرنے کے لیے کنعان کے کنویں میں پھینکا تھا، آج اسی کے ہاتھوں سے ہمیں گندم مل رہی ہے اور شاندار مہمان نوازی ہو رہی ہے تو غلطی تسلیم کر گئے۔ ادھر یوسف علیہ السلام نے بھی ان کی معافی کا اعلان کر دیا۔ کچھ نہیں جتلایا بلکہ کہا کہ میں تم سے کوئی انتقام نہیں لوں گا۔ اللہ نے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ ثابت کیا کہ اللہ کے احسانات ہر وقت سامنے رکھنے چاہییں۔ مشکلات پر صبر کا طریقہ یہ ہے کہ جو نعمت میسر ہو اس کا شکر بجا لانا چاہیے۔ شکر کرنے والا ہی صبر کرتا ہے۔ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے والد گرامی سے ملاقات کی تو بھائیوں کے متعلق فرمایا کہ شیطان نے میرے اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالا تھا۔ غلطی کو بھائیوں کی طرف منسوب نہیں کیا کہ کہیں انھیں شرمندگی نہ ہو اور باپ کے دل پر بھی بوجھ نہ ہو۔ بلکہ خود ایسے الفاظ کہہ دیے جس سے باپ اور بھائی سب خوش ہو گئے۔ حالانکہ اگر انتقام لینا چاہتے تو کون روکنے والا تھا؟ ایک مصلح حاکم کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو سیدنا یوسف علیہ السلام کا طرزِ عمل اللہ نے سورہ میں بیان کیا ہے۔ بعینہٖ یہی اخلاق محمد رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے دن اہل مکہ کے لیے پیش کیے۔ قریش مکہ نے بھی محمد رسول اللہ ﷺ پر ظلم ڈھائے تھے، قتل کے منصوبے بنائے اور اللہ کے رسول نے مکہ سے ہجرت کی تھی۔ قریش سمجھتے تھے کہ بس دین محمد کے راستے بند کر دیے گئے، وہ کیا

جانتے تھے کہ ایک دن محمد رسول اللہ ﷺ مکہ واپس آئیں گے تو دس ہزار قدوسیوں کا لشکر ہمراہ ہو گا اور اس دن محمد کے سامنے کوئی تلوار نہ اٹھے گی۔ وہ وقت آیا۔ سبحان اللہ! جب آپ ﷺ مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہوئے تو قریش اور تمام اہل مکہ معافی کے خواستگار تھے۔ آپ ﷺ نے بیت اللہ کو شرک کی آلودگی سے پاک کیا، بتوں کو توڑا۔ تصویریں اتاریں، لات و منات کے ٹکڑے کیے لیکن اہل مکہ کے لیے وہی الفاظ کہے جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے لیے کہے تھے۔ مکہ میں بھی آپ کے خاندان کے لوگ ہی مخالفت کرنے والے تھے۔ بڑی گہری مماثلت ہے۔ لیکن ثابت ہوتا ہے کہ دعوت بھی ایک ہے اور اخلاق و منہج بھی ایک ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام اور محمد ﷺ نبوت میں بھائی تھے تو منہج میں بھی ساتھی تھے۔ آج امت محمد ﷺ نے بھی اسی دعوت اور منہج کو لے کر اٹھنا ہے۔ غلط طور پر یوسف علیہ السلام کے وارث بننے والے صلیبیوں کے سامنے وہی توحید پیش کرنی ہے۔ اللہ کی زمین پر صلیب کی اس دعوت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اسلامی اخلاق سے یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ انبیاء کے وارث مسلمان ہیں جو دہشت گرد نہیں، مسلمان ان سے نہیں لڑتے جو مسلمانوں سے نہیں لڑتے۔ بلکہ ان کے سامنے اپنی دعوتِ اسلام پیش کرتے ہیں۔ کسی پر ظلم نہیں کرتے ہاں جب تک لوگ کفر پر متکبر ہو کر لڑیں گے تو مسلمان اللہ کی توفیق سے ہر فرعون کا تکبر خاک میں ملائیں گے اور جب مسلمان غلبہ حاصل کریں گے تو کمال اخلاق کا مظاہرہ کریں گے اور ثابت کریں گے کہ ہماری دشمنی ذاتی نہیں۔ نہ ذات کے لیے خون بہاتے ہیں اور نہ مفاد کے لیے خون دیتے ہیں۔ خون اور مال کے سودے اللہ سے ہیں اسی کے لیے سب کچھ پیش کیا جاتا ہے اور اللہ ہی کی ہدایت کے مطابق ...... اپنی مرضی اور پسند سے نہیں۔ اصل میں کفار مسلمانوں پر دہشت گردی کی تہمت لگا کر انھیں حقیقی جہادی کردار ادا کرنے سے روکنا چاہتے ہیں اور خود دہشت پھیلا کر اور ملکوں میں فوجیں اتار کر اور بارود برسا کر باطل نظاموں اور طاغوتی ورلڈ آرڈر کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر نصرانی اور یہودی مسلمانوں کے ساتھ امن معاہدہ کرنا چاہیں تو مسلمان بھی اپنے نبی ﷺ کے اسوہ کے مطابق امن کے لیے ہاتھ بڑھائیں گے اور اسلام کی دعوت بلا روک ٹوک پیش کریں گے۔ یہ کتنی بڑی دلیل ہے کہ مسلمان دہشت گرد نہیں۔ لیکن انھیں صلیبی و یہودی سازش سے دہشت گرد ثابت کیا جا رہا ہے اور بعض قومیں اس سے اپنا مقصد پورا کر رہی ہیں۔ قرآن مسلمانوں کو منہج سمجھاتا ہے، ان کے کردار کا تعین کرتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ اسلامی جہاد ظلم کے خاتمے کے لیے ہے اور محمدی جہاد نے تاریخ

میں ظلم واستحصال کے خاتمے کی بنیادیں رکھ دی ہیں جو قیامت تک قائم رہیں گی۔ اللہ کے مخلص بندے اسلامی جہاد اور اسلامی اخلاق کے حسین امتزاج کو عملاً قائم کر کے آج کی دنیا کو ظلم سے نجات دلائیں گے۔

آیئے! اپنے بھائیوں کو معاف کرنے کا نبوی منہج سمجھئے۔ اپنے مسلمان بھائیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہ کیجیے۔ اگر کہیں غلطی ہے تو اس کی اصلاح کیجیے۔ حکمت، دلیل اور اخلاق سے اصلاح کیجیے اور جہاد اس وقت تک کیجیے جب تک کفر کا زور ٹوٹ نہیں جاتا اور دعوتِ اسلام کی رکاوٹیں دور نہیں ہو جاتیں آج اگر مسلمان سوات، وزیرستان اور دوسرے علاقوں میں اپنے بھائیوں سے امن معاہدے کر لیں تو امریکہ و یورپ کو اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟ وہ صرف مسلمانوں کو لڑتا دیکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح دنیا پر اپنے اقتدار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ آیئے! اسلام اور قرآن کی دعوت کو سمجھیں۔ آپس کی لڑائیاں ختم کریں، فتویٰ بازی سے پرہیز کریں، سب مسلمانوں کو محمدی دعوت پہنچائیں کہ مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ ہاتھ سے بھائی کو تکلیف دیتا ہے اور نہ زبان سے بلکہ آج دنیائے کفر کو یہ پیغام دینے کی ضرورت ہے کہ مسلمان کسی انسان بلکہ جانور تک کو تکلیف دینے کے روادار نہیں۔ لیکن سانپوں کو مارنا پڑتا ہے اور بھیڑیا صفت انسانوں کے دانت کھٹے کرنے پڑتے ہیں تا کہ انسان بچ جائیں اور انسانیت محفوظ ہو جائے۔ یہی منشائے الٰہی اور منہج قرآنی ہے۔

آخر میں بھائی یوسف سراج کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے کیسٹ سے مدد لے کر بہترین طریقے سے سورۂ یوسف کو مرتب کیا ہے۔ اس کاوش کو سورۂ یوسف کی مکمل تفسیر نہیں کہنا چاہیے بلکہ ایسے نکات، جو معاشرے کی اصلاح سے متعلق ہیں اور خصوصی طور پر اس سورۃ کا خاصہ ہیں، ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اللہ ان کوششوں میں برکت دے اور اخلاص سے نوازے۔ آمین!

محمد سعید
116/E جوہر ٹاؤن
سب جیل لاہور
ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ

سورۂ مبارک کے نزول کا پس منظر

سورۂ یوسف قرآن مجید، فرقان حمید کے بارھویں پارے کے آخر سے شروع ہو کر تیرھویں پارے تک چلی جاتی ہے۔ پوری سورۂ مبارکہ مکی ہے، تاہم بعض مفسرین چار آیات مدنی بتاتے ہیں۔ موجودہ ترتیب میں یہ بارھویں نمبر پر ہے اور نزولی اعتبار سے اس کا نمبر ترپن (۵۳) ہے۔ بارہ رکوع ہیں، ایک سو گیارہ آیات، ۱۸۰۸ کلمات اور ۱۶۰۰ حروف۔

زمانۂ نزول:

یہ سورۂ مبارکہ عام الحزن اور بیعت عقبہ کے درمیانی عرصہ میں نازل ہوئی، یعنی جب آپ سے کبھی نہ بھلائی جانے والی شریکِ حیات سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ہر کڑی دھوپ میں سر پر سائبان کی طرح تن جانے والے، بنو ہاشم کے سردار چچا ابو طالب وفات پا گئے تھے۔

یہ قیام مکہ کا آخری دور تھا۔ مٹھی بھر مسلمان ابتلا و آزمائش کی چکی میں پس رہے تھے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا جلا وطنی کی سازشوں کے جال بنے جا رہے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی تلخ دور میں اللہ تعالیٰ نے ان مظلوموں کے لیے ہجرت کے ذریعہ سے آسائش و کشائش کی ایک راہ پیدا کی۔ اور اس سورۂ کے نزول کی صورت میں اہل ایمان کے دلوں کو بہارِ جانفزا کا ایمانی جھونکا نصیب فرمایا۔

مقاصد نزول:

قرآن مجید ہمہ وقت اہل ایمان کی تربیت کرتا ہے۔ کہیں جنت کی بشارتوں کے ذریعہ ترغیب ہے اور کہیں عذاب جہنم کی ترہیب اور بچنے کی تدبیریں بتائی جا رہی ہیں۔ اچھے

حالات میں شکر ادا کرنے کا سلیقہ سکھایا جاتا ہے اور سخت حالات میں صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی ہے۔ محض تلقین ہی نہیں سابقہ حالات و واقعات بیان کر کے صبر و استقامت کے خوش کن انجام اور مناظر بیان کیے جاتے ہیں، جس سے اہل حق فکری اور نظریاتی طور پر حق کے راستے میں ہر بلائے بے اماں سہنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ سورۂ یوسف کے زمانۂ نزول کے حالات دیکھیں تو دیگر جلیل القدر مقاصد کے ساتھ ساتھ چند مقاصد زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں:

۱۔ سازشیوں کو تنبیہ:

یہودیوں نے خود یا اہل مکہ کے ذریعے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تھا کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام تو شام کے باشندے تھے اور بنی اسرائیل سے تعلق تھا، پھر یہ مصر کیسے پہنچ گئے؟ دراصل یہودی تشکیک کے مریض تھے۔ من چاہے مطالبے کرتے رہتے تھے، مگر جب مطالبہ پورا ہو جاتا تو ایمان لانے کی بجائے کوئی اور مطالبہ سامنے لا رکھتے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ چونکہ آنحضرت تاریخ سے ناواقف ہیں، پہلے کبھی آپ کی زبان اقدس سے واقعۂ یوسف کا ذکر بھی نہیں سنا، سو حصول معلومات کے لیے لازماً آپ یہودیوں سے رابطہ کریں گے اور یوں انھیں پروپیگنڈا کا موقع مل جائے گا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے فوراً سورۂ یوسف نازل فرما کر نہ صرف ان پیغمبروں کے مصر میں ورود کے اسباب آشکار کر دیے، بلکہ بالتفصیل بتا دیا کہ جو سازشیں تم کرتے پھرتے ہو، برادرانِ یوسف کی طرح اس کا انجام بھی سوائے حسرت و ندامت اور ذلت و رسوائی کے کچھ نہیں۔

۲۔ منہ مانگا امتحان:

نزولِ سورۂ مبارکہ سے مخالفین کے اس اعتراض کا ازالہ بھی مقصود تھا کہ یہ نبی اپنی خواہش نفس سے خود ساختہ یا سنی سنائی باتیں نہیں بیان کرتا، بلکہ اس مقدس ذات کو وحی الٰہی کا امتیاز حاصل ہے اور یہ اسی وحی الٰہی کی روشنی میں پوری دیانت و صیانت سے اپنی ذمہ

داری نبھا رہا ہے۔ چنانچہ اب اپنے منہ مانگے امتحان میں اس اعتراض کو خوب جانچ کر لو۔

۳۔ ایک پیش گوئی:

سورۂ یوسف گویا ایک پیش گوئی بھی تھی، جو کما حقہ پوری ہو کر قرآن مجید کا اعجاز بن گئی۔ قرآن مجید نے ڈیڑھ دو سال قبل اہل مکہ کو یہ بتا دیا کہ جس شخص کے قتل اور جلا وطنی پر تم لوگ تل گئے ہو، کچھ ہی وقت جاتا ہے کہ برادران یوسف کی طرح تم اس کے حضور لاچار، بے بس اور سرنگوں کھڑے ہوں گے اور بتا دیا کہ جس طرح برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام کو سرداری اور محبتِ والد کے حصول کے لیے گھر سے نکالا۔ تم وہی کام اپنے عزیز اور اللہ کے رسول کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، تو سن رکھو! ایک وقت آئے گا جب برادرانِ یوسف کی طرح تم اسی شخص سے گندم مانگتے دکھائی دو گے۔

اہل حق کے لیے پیغام تسلی:

اہل حق کمزور جماعت تھے اور اہل مکہ کے مصائب سہنے ان کے لیے سخت دشوار تھے۔ پھر یہ پر صعوبت حالات دن بہ دن کٹھن سے کٹھن تر ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ گھر بار، بیوی بچے، والدین اور اپنا وطن تک چھوڑ دینے کی نوبت آ پہنچی تھی۔ چنانچہ ان حالات میں اس سورۂ مبارکہ کے ذریعے سے تسلی دی گئی کہ ایک تو ایسے حالات پہلی دفعہ اور صرف تمھیں ہی پیش نہیں آ رہے، خود یوسف کو اپنے گھر بار اور والدین کو چھوڑ کر ترک وطن کرنا پڑا تھا۔ انھیں باپ کی محبت بھری گود اور شفقت بھری تربیت سے نکال کر جنگل وصحرا کے کنویں میں پھینک دیا گیا تھا، مگر ہر جگہ ان کی نصرت ہوتی رہی تھی، تو اے مسلمانو! اللہ تمھیں بھی تنہا نہ چھوڑے گا اور انجام کار سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح تمھیں بھی اقتدار و غلبہ نصیب فرمائے گا۔

سورۂ یوسف کے اوصاف و اسباق

احسن القصص:

قرآن مجید میں بہت سے انبیائے کرام ﷺ کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں اور فصاحت و بلاغت کے مختلف اسلوب اپناتے ہوئے ایک ہی بات کو مختلف زاویوں سے مختلف مقامات پر متعدد انداز سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اس سلسلے میں تفصیل، ترتیب اور جزئیات کے بیان کا التزام نہیں فرمایا گیا، کیوں کہ قرآن مجید انسانیت کی رہنمائی کے لیے ایک آسمانی صحیفہ ہے، کوئی تاریخ کی کتاب نہیں کہ جس میں یہ التزام کیا جاتا، تاہم یہ اعزاز وانفرادیت صرف سورۂ یوسف ہی کو حاصل ہے کہ از اول تا آخر، نا صرف مکمل تفصیلات کے ساتھ یہ واقعہ بیان ہوا ہے، بلکہ کسی بھی معیاری قصے کے طبعی تقاضے کے تحت ایک ہی جگہ مکمل طور بیان فرما دیا گیا ہے۔ یہی باعث ہے کہ اس قصے کو ''احسن القصص'' کا لقب خود رب العالمین نے عطا فرمایا ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ هَٰذَا الْقُرْآنَ ﴾

[یوسف : ۳]

''ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں، اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے۔''

قصہ نگاری کی حدود و قیود:

اگر غور کیا جائے تو سورۂ یوسف میں قرآن مجید نے ایک معیاری قصے کے لوازم کما حقہ مہیا فرما دیے ہیں، مگر ایسا بھی نہیں کہ یہاں قرآن مجید بیانِ تاریخ یا قصہ گوئی کی رو میں اپنے

مقصدِ حقیقی سے غافل ہو گیا ہو، ہرگز نہیں۔ اس موقع پر قرآن مجید ایک طرف پوری سنجیدگی کے ساتھ تاریخ اور قصہ نویسی کے بنیادی معیاری اسلوب اور خدوخال واضح کر رہا ہے تو ساتھ ساتھ دعوت وتبلیغ کے مقدس مشن پر بھی ہر آن مصروف عمل ہے۔ یہاں اصحابِ قلم وقرطاس کی بھی تربیت کی جا رہی ہے کہ 'ابلاغ' اتنا بھی آزاد نہیں ہوتا کہ وہ شرم وحیا کی حدود وقیود توڑ کر مادر پدر شیطانی آزادی کی چراگاہ میں چرنے لگے۔ نہایت توجہ سے دیکھنا چاہیے کہ قرآن مجید نے نازک سے نازک واقعات بھی حرمت وعفتِ قلم پر آنچ آئے بغیر یوں بیان کر دکھائے ہیں کہ روح وذوق کہیں شاک محسوس نہیں کرتے۔ آزادیٔ اظہار کے بہانے اہل ایمان کے جسموں میں عریانی وفحاشی کا کینسر منتقل کرنے والوں کو سورۂ یوسف سے عبرت، سبق اور شائستہ اسلوبِ بیان بھی سیکھنا چاہیے اور سورۂ نور میں مذکور اپنے خالق کا یہ فرمان بھی ہمہ وقت پیش نگاہ رکھنا چاہیے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [النور : ۱۹]

''بے شک جو لوگ پسند کرتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں فحاشی کو فروغ دیں۔ ان کے لیے دنیا وآخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے تمھیں (اس کا) علم نہیں۔''

دیدۂ بینا رکھنے والے یقیناً محسوس کر سکتے ہیں کہ یہاں قصے کے ضروری لوازم اور دعوت وتبلیغ پہلو بہ پہلو چلتے نظر آتے ہیں۔

چند مزید اسباق:

قرآن مجید تمام کا تمام حکمتوں سے بھرپور ہے۔ اس کی کوئی آیت بھی حکمت وبصیرت کے خزانوں سے خالی نہیں، مگر ہمارے ہاں اس سورۂ کو خطباء اور واعظین حضرات نے محض ایک دلچسپ قصے کے طور پر بیان کیا ہے۔ حالانکہ سورۂ یوسف محض ایک قصہ نہیں، دیگر لاتعداد

حکمتوں کے ساتھ ساتھ اس میں بے شمار اسباق و مواعظ پنہاں ہیں، چند ایک درج ذیل ہیں:

○ اللہ رب العزت نے اپنی ذاتِ بابرکات کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ﴾ [البروج : ١٦]

''اللہ جو چاہتا ہے وہ اسے خوب اچھی طرح پورا کرنا بھی جانتا ہے۔''

سورۂ یوسف اللہ تعالیٰ کی اس صفت پر پوری طرح شاہد ہے۔ کہاں شام کے علاقے اور کہاں مصر کے تاج و تخت؟ بظاہر کتنا بعد اور دوری تھی دونوں کے درمیان؟ پھر کوئی ظاہری وسیلہ اور ذریعہ بھی نظر نہیں آتا تھا، مگر چونکہ اللہ کو یہ منظور ہے تو پھر اسباب بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ یہ اسباب بجائے خود ایک معما ہیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے لیے گردش دوراں کا جس طرف سفر شروع ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تخت و تاج اس سفر کی منزل ہوگی۔ پہلے کنویں میں پھینکے جانا، پھر بطور غلام بکتے بکاتے مصر پہنچنا، وہاں کی صورت حال کا جیل کی کال کوٹھڑی میں لے جانا اور پھر بالآخر تاج و تخت کا وارث ٹھہرنا، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر یقیناً ہمارا ایمان پختہ کرتی ہیں کہ ہمیں اسباب و ذرائع کی مادی سوچ ہی میں نہیں پھنسے رہنا چاہیے بلکہ اللہ پر امید کرتے ہوئے حرکت و عمل کے میدان میں اترنا چاہیے۔ پھر اسباب خود بخود مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں، چنانچہ تنگیوں، کٹھنائیوں یا قید و بند کی پابندیوں سے گھبرا کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیے۔ بلندی کے سفر میں یقیناً آزمائش کی ایسی گھاٹیوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے:

﴿ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الانشراح : ٦]

''بلاشبہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔''

اور اللہ یہ سب کرنا جانتا ہے۔ چنانچہ بجا ارشاد فرمایا رب العالمین نے:

﴿ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [یوسف : ٢١]

''اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

○ سورۂ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے دو کردار بہت کھول کر بیان کر دیے ہیں۔ ایک وہ جو راہِ

راست پر ہے مگر مصیبتوں میں گرفتار ہے، دوسرے راہِ راست سے ہٹے ہوئے لوگ ہیں اور جو چاہتے ہیں کر رہے ہیں، مگر اصل معاملہ اطمینان اور انجام کا ہوتا ہے۔ برادرانِ یوسف، سیدنا یوسف علیہ السلام کو ایذا پہنچا کر بھی مطمئن نہیں ہوتے مگر یوسف کنویں میں گر کر، منڈی میں بک کر اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہ کر بھی اپنے رب پر صابر وشاکر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر انجام پر نظر ہونی چاہیے کہ مخالفینِ حق گو وقتی طور پر کامیاب ہو جاتے ہیں مگر حقیقی اور اصلی کامیابی ہمیشہ اہل حق کا مقدر بنتی ہے، چنانچہ وقتی اور عارضی چمک دمک سے متاثر ہو کر راہ سے بھٹک جانے والے اپنی منزل کھوٹی کر لیتے ہیں اور اچھے انجام کی امید کو سینے سے لگا کر آزمائشوں کا خندہ پیشانی سے سامنا کرنے والے ہی دراصل کامیاب قرار پاتے ہیں۔

سیرت وکردار کی تسخیر:

دعوت وارشاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت میں ایک بہت بڑا سبق یہ بھی ہے کہ راہِ حق میں قلت وکثرت کا فلسفہ نہیں چلتا۔ یہاں عزم وہمت، جذبہ وایمان اور سیرت وکردار اگر اخلاص سے پیش کر دیے جائیں تو رب کی نصرت ومدد کے وہ نظارے دکھائی دیتے ہیں کہ پھر دنیا بدلتی دکھائی دیتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ہر موقع پر نہایت مضبوط کردار کا مظاہرہ کیا۔ بڑے بڑے نازک مقامات آئے مگر انھوں نے کردار کی معصومیت داغدار نہیں ہونے دی۔ ایک داعی کے لیے ایسی ہی استقامت اور کردار کی مضبوطی درکار ہے۔ جب کردار کو یہ رفعت میسر آجائے تو پھر سورۂ یوسف کا سبق یہ ہے کہ سلطنتیں قدموں میں آگرتی ہیں اور غلبۂ اسلام کی راہیں خود بخود کشادہ ہونے لگتی ہیں۔

اصل چیز یہی کردار ہے اور ہمیں اسی کردار کو سنوارنے اور اجالنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی ہی رفعتِ کردار عطا فرمائے۔ آمین!

محمد ﷺ اور یوسف علیہ السلام کے حالات میں مماثلت

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے سخت حالات میں سورۂ یوسف ایک حرفِ تسلی اور ڈھارس کے طور نازل فرمائی تھی۔ جب ہر دو انبیائے کرام کے حالاتِ مقدسہ پر بغور نظر ڈالی جائے تو کتنے ہی مقامات پر حیرت انگیز مماثلت اور مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ وہ جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ مبارکہ میں فرمایا ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ﴾ [یوسف: ۱۰۲]

''یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے۔''

اور پھر جو یہ فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ [یوسف: ۱۱۱]

''یقیناً اہل عقل و دانش کے لیے ان کے قصے میں بڑی عبرت ہے۔''

معلوم ہوتا ہے غیب کی خبروں کا تعلق ماضی کے ساتھ ساتھ حال سے بھی جڑا ہوا تھا اور یوں لگتا ہے کہ قصے میں موجود عبرت سے بھی مقصود یہی تھا کہ قصے میں مذکور حالات و واقعات نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرانا ہے، مگر صرف غور وفکر اور تدبر کے عادی ہی ان لطافتوں اور باریکیوں تک پہنچ پائیں گے۔

ذیل میں چند ایسے مقامات ذکر کیے جاتے ہیں جن میں ہر دو انبیائے کرام کے حالات میں کمال مطابقت دکھائی دیتی ہے۔ ان مشابہتوں کو سمجھ لینے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حالات میں سورۂ یوسف کتنی بڑی تسلی اور کتنا وسیع پیغام تھا۔

۱۔ نسب کی عمدگی میں مماثلت:

رسول اللہ ﷺ جامع صفاتِ جمال و کمال کے حاصل تھے۔ جس طرح سیرت میں عدیم النظیر اور صورت میں بے مثال تھے اسی طرح آپ کا نسب بھی نہایت عمدہ اور ہر طرح سے بے داغ تھا۔ ہرقل کے دربار میں اپنے کفر کے باوجود ابوسفیان نے یہ گواہی دی تھی:

''وہ ہم میں سے بہترین نسب والے ہیں۔''

خود رسول اللہ ﷺ نے اس کی شہادت دی۔ ارشاد فرمایا:

« بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْ كُنْتُ مِنْهُ » [بخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی ﷺ : ۳۵۵۷]

''مجھے اولاد آدم میں بہترین لوگوں کے اندر ایک نسل کے بعد دوسری نسل میں منتقل کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ مجھے اس نسل میں مبعوث کیا گیا، جس میں میں اب موجود ہوں۔''

یہ رسول اللہ ﷺ کے نسب کی عمدگی اور نفاست کے دلائل ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ اقدس واطہر سے سیدنا یوسف کے پاکیزہ اور بے عیب نسب کی گواہی بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔ ارشاد گرامی ہے:

« اَلْكَرِيْمُ ابْنُ الْكَرِيْمِ، ابْنِ الْكَرِيْمِ ابْنِ الْكَرِيْمِ يُوْسُفُ بْنُ يَعْقُوْبَ بْنِ اِسْحَاقَ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ » [بخاری : ۳۳۸۲]

''کریم بن کریم بن کریم بن کریم یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام۔''

واضح ہوا ہر دو انبیاء نسب کے اعتبار سے اعلیٰ ترین تھے۔

۲۔ ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں سے محرومی:

رسول اللہ ﷺ چھ سال کے تھے کہ مکہ و مدینہ کے درمیان واقع مقام ابواء پر دورانِ سفر ممتا کی بے مثال محبتوں سے محروم ہو گئے۔ [سیرت ابن ہشام : ۱۹۳/۱ من قول عبد اللہ بن ابی بکر]

سیدنا یوسف علیہ السلام کی والدۂ محترمہ بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کے بچپن میں اللہ کو پیاری ہو گئی تھیں۔ اس اعتبار سے دونوں انبیائے کرام کے حالات میں یہاں بھی مماثلت ہے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آزمائش اس اعتبار سے زیادہ تھی کہ وفاتِ والدہ کے بعد ان کا یہ چمنستانِ محبت مکمل طور پر اجڑ گیا تھا کیوں کہ والد پیدائش سے بھی قبل فوت ہو چکے تھے۔

[مستدرك حاكم : ٦٠٥/٢، ح ١٤٩١ـ حسن]

۳۔ بچپن میں دونوں نے بکریاں چرائیں:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، جنگلی پھل یعنی پکے ہوئے پیلو چن رہے تھے، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' کالے کالے اتارنا کیونکہ کالا پیلو بڑا عمدہ ہوتا ہے۔'' ہم نے کہا: '' اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! کیا آپ بھی بکریاں چرایا کرتے تھے (کیونکہ یہ پہچان تو بکریاں چرانے والوں ہی کو ہوتی ہے)؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَ هَلْ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا رَعَاهَا ؟» [بخاری : ٢٢٦٢]

'' ہاں! ایسا کوئی نبی نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔''

جب ہر نبیِ محترم کا یہ مشغلہ رہا ہے تو یوسف علیہ السلام نے بھی ضرور بکریاں چرائی ہوں گی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابتدائے عمر میں اس کام میں مشغول رہے تھے۔ یوں یہ بھی مشترک حالات میں سے ایک ہوا۔

۴۔ سچے خوابوں سے ابتدا:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کا یہ قول نقل فرمایا ہے:

﴿ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴾ [يوسف : ٤]

'' یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی سے کہا کہ میں نے خواب میں گیارہ ستارے،

سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔‘‘

یہ یوسف علیہ السلام کا پہلا خواب تھا جس سے ان کے والد گرامی یعقوب علیہ السلام نے خدا داد بصیرت کے تحت اندازہ فرما لیا کہ یوسف علیہ السلام کو نبوت کے لیے منتخب فرما لیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی نبوت کا آغاز خواب سے ہوا تھا تو رسول اللہ ﷺ کو بھی نبوت کے اولیں اشارے خواب ہی کے ذریعے دیے گئے۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

’’رسول اللہ ﷺ پر وحی کا آغاز سچے خواب سے ہوا تھا، آپ جو خواب دیکھتے وہ بعینہٖ واقع ہو جاتا تھا۔‘‘ [بخاری : ۳]

چنانچہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لائیں تو انھوں نے کہا تھا:

’’اگر محمد (ﷺ) سچے ہیں تو یہ آنے والا وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر آیا کرتا تھا۔‘‘

[مسند أحمد : ۱/۳۱۲، ح : ۲۸٤٥]

یعنی انھوں نے بھی خواب سے نبوت کی علامات پہچان لی تھیں، چنانچہ ہر دو انبیائے عظام کی نبوتوں کا آغاز خواب سے ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ادھر اچھے مستقبل کی نوید باپ نے دی تھی اور ادھر سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچا زاد ورقہ بن نوفل نے یہ خوشخبری سنائی۔

۵۔ اقربا کے ستائے دونوں راہِ ہجرت پر:

سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے اپنے بھائیوں کے حاسدانہ سلوک کے متعلق قرآن مجید سے ایک منظر ملاحظہ فرمائیے، قرآن مجید بتاتا ہے:

﴿ اقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ۝ قَالَ قَآىِٕلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴾ [یوسف : ۹، ۱۰]

’’یوسف (علیہ السلام) کو قتل کر دو یا کسی ایسی جگہ پھینک دو کہ تمھارے باپ کی توجہ صرف

تمھی پر مرکوز ہو جائے، ایک نے کہا: یوسف (علیہ السلام) کو قتل مت کرو، ہاں کسی ویران کنویں میں ڈال دو، کوئی راہ چلتا اسے نکال لے جائے گا۔ اگر تم نے ضرور ہی اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہے۔''

چنانچہ انھوں نے ایک بے گناہ شخص سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ایسا سلوک کیا، جس سے وہ اپنے پیارے باپ کے لطف و کرم اور وطن مالوف کی مانوس فضاؤں سے اک عرصہ تک دور رہنے پر مجبور ہوئے۔

یہ یوسف علیہ السلام کی سیرت کا ایک ورق ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب زیست میں بھی ہمیں ایسا ہی باب ملتا ہے کہ جب اپنوں کی چیرہ دستیوں کے ستائے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکر رضی اللہ عنہ کی دہلیز پر غم سے نڈھال کھڑے کہہ رہے تھے:

« فَإِنِّيْ قَدْ أُذِنَ لِيْ فِي الْخُرُوْجِ » [بخاری: ۳۹۰۵]

''ابو بکر! مجھے یہاں سے ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔''

چنانچہ راہِ خدا میں وطن چھوڑ جانے کی اذیت دونوں نے چکھی، گھر بار چھوڑ دینے کی تکلیف دونوں نے سہی اور اپنوں کے ستم سہہ کر راہِ ہجرت کے راہی بننے میں بھی دونوں مشترک رہے۔

۶۔ ''قتل ہو گئے!'' ہر دو کے لیے افواہ:

برادرانِ یوسف حسبِ سازش عشاء کے وقت روتے پیٹتے گھر پہنچے، مصنوعی دکھ اور جعلی غم کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے:

﴿ يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَ تَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ﴾

[یوسف: ۱۷]

''والد محترم! ہم دوڑ لگاتے ایک دوسرے سے آگے نکلتے چلے گئے تھے اور یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے کہ انھیں بھیڑیا کھا گیا۔''

گویا انھوں نے اعلان کر دیا کہ یوسف قتل ہو گئے اور یہ اعلان خلاف واقعہ یعنی جعلی تھا۔ ایسا ہی ایک اعلان رسول محترم جناب رسول کریم ﷺ کے لیے بھی احد کے میدان جنگ میں کیا گیا تھا کہ "محمد قتل ہو گئے۔" یہ اعلان بھی جھوٹ پر مبنی تھا کہ رسول کریم ﷺ زندہ وسلامت لشکر میں موجود تھے۔

۷۔ کنویں کی گہرائی سے گڑھے کی گہرائی تک:

برادرانِ یوسف سے متعلق قرآن مجید نے خبر دی اور قرآن مجید کی خبر سے سچی کسی کی خبر نہیں ہوتی، فرمایا:

﴿ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ﴾ [یوسف : ۱۵]

"اور وہ متفق ہو گئے کہ یوسف کو اندھے کنویں میں ڈال دیں۔"

یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ایک موڑ تھا کہ ان کا مقدس ومطہر جسم کنویں میں پڑا تھا۔ ایسا ہی ایک لمحہ رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں بھی آیا کہ راہِ جہاد میں برسر پیکار ہوتے ہوئے، آپ میدان احد کے ایک گڑھے میں گر گئے۔ سبحان اللہ! کیا مبارک ہیں وہ زخم، وہ چوٹیں اور وہ گرنا جو میدان جہاد میں پیش آئے کہ یہاں خود رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم دکھائی دیتے ہیں۔

۸۔ وہی ہوتا ہے جو منظور اِلٰہ ہوتا ہے:

برادرانِ یوسف نے حسن و جمال کے چاند سیدنا یوسف صدیق کو ملک بدر کیا تو مقصد یہ تھا کہ انھیں جو عزت و احترام اور محبت ولطف اپنے باپ کے ہاں سے میسر ہے وہ چھن جائے۔ یہی جرم تھا۔ خود ان کا اعتراف قرآن مجید میں مذکور ہے، انھوں نے کہا تھا:

﴿ لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ﴾ [یوسف : ۸]

"بالتحقیق، یوسف اور ان کے بھائی، ہماری نسبت ہمارے والد کے ہاں زیادہ محبوب ہیں، حالانکہ (ان دو کے مقابلے میں) ہم ایک جماعت ہیں۔"

تو کیا وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی عزت وتوقیر میں کمی لا سکے؟ ہر گز نہیں، انھوں نے بے توقیر کرنا چاہا تھا تو یہی چیز سیدنا یوسف علیہ السلام کی عظمتِ بے مثال کا سبب بنی۔

مشرکین نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے گھر اور بے در کر کے بے یار و مددگار کر دینے کی کوشش کی تو مشرکین کا یہی فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامیابی کا زینہ بن گیا۔ انھوں نے جلا وطن کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکمرانیاں عطا فرما دیں۔ اللہ اکبر!

﴿ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾
[آل عمران : ٢٦]

”اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر بھلائی ہے، بے شک تو ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے۔“

۹۔ قحط، جب لوگ گندم کے دانے دانے کو ترسنے لگے:

برادرانِ یوسف وہ جو کبھی یوسف علیہ السلام کی جان کے درپے تھے، جنھوں نے اس وجود کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا تھا، پھر وہ وقت بھی آیا جب وہ اسی ”ناقابلِ برداشت“ یوسف علیہ السلام کے در پر کھڑے نہایت لجاجت سے کہہ رہے تھے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ ﴾ [یوسف : ۸۸]

”اے عزیز! ہمیں اور ہمارے اہل وعیال کو بڑی مشکلات کا سامنا ہے اور ہم تھوڑی سی جمع پونجی لائے ہیں، آپ ہمیں غلہ پورا دے دیجیے اور خیرات بھی کیجیے کہ اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔“

یہ برادرانِ یوسف کی سرگزشت تھی۔ ادھر محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین و معاندین کو دیکھیے۔ قحط سالی نے انھیں بھی تکبر و نخوت بھلا کر اپنی اوقات پر لا پٹخا۔ نجد کے اس حاکم نے جو کبھی مسجد نبوی کے ستونوں سے بندھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کرتا تھا کہ ”میں آپ کا چہرہ دیکھنا برداشت نہیں کرتا“ آج وہ اسی چہرے کی دلنوازیوں کا اسیر ہو کر مکہ کے مشرکوں کا غلہ بند کر

دیتا ہے۔ ابوسفیان خود قوم کی نمائندگی کے لیے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر درخواست گزار ہوتا ہے۔ اسی کے دربار میں کہ جسے کبھی مکہ کی گلیوں سے نکال دیا گیا تھا۔ بہر حال، رسول اللہ ﷺ نے قحط سالی سے نجات کی دعا بھی فرمائی اور ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو اس 'عدم فراہمی گندم' پالیسی کو ختم کرنے کا حکم بھی جاری فرمایا۔

اب یہاں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور مشرکین مکہ کے حالات کی یکسانیت ملاحظہ فرماتے جایئے۔ دونوں قحط سالی کا شکار ہوئے، دونوں درخواستِ رحم کے لیے ناقابل برداشت ہستیوں کے در پہ پہنچنے پر مجبور ہوئے اور جواب میں دونوں کے ساتھ سب کچھ بھلا کر یکساں سلوک روا رکھا گیا۔

حروف مقطعات، حکمتیں اور اسرار

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الٓرٰ ۟ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۟﴿۱﴾

’’الرٰ، یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔‘‘

«الٓرٰ »: ’’الف، لام، را‘‘ یہ حروف مقطعات میں سے ہے، چونکہ ان الفاظ کو جدا جدا کر کے پڑھا جاتا ہے، اس لیے انھیں حروف ’مُقَطَّعَات‘ کہا جاتا ہے۔’مقطعات‘ کا مطلب ہے: ’الگ الگ کیے ہوئے‘، ’جدا جدا‘ یہ حروف بعض سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ ان کا معنی رسول اللہ ﷺ نے بیان نہیں فرمایا، اس لیے ہم بھی ان کے معانی کے پیچھے نہیں پڑتے۔

قرآن مجید کی کل ۱۱۴ سورتیں ہیں، جن میں سے ۲۹ کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے۔عربی زبان کے کل حروف تہجی ۲۸ ہیں۔جن میں سے ۱۴ حروف کا ذکر ’حروف مقطعات‘ ہوا ہے۔حروف مقطعات میں سے ایک حرفی سے شروع ہو کر پانچ حرفی تک الفاظ آتے ہیں۔

ایک حرفی، جیسے: صٓ، قٓ اور نٓ۔

دو حرفی، جیسے: حٰمٓ، طٰسٓ اور یٰسٓ۔

تین حرفی، جیسے: الٓمٓ، الٓرٰ اور طٰسٓمٓ۔

چار حرفی جیسے: الٓمٓصٓ، الٓمٓرٰ۔

بعض پانچ حرفی ہیں جیسے: کٓھٰیٰعٓصٓ اور حٰمٓ عٓسٓقٓ۔

اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں " الٓر " کے حروف آئے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ جتنی بھی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، ان سب میں انبیائے کرام کے حالات و واقعات کا تذکرہ ہے۔

حروفِ مقطعات لانے کے مقاصد:

عربوں کا مقولہ ہے: ﴿ فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَمْ يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ ﴾ ''دانا کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔'' رب کریم، جو سب سے بڑا دانا اور سب سے بڑا حکیم ہے، اس کا یہ کام کیسے حکمت و بصیرت سے خالی ہو سکتا ہے؟ یقیناً ان کے لانے کے کچھ مقاصد ہیں۔ ماثور تفاسیر میں حروفِ مقطعات لانے کے جو اغراض و مقاصد ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے بعض درجِ ذیل ہیں:

① قرآن مجید کلام محمد ﷺ نہیں، کلام الٰہی ہے:

عصرِ نبوت کے گمراہوں کی طرح آج کے مغربی مستشرقین اور فکری اغوا کاروں نے بھی بڑی کتابیں سیاہ کی ہیں کہ یہ قرآن اللہ کا کلام نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے گھڑ کے پیش کر دیا ہے۔ اس وقت کے لوگ بھی اس گمراہی میں بری طرح مبتلا تھے۔ ان کا بھی رسولِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پر یہی بہتان اور الزام تھا کہ نعوذ باللہ، رسول اللہ ﷺ کا کسی بہت بڑے ماہرِ ادب سے رابطہ ہے جو یہ سارے تاریخی قصے کہانیاں آپ کو سکھاتا ہے، بعد ازاں جسے آپ اللہ کے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان کا یہ لغو الزام نقل کیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ [النحل : ۱۰۳]

''ہمیں معلوم ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ اس پیغمبر کو ایک شخص سکھا جاتا ہے، مگر جس کی طرف (سکھانے کی) یہ نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف

عربی زبان ہے۔"

اندازہ کیجیے! مشرک کی مت کیسی ماری جاتی ہے۔ قرآن مجید کی آگاہی کے مطابق جس شخص کے متعلق یہ کم بخت کہتے تھے کہ فلاں شخص سکھاتا ہے، وہ خود عربی کا اہلِ زبان ہونے کی بجائے عجمی تھا، تو ایک عجمی النسل ایسی فصیح عربی کیسے سکھا سکتا تھا، جو خود اہلِ زبان کے ہوش اڑا دے؟ مگر یہ سامنے کی بات بھی ان کی عقل میں نہیں آئی اور وہ برابر الزام دیتے رہے۔ جب یہ سلسلہ تواتر سے جاری رہا تو ایک موقع پر ان دریدہ دہنوں کو قرآن مجید نے چیلنج کر دیا کہ اگر تم کہتے ہو کہ یہ رحمان کی بجائے انسان کا کلام ہے تو پھر تم بھی اپنے ادیب اور خطیب جمع کر لو، اپنے قبائل کے فصیح اللسان اور ماہرِ ادب جمع کر لاؤ۔ ادھر ادھر سے بھی جتنی کمک چاہتے ہو حاصل کر لو اور پھر ذرا ایسی چند سورتیں تو بنا کے دکھاؤ۔ ارشاد ربانی تھا:

﴿ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ [هود : ١٣]

"کہتے ہیں کہ اس نے قرآن خود بنا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو ایسی دس سورتیں تم بھی بنا لاؤ (اور اس کام میں مدد کے لیے) اللہ کے علاوہ جن جن کو بلا سکتے ہو بلا لو۔"

مگر یہ جھوٹے لوگ ایسا نہ کر سکے، باوجود اس کے کہ اپنے آپ کو 'عربی' یعنی فصیح اللسان اور باقی ساری دنیا کو 'عجمی' یعنی گونگے قرار دیتے تھے۔ جب عاجز و قاصر ہو گئے تو قرآن مجید نے ان کی بے بسی پر ایک اور تازیانہ برسایا۔ اب کے دس کی بجائے ایک سورت بنا لانے کا چیلنج دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿ أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴾ [یونس : ٣٨]

"کہتے ہیں کہ اس نے قرآن خود بنا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو ایسی ایک

سورت تم بھی بنا لاؤ (اور اس کام میں مدد کے لیے) اللہ کے علاوہ جن جن کو بلا سکتے ہو بلا لو۔"

یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن مجید نے دس سورتیں اور اس کے بعد صرف ایک سورت بنا لانے کا چیلنج کیا، تو یہ نہیں کہا کہ وہ سورتیں "بقرہ" جتنی بڑی ہونی چاہییں، بلکہ صرف سورت کا لفظ بولا کہ چلو بڑی بڑی بنانے سے عاجز ہو تو 'سورۃ الاخلاص' اور 'سورۃ العصر' جتنی چھوٹی سورتیں ہی بنا دیکھو۔ مگر مخلوق کے بس میں یہ تاب، یہ مجال اور یہ طاقت کہاں کہ وہ خالق کے کلام کا مقابلہ کر سکے۔ سو کبھی ایسا نہ کیا جا سکا اور جنھوں نے جسارت کی بھی تو گویا زمانے کی ہنسی کا سامان کیا۔

قرآن مجید یہ چیلنج مختلف انداز سے دہراتا رہا، چنانچہ حروفِ مقطعات لا کے بھی اللہ تعالیٰ نے یہی ثابت کیا ہے کہ اگر یہ کسی بے مثل ادیب، کسی لاثانی خطیب یا کسی بہت ماہرِ زبان شخص کے معجزہ فن کا نتیجہ ہے تو پھر تم بھی کوشش کر دیکھو۔ یہ جو حروفِ مقطعات قرآن مجید میں آئے ہیں، جنھیں الگ الگ، حرف حرف کر کے پڑھا جاتا ہے بہت انوکھے حروف نہیں بلکہ حروفِ تہجی ہی میں سے ہیں۔ انھیں حروف سے مل کر قرآن مجید ترتیب پایا ہے اور یہی حروف تمھارے پاس بھی ہیں، سو تم بھی کوشش کر دیکھو۔ اگر مخلوق کا کلام کہتے ہو تو تم بھی بنا کے لا دکھاؤ۔

دیانتِ رسول کا ناقابلِ تردید ثبوت:

حروفِ مقطعات جیسے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے، رسول اللہ ﷺ نے ویسے ہی امت کو بتا دیئے۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی کمال دیانت پر بھی اللہ تعالیٰ نے زبردست دلیل مہیا فرما دی ہے۔ گویا بتا دیا کہ دیکھو جہاں حروف اور کلمات کو جوڑ جوڑ کر مفہوم والی عبارت ہم نے نازل فرمائی تھی، وہ بھی رسول اللہ ﷺ نے تمھیں تلاوت کر کے سنا دی اور جن حروف کو ہم نے الگ الگ نازل فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حزم و احتیاط سے وہ

ویسے کے ویسے ہی تم تک پہنچا دیے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی تبدیلی نہیں کی۔ کیا دیکھتے نہیں کہ باقی سارا قرآن مجید رسول اللہ ﷺ نے باعبارت پڑھ کر سنایا ہے، اس کی تشریح بھی بیان کی ہے اور رحمان کے حسب منشا معنی بھی بتائے ہیں، مگر 'حروفِ مقطعات' پر نبوت کے لب اگر خاموش رہے ہیں تو آخر کیوں؟ خردمندو! ذرا سوچو تو سہی! اگر رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید اپنی طرف سے گھڑا ہوتا تو یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کچھ معانی بتا دیتے، مگر چونکہ یہ رحمان کا کلام ہے اس لیے آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہیں بتایا۔ اس سے اہل دانش کو سمجھ لینا چاہیے کہ رسول اللہ ﷺ اس قرآن کو بنانے والے نہیں، تم تک پہنچانے والے ہیں۔ کوئی لفظ تو کجا وہ زبر، زیر تک نہیں بدلتے، جیسے آیات والفاظ اترتے ہیں ویسے ہی آگے پہنچا دیتے ہیں، چنانچہ اس اعتبار سے بھی حروفِ مقطعات قرآنِ مجید کے وحی الٰہی ہونے پر زبردست دلیل ہیں۔

ایک عقلی دلیل:

دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنی صلاحیت کا دوسروں سے اعتراف نہ چاہتا ہو۔ کوئی معمولی سا مضمون لکھ لے، تو کتنے ہی اہتمام کرتا پھرتا ہے کہ یہ اس کے نام سے چھپے۔ غلطیوں سے بھری ہوئی کتاب بھی کوئی اپنے نام کے بغیر چھپوانا نہیں چاہتا۔ ایک شعر اور ایک تخلیقی فقرے پر تخلیق کار کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا نام لیا جائے۔ پھر کوئی سوچے تو سہی یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص ایسا بے نظیر کلام کہ دنیا کے سارے ادیب، سارے خطیب اور سارے فصحاء جس کی مثال نہیں لا سکے، بنا تو لے مگر اپنی اس صلاحیت کا اعتراف کروانے سے باز رہے۔ نہیں عقل اس کو نہیں مانتی اور خرد اس کو بھی روا نہیں جانتی کہ کائنات کے اس سچے ترین شخص کے متعلق یہ گمان باندھا جائے کہ جس کے جدید و قدیم قسم کے بدترین دشمن بھی اس کا ایک جھوٹ تک ثابت نہیں کر سکے؟

معنی نہیں، ثواب تو پھر بھی ہے:

اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق سے اور بالخصوص اہلِ ایمان سے محبت ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے

ایک حکمت کے تحت 'حروفِ مقطعات' کا مفہوم اور معنی نہیں بتایا، مگر ایسا نہیں ہوا کہ ان کی تلاوت کرنے والے کو ثواب سے بھی محروم رکھا گیا ہو۔ ہرگز نہیں، ذرا خالق کی عطا، بخشش اور ثواب ملاحظہ فرمایئے کہ وہ تو باقی قرآن مجید کی طرح حروفِ مقطعات کے بھی ایک ایک حرف پر ڈھیروں ثواب عطا فرماتا جا رہا ہے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ قَرَأَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ ، وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا، لَا اَقُوْلُ 'الم' حَرْفٌ، وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَ لَامٌ حَرْفٌ وَ مِيْمٌ حَرْفٌ»

[ترمذی، فضائل القرآن، باب ما جاء فی من قرء حرفا ...... الخ : ۲۹۱]

''جس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ایک حرف کی تلاوت کی اس کے لیے ایک نیکی ہے اور ہر نیکی کا ثواب دس گنا عطا کیا جاتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ 'الم' ایک حرف ہے بلکہ 'الف' ایک حرف ہے، 'ل' ایک حرف ہے اور 'م' ایک الگ حرف ہے۔''

«تِلْكَ» : عربی گرائمر کی رو سے ﴿تِلْكَ﴾ اسم اشارہ ہے۔ اس کا معنی 'وہ' ہے۔ عربی میں یہ لفظ دور کی مؤنث چیز کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مذکر کے لیے ﴿ذٰلِكَ﴾ کا کلمہ آتا ہے قریب مذکر کے لیے ﴿هٰذا﴾ اور مؤنث کے لیے ﴿هٰذِهٖ﴾ کے الفاظ مستعمل ہیں اب یہاں قریب کی بجائے بعید کا اسم اشارہ ﴿تِلْكَ﴾ کیوں استعمال ہوا؟ حالانکہ آیات تو سامنے اور قریب ہیں۔ دراصل عربی کا قاعدہ ہے کہ جب معنی میں زور اور تاکید پیدا کرنا مقصود ہو تو کبھی عبارت آگے پیچھے کر دی جاتی ہے اور کبھی اسمائے اشارہ وغیرہ، کو ایک دوسرے کی جگہ بدل کے لے آتے ہیں۔ اس سے کلام کے معنی میں زور پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں 'وہ' سے مقصود لوح محفوظ ہے اس لیے دور کا اشارہ لایا گیا۔ قریب کی جگہ بعید کے اشارے سے تعظیم اور شان بھی مقصود ہوتی ہے، مثلاً، جیسے کہا جاتا ہے ''یہ ہیں وہ آیاتِ قرآن جن میں کچھ شک نہیں۔'' بہر حال ﴿تِلْكَ﴾ وہ کے معنوں میں اسم اشارہ بعید ہے۔

﴿اٰيٰتُ﴾ : آیات، آیت کی جمع ہے اور یہ لفظ قرآن مجید میں کئی معانی کے لیے استعمال ہوا ہے مثلاً :

۱۔ بمعنی ''عبرت ونصیحت'' جیسے : ﴿ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ﴾ [آل عمران : ۱۳]

''یقیناً تمھارے لیے ان دو جماعتوں میں 'عبرت' تھی جو ایک دوسرے کے مقابلے میں آئیں۔''

۲۔ بمعنی نشانی، مثلاً : ﴿ فِيْهِ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ﴾ [آل عمران : ۹۷]

''اس میں واضح نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو کوئی اس میں داخل ہوا، امن والا ہوگا۔''

۳۔ بمعنی کلامِ الٰہی، جیسے : ﴿ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ ﴾ [مریم : ۵۸]

''جب ان پر رحمٰن کی آیات پڑھی جاتیں۔''

۴۔ معجزہ کے معنی ہیں، جیسے : ﴿ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ﴾ [العنکبوت : ۵۰]

''اور انھوں نے کہا اس پر اس کے رب کی طرف سے کسی قسم کے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے۔''

۵۔ دلائل کے معنی میں جیسے : ﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴾ [الذاریات : ۲۰]

''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے دلائل ہیں۔''

سورۂ یوسف کی مذکورہ آیت میں لفظ 'آیت' اللہ تعالیٰ کے کلام کے معنی میں ہے۔ قرآن مجید کے ہر جملہ کو آیت کہا جاتا ہے، کیونکہ خواہ کوئی سا بھی معنی مراد لیا جائے قرآن مجید کا ہر فقرہ اور ہر جملہ آیت ہی ہے کہ وہ معجزہ بھی ہے اور نشانِ قدرت بھی۔ وہ نصیحت بھی ہے اور باعثِ عبرت بھی، وہ صداقت و دلیل بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کا بے مثل و بے نظیر کلام بھی۔

﴿الْكِتٰبِ﴾ : لغت میں کتاب کا معنی 'تحریر کرنا' اور 'جمع کرنا' ہے۔ کتاب کو 'کتاب' اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں مختلف حروف کو صفحہ قرطاس پر جمع کر دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نزول

سے پہلے لوح محفوظ میں تحریری صورت میں جمع تھا، چنانچہ کتاب ہوا۔ نزول کے بعد بھی دنیا میں جس قدر اس کتاب کی کتابت و اشاعت کا اہتمام ہوا، زمانہ اس کی مثال لانے سے قاصر ہے۔ سو قرآن مجید ہر اعتبار سے 'کتاب' ہے۔ پھر ایسی کتاب کہ جس کے مضبوط قلعے میں شک کا کوئی دریچہ نہیں کھلتا۔ جس کا آغاز ہی دولتِ یقین کی فراوانی سے ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴾ [البقرة : ٢]

''یہ کتاب، اس میں کوئی شک نہیں، بچنے والوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔''

پھر کتاب ہی نہیں ایک 'جامع کتاب' کہ جس میں حکمت و بصیرت، مواعظ و امثال، تاریخ قصص اور احکامِ شریعت یعنی دین و دنیا کی رہنمائی کا بے مثال امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

«الْمُبِيْنِ»: مبین ہونے کا مطلب ہے کہ یہ کتاب ہر چیز کو کھول کھول کر اور واضح کر کے بیان کرنے والی ہے۔ کوئی شک اور شبہ باقی نہ چھوڑنے والی یہ کتاب حلال و حرام اور اوامر و نواہی میں تفریق و تمیز کرنے والی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مبین کہا تو خاص نہیں فرمایا کہ یہ کس اعتبار سے مبین ہے؟ جب خاص نہیں فرمایا تو پھر اس کا مبین ہونا عام ہے، چنانچہ یہ کتاب ہدایتِ انسانی کے لیے ہر ضروری اور مفید چیز واضح کرتی چلی جاتی ہے، مگر ہر شخص کے لیے ہرگز نہیں، صرف اس کے لیے جو اس میں تدبر کرے، غور و خوض سے اس کی تہہ میں جھانکے اور جو بھی سوچ بچار کرتا ہے وہ گواہی دیتا ہے کہ یہ کتاب واقعی مبین ہے۔ یہ حق کو باطل سے اور حلال کو حرام سے واضح کرتی ہے۔ یہ خالق کے کلام کی مخلوق کے کلام پر برتری واضح کرتی ہے۔ پھر اس اعتبار سے بھی مبین ہے کہ پہلی امتوں کے انسانوں کے قصے اور حالات بیان کرتی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ جس کتاب میں رشد و ہدایت اور حلال و حرام واضح کیے گئے ہوں وہ کتاب مبین ہوتی ہے۔

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ کتاب مبین اس اعتبار سے ہے کہ عجمی زبانوں سے جو الفاظ ساقط ہو گئے تھے، یہ ان کی حامل ہے۔ بہر حال قرآنِ مجید سے بڑھ کر کوئی کتاب

مبین نہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ کائنات میں یہی ایک کتاب مبین ہے تو چنداں غلط نہ ہوگا۔ قرآنِ مجید کتاب مبین ہے مگر اس کے باوجود اگر اس سے کسی کے دماغ اور دل میں شک کا بیج جڑ پکڑ جاتا ہے تو اس میں قصور اس کتاب کا نہیں، خود اس ذہن کا ہے جس کی سرزمین زہریلی ہو چکی ہے، اتنی کہ اس میں اب شک کے سوا کچھ پنپ ہی نہیں سکتا۔ انسانوں کے ذہنوں کا حال بھی زمین ہی جیسا ہے، بارش سے زمین کے بعض زرخیز حصے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر بنجر زمین کو بارش کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ وہاں الٹا جھاڑ جھنکار اگ آتے ہیں۔ کانٹے دار جھاڑیاں پرورش پا جاتی ہیں۔ تو اب کوئی بارش پہ الزام دھرے تو اس میں بارش کا کیا قصور؟ آپ دیکھیے قرآن مجید میں شہد کے متعلق فرمان الٰہی ہے:

﴿ فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ﴾ [النحل : ٦٩]

''شہد میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کے دور کی بات ہے کہ ایک صحابی کے بھائی کا پیٹ خراب ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے شہد تجویز کیا۔ صحابی شہد استعمال کروا کے آ گیا کہ شفا نہیں ہوئی، آپ نے فرمایا: ((اِسْقِهِ عَسَلًا)) ''اسے شہد پلاؤ۔'' وہ تیسری مرتبہ آ گیا کہ میں تو ایسا کر چکا مگر افاقہ نہیں ہو رہا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((صَدَقَ اللّٰهُ، وَ كَذَبَ بَطْنُ اَخِيْكَ، اِسْقِهِ عَسَلًا)) [بخاری : ٥٦٨٤]

''اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، تم اسے شہد ہی پلاؤ۔''

اب کے پلایا گیا تو پیٹ ٹھیک ہو گیا۔ اب جب شہد سے بظاہر فائدہ نہ ہو رہا تھا تو اس سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شہد میں شفا کی تاثیر نہیں رہی، جن کے ذہن بیمار ہوں وہ اس صحابی کی طرح کامل یقین کے ساتھ قرآن مجید سے علاج کرتے رہیں تو ضرور فائدہ ہوگا۔

قرآن مجید مبین ہے، ہدایت ہے، مگر ان لوگوں کے لیے جو دل کی صاف تختی اور دماغ مومن لے کر حاضر ہوں۔ وگرنہ وہ اور زیادہ گمراہی میں جا پڑتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر خرابی، نفاق اور ذہنی کجی اتنی ہوتی ہے کہ وہ قرآن سے ہدایت لینے سے عاجز رہتے

ہیں۔ نتیجتاً خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی راہِ راست سے بھٹکا دیتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [البقرة : ٢٦]

''قرآن کے ساتھ بہت سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہت سے ہدایت پاتے ہیں، مگر اس کے ساتھ گمراہ صرف فاسق لوگ ہی ہوتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ اگر کوئی قرآن مجید سے یقین کی بجائے شک کشید کرتا ہے تو اس میں قرآنِ مجید کے مبین ہونے پر حرف نہیں آتا۔ فی الاصل ان کی شک میں بڑھوتری دراصل عقیدے کی خرابی اور ایمان کی بربادی کے سبب سے ہوتی ہے۔ یہ وہ محروم القسمت لوگ ہوتے ہیں جو ہدایت کے سرچشمے سے بھی تشنگی لے کر لوٹتے ہیں۔ شکوک وشبہات کے یہ سوداگر قرآن مجید سے غلط استدلال کر کے لوگوں کی گمراہی میں لگے رہتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن مجید کا مفہوم بدلتے اور معنی میں ہیر پھیر کرتے ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ یہ نا ہنجار لوگ اسی عادتِ بد میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہود ونصاریٰ جس کے باعث تباہ و برباد ہو گئے تھے، ان کا بھی یہی کام تھا جیسا کہ قرآن مجید ارشاد کرتا ہے:

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ﴾ [المائدة : ١٣]

''وہ کلام کو اس کی جگہوں سے پھیر دیتے ہیں۔''

وہی بے توفیق جن کے متعلق اقبال نے کہا......؎

خود بدلتے نہیں قرآں بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

بہر حال قرآنِ مجید مبین ہے۔ وہ ہر قسم کے شک وشبہ کو ختم کرنے والی، عقائد کو پختہ کرنے والی اور اعمال کی اصلاح کرنے والی کتاب ہے۔ وہ جو گمراہ ہوتا ہے، دراصل اس نے گمراہی کی سیاہ عینک لگا رکھی ہے اور اب اس کی نظر اتنی بیمار ہو چکی ہے کہ اسے 'سفید' بھی 'سیاہ' نظر آتا ہے۔ جب تک وہ یہ عینک اتار نہیں دیتا، ہدایت سے کچھ حصہ نہیں پا سکتا۔

قرآنِ مجید پر اعتراضات وشبہات کا ازالہ

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝٢ ﴾

''بے شک ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے، تاکہ تم سمجھو۔''

﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ ﴾: یہاں پہلی بار سورۂ مبارکہ میں پورے جزم کے ساتھ اعلان کیا جا رہا ہے کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا کچھ حصہ نہیں، اس میں انسانی کلام کو بالکل دخل نہیں۔ یہ سارے کا سارا اللہ رب العزت کا مبارک ومقدس کلام ہے، کائنات میں کسی اور کلام یا اور کتاب کو یہ فضیلت ہرگز حاصل نہیں، جو قرآن کے دامنِ بابرکات میں جمع ہو چکی ہے۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی سند بھی بیان فرما دی۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَإِنَّهُۥ لَتَنزِيلُ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝١٩٢ نَزَلَ بِهِ ٱلرُّوحُ ٱلْأَمِينُ ۝١٩٣ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ ٱلْمُنذِرِينَ ۝١٩٤ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴾ [الشعراء: ١٩٥]

''اور یہ قرآن پروردگارِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے، آپ کے دل پر اتارا گیا ہے تاکہ (لوگوں کو) نصیحت کرتے رہو۔''

اندازہ کیجیے کہ جس نے بھیجا وہ ساری کائنات کا رب، خالق اور مالک ہے۔ لانے والا فرشتہ، بتا دیا گیا کہ 'امین' ہے اور جس کی طرف نازل فرمایا گیا وہ نبی بھی امین ہے۔ لہٰذا رخنہ اندازی یا کسی درز سے کسی نقب کا کچھ احتمال نہیں۔ یہ قرآن بڑی احتیاط، بڑے تحفظ اور کمال حفاظتی حصار میں سیدھا رسول اللہ ﷺ کے دل پر اتارا گیا ہے، چنانچہ بغیر کسی شک وشبہ

کے یہ سارے کا سارا رب کا کلام ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان کہ 'ہم نے نازل کیا' پوری طرح اس پر صادق آتا ہے پھر یہی کتاب ہے جو روئے ارض پر اب بھی محفوظ ہے اور کیوں نہ ہوتی کہ حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اٹھا رکھا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ [الحجر : ۹]

''بے شک ہم ہی نے یہ نصیحت نازل کی ہے اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

یہاں قرآن مجید کو 'ذکر' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا اور بالتحقیق یہ بتانے کے بعد کہ 'ہم نے اسے نازل فرمایا ہے' ساتھ ہی یہ اعلان بھی فرما دیا کہ اس کی حفاظت ہم نے انسانوں کے ذمے نہیں لگائی۔ اس اہم ترین کتاب کے ہم خود ہی محافظ ہیں۔ قبل ازیں تورات اور انجیل وغیرہ کی حفاظت اللہ رب العالمین نے خود انسانوں کے سپرد فرمائی تھی، جیسا کہ قرآنِ مجید بیان فرماتا ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ ﴾ [المائدۃ : ٤٤]

''بے شک ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی تھی، انبیاء، جو فرماں بردار تھے، اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے، ان لوگوں کے لیے جو یہودی بنے اور رب والے علماء اس لیے کہ وہ کتاب اللہ کے محافظ بنائے گئے تھے۔''

چنانچہ ہوا یہ کہ انسانی فوز وفلاح اور ہدایت کے لیے نازل ہونے والی کتابیں انسانی خواہش کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن کے رہ گئیں اور حال یہ ہوا کہ خود قرآنِ مجید کے الفاظ میں:

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ ﴾ [المائدۃ : ۱۳]

وہ کلام کو اس کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں اور انھوں نے اس میں سے ایک حصہ بھلا دیا جس کی انھیں نصیحت کی گئی تھی۔''

اب یہ قرآن مجید آخری کتاب ہے اور اسے تا قیامت انسانیت کی راہنمائی کے لیے موجود رہنا ہے۔ اب نہ کسی اور نبی نے آنا ہے اور نہ کسی اور کتاب نے، اس لیے اللہ رب العالمین نے اس بھاری ذمہ داری کو نااہل انسانوں پر نہیں چھوڑا۔ یہی بات یہاں بیان ہو رہی ہے کہ یہ قرآن ہم ہی نے اتارا ہے۔ ہمیں اس کے محافظ ہیں، لہٰذا اس میں کسی اور کا کچھ حصہ نہیں۔ اس کے حالات اور معاملات پہلی کتابوں سے مختلف ہیں کہ پہلی کتابوں میں انسانوں کے حصے بھی شامل ہو گئے تھے۔ ان کتابوں میں شارحین اور مفسرین کے اپنے خیالات اور اقوال بھی شامل ہو گئے تھے۔ مثلاً آپ انجیل کو ملاحظہ کر لیجیے۔ اس وقت ایک تو تختۂ زمین پر انجیل اپنی اصل زبان میں موجود ہی نہیں، انجیل کا ہر نیا ایڈیشن، پچھلے ایڈیشن سے کسی نہ کسی طور مختلف اور بدلا ہوا ملتا ہے۔ پھر یہ بات بھی متعجب کر دینے والی ہے کہ انجیل کے نام سے اس وقت چار کتابیں موجود ہیں۔ اب اللہ کی نازل کردہ انجیل تو ایک تھی مگر اب جو دستیاب ہیں وہ چار کیوں ہیں؟ ایک متی کی انجیل ہے۔ ایک یوحنا کی انجیل ہے۔ ایک لوقا کی اور ایک مرقس کی انجیل۔ دراصل یہ چار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اصل انجیل کو اپنے اپنے طور پر جمع کر کے کتابی شکل میں لکھا۔ اب انجیل میں ان صاحبوں کی باتیں بھی داخل ہو گئی ہیں۔ جس طرح کسی نے کچھ دیکھا ویسے ہی درج کر دیا۔ پھر ایک انجیل اور ہے انجیل برناباس یہ باقی چاروں سے مختلف ہے۔ تو اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ رب کی نازل کردہ انجیل ہے۔ یہی حال تورات کا ہے، تورات پر بھی بڑے ستم ٹوٹے۔ اس کے بھی حصے بخرے ہوئے۔ بار بار بخت نصر حملہ آور ہوتا رہا اور بار بار تورات کی تختیاں توڑ پھوڑ کر دریا میں بہاتا رہا۔ یہاں تک کہ تورات کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ پھر بعد کے لوگوں نے یاد کر کر کے لکھا اور یوں بہت کچھ خود ان کی اپنی طرف سے اس میں شامل ہو گیا۔ یہ حال ہوتا رہا ہے تورات اور انجیل کے ساتھ مگر قرآن مجید ان تمام حادثات سے محفوظ ہے اور اسے ان شاء اللہ محفوظ ہی رہنا ہے۔

«قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا» : لفظِ قرآن مبالغے کا صیغہ ہے، قرآن کا مطلب ہے بار بار پڑھی جانے والی کتاب، اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کو قرآن کہا تو یہ بھی ایک پیش گوئی تھی۔ آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی مصنف اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے جھجکتا ہے۔ مصنف معذرت خواہانہ انکسار سے عرض پرداز ہوتا ہے کہ قارئین اس کی غلطیوں سے صرف نظر فرمائیں۔ دعائیں کرتا ہے کہ اللہ کرے کتاب مقبول عام ہو جائے، لوگوں کی توجہ حاصل کر لے، مگر یہ قرآن مجید واحد کتاب ہے جس کے پیش کرنے والے نے پورے اعتماد سے یہ اعلان کیا ہے کہ لوگو! یہ کتاب غلطیوں سے مبرّا ہے۔ اس کتاب کو عدمِ قبولیت کا ذرا بھی اندیشہ نہیں بلکہ اس کے نام ہی میں بتایا جا رہا ہے کہ اس کتاب کو ایک بار نہیں بار بار پڑھا جائے گا۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کے پڑھنے والے کم نہ ہوں گے، یہ قرآن کبھی تلواروں کی جھنکاروں میں تلاوت ہوگا تو کبھی شب زندہ داروں کی سسکیوں اور پکاروں میں گونج رہا ہوگا۔ یہ مسجد کی محراب میں پڑھا جائے گا اور قطار اندر قطار لوگ آہوں سے بھرے سینوں اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سن رہے ہوں گے۔ بار بار پڑھے جانے کی پیش گوئی قرآن نے پورے اعتماد سے آغاز ہی میں کر دی تھی اور ہر گزرتا دن اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرتا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل عرب پہ اپنے خاص احسان کا بھی اس ذیل میں تذکرہ فرمایا کہ یہ قرآن تو خود تمھاری اپنی زبان میں نازل ہوا ہے۔ یہ کوئی کم فضیلت والی بات نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے عربوں کی سرزمین کو نبیٔ رحمت سے نسبت کا شرف بخشا، ویسے ہی ان کی زبان کو بھی جہان بھر کی زبانوں پر ترجیح دے کر ان کا سرفخر سے بلند کر دیا ہے۔ جن عیسائیوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق سوال کیا تھا، ان کی زبان بھی عربی ہی تھی، یعنی جس زبان میں سوال ہوا اس میں جواب دے دیا گیا تاکہ کسی عذر کی گنجائش باقی نہ رہے، کیونکہ ان تاویل طرازوں اور بہانے بازوں کی سرشت تو معلوم ہی تھی کہ بات بے بات اعتراض کرتے رہتے تھے، اگر قرآنِ مجید عربی زبان میں نہ ہوتا تو یہ بھی ان کے لیے ایک مستقل

اعتراض ہوتا، جیسا کہ قرآنِ مجید نے بیان کیا ہے:

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ﴾ [حٰمٓ السجدة : ٤٤]

''اور اگر ہم اس قرآن کی زبان عربی کے علاوہ کوئی اور بنا دیتے تو کافر کہتے کہ اس کی آیات واضح کیوں نہیں۔''

قرآنِ مجید میں غیر عربی الفاظ:

مفسرین کے ہاں یہ بات بھی مختلف فیہ ہے کہ کیا قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں یا نہیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں:

''جس نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ ہیں تو اس نے غلط بات کہی اور اللہ کے ذمے بڑی بات لگا دی ہے۔'' استدلال انھوں نے اسی آیت سے کیا ہے کہ: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا﴾ ''ہم نے یہ قرآن عربی میں نازل کیا ہے۔'' تاہم ابن عباس، مجاہد اور عکرمہ کا موقف ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ موجود ہیں، مثلاً: سجّیل، مشکوٰۃ، الیم اور استبرق وغیرہ۔ تفسیر خازن کے مؤلف نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور ساتھ دونوں قسم کے اقوال کے درمیان ایک جمع کی صورت بھی نکالی ہے کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ موجود ہیں جو اصلاً عجمی زبانوں کے ہیں، مگر اب جب وہ عربوں کی زبان پر چڑھ کر فصیح عربی کا روپ دھار چکے ہیں تو وہ گویا عربی ہی ہو گئے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جس خطے کی طرف کوئی نبی مبعوث فرمایا، تو اس کی زبان وہی تھی، جو اس کے مخاطبین کی زبان تھی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ﴾ [ابراهيم : ٤]

''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں۔''

تورات عبرانی زبان میں تھی، انجیل سریانی میں تھی، قرآن مجید کے اولیں مخاطب چونکہ عرب تھے، سو اللہ تعالیٰ نے اسے عربی میں نازل فرمایا۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾: قرآن مجید کے مخاطب خطہ عرب کے لوگ تھے چنانچہ ارشاد ہوا کہ قرآن مجید کو خود تمھاری ہی زبان میں نازل کیا گیا ہے تا کہ تم سمجھو۔

قرآنِ مجید عربی میں کیوں؟

عربی زبان فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ایک بے مثال زبان ہے۔ ادائے مفہوم اور بیانِ معنی میں کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس میں انتہا درجے کی جامعیت اور نہایت شاندار اختصار ہے۔ زبانوں کے ماہرین عربی زبان کی دیگر زبانوں پر برتری کے بے شمار دلائل بطور مثال لا سکتے ہیں، تاہم ایک مسلمان کے لیے عربی کا اتنا ہی شرف کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے قرآن مجید کی زبان بنا دیا ہے۔ دراصل کتاب اللہ اشرف ترین کتاب ہے۔ ممتاز ترین رسول محمد ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ سید الملائکہ جبریل علیہ السلام اسے لے کر آئے ہیں۔ محترم ترین مہینے رمضان میں اس کا نزول ہوا ہے۔ افضل ترین خطۂ زمین اس کے لیے چنا گیا ہے۔ اس کتاب کے مخاطب بھی بہترین امت کے لوگ ہیں، چنانچہ بہترین کے اس سلسلہ کو فصیح ترین زبان کا انتخاب فرما کر ہر اعتبار سے مکمل اور بے مثال کر دیا گیا ہے۔

کوئی دوسری زبان کیوں نہیں؟

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ آخر عربی ہی کیوں؟ کوئی دوسری زبان کیوں نہیں؟ تو اس کا جواب ایک تو وہی ہے جو ہم بیان کر چکے کہ جب قرآن مجید کے لیے عمدہ ترین شخصیات، بہترین امت یعنی محترم ترین انتخاب ہی بروئے کار گئے تو زبان کے سلسلے میں کوئی کم تر یا کم ترین زبان کیوں کر چنی جا سکتی تھی؟ اور دوسرا جواب خود قرآن مجید نے بیان فرما دیا ہے کہ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ یعنی ''تا کہ تم سمجھو۔''

چونکہ قرآنِ مجید انسانوں کی رہنمائی کے لیے نازل ہوا ہے۔ اس لیے لازم تھا کہ انسانوں ہی کی کسی زبان میں ہوتا تا کہ وہ اس کو سمجھ سکتے۔ جب انسانوں ہی کی زبان میں اس کتاب نے آنا تھا تو پھر انسانوں کی کسی نہ کسی زبان کا انتخاب تو ہونا ہی تھا۔ اب چونکہ

عربی زبان میں وہ صلاحیت موجود تھی جو کسی ایسی زبان میں ہونی چاہیے جو نا صرف اپنی صفات میں مکمل ہو بلکہ قیامت تک کے لیے زندہ بھی رہ سکے، پھر قرآنِ مجید کے اولین مخاطبین بھی عرب تھے اور طے یہ پا گیا تھا کہ باقی دنیا قرآنِ مقدس اور شریعتِ مطہر کی روشنیاں عربوں کے واسطے سے حاصل کریں گے تو پھر یہی عین مناسب تھا کہ اس کتاب کے لیے عربی زبان کا انتخاب فرمایا جاتا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

جس طرح معلوم کہ ہر زبان میں مزید لہجے ہوتے ہیں۔ ہر چند سو کلومیٹر کے بعد ایک ہی زبان کے لہجے میں فرق آنے لگتا ہے۔ پورے پنجاب میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے مگر ہر علاقے کا لہجہ جداگانہ ہے۔ اہل لاہور کا لہجہ اور ہے۔ میانوالی کی دوسری ہی چھب ہے۔ فیصل آباد کا لہجہ بھی نمایاں طور پر الگ پہچانا جاتا ہے۔ ادھر سرائیکی پٹی بھی کہنے کو پنجابی ہی بولتی ہے مگر ان کا انداز اور لہجہ قطعی طور پر مختلف اور منفرد ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ چنانچہ اہل عرب کے ہاں بھی متعدد لہجے ہیں۔ اب یوں تو سعودی عرب اور مصر دونوں ہی ممالک میں عربی زبان بولی جاتی ہے مگر مشاہدہ ہے کہ جس نے سعودی عرب میں عربی سیکھی ہو، مصر جا کر اس کا عربی بولنا ہی نہیں سمجھنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ مصری 'جیم' کا تلفظ 'گ' سے کرتے ہیں۔ اسی سے وہ لطیفہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ عین صحن کعبہ میں کوئی مصری دعا کر رہا تھا اور پاکستانی عربی دان اسے سخت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ دراصل مصری کہہ رہا تھا: ﴿ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ الْگَنَّةَ ﴾ ''اے اللہ! مجھے گنا عطا فرما۔'' پاکستانی حیرت زدہ تھا کہ کیا اسے اپنے ملک میں گنا بھی نہیں ملا۔ دراصل وہ مصری الجنة یعنی جنت کہہ رہا تھا۔

بہر حال عربوں میں فصیح ترین لہجہ اہل قریش کا ہے۔ اسی لہجہ میں قرآن مجید کا نزول ہوا اور سرکار دوعالم کا ارشاد ہے کہ ''قرآن مجید کو اہل عرب کے لہجے میں پڑھو۔''

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

بعض لوگوں کو غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ چونکہ قرآن مجید عربی زبان میں ہے اور عرب ہی

اس کے مخاطب ہیں تو اس پر عمل پیرا ہونے کے ذمہ دار بھی وہی ہیں۔ اسی غلط فہمی کی بنا پر دانش وری کے بعض جعلی دعویدار بہت سے اسلامی احکامات کو عربوں کے ساتھ خاص سمجھے بیٹھے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں۔ قرآن مجید اپنے نزول اور مابعد کے تمام زمانوں اور جمیع انسانوں کے لیے اترا ہے۔ سبھی انسان اس کے مخاطب ہیں اور سبھی انسانوں پر اسے ماننا اور اس پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ دراصل کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی ایک خطے اور زبان کے حامل لوگوں میں پوری طرح برپا کر دی جائے اور پھر وہ لوگ اس دعوت کو اپنی روح کی گہرائیوں تک اتار کر چہار دانگِ عالم میں پھیلا دیں، اسی مقصد کے لیے اس کے مخاطب عرب ہیں وگرنہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ قرآن مجید کے داعی کے متعلق ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

[سبا : ۲۸]

”اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

جس طرح داعی کی بعثت عالمگیر اور جمیع انسانیت کے لیے ہے، اسی طرح قرآن مجید کی دعوت بھی پوری انسانیت اور ساری کائنات کے لیے ہے۔ ارشادِ گرامی ملاحظہ فرمایئے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [البقرۃ : ۱۸۵]

”رمضان وہ مہینا ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے لیے سراسر ہدایت ہے۔“

﴿ لَعَلَّكُمْ ﴾: کا مطلب ہے: ”امید ہے کہ، شاید کہ“ مگر جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو پھر شک کا شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق احتمال ہو کہ اسے شک ہو سکتا ہے، ایسا ہر احتمال باطل ہے۔ اللہ رب العزت تو کائنات کی ہر عیاں اور نہاں چیز کا جاننے والا ہے، بلکہ وہ تو دل کی پوشیدہ باتوں کو بھی بخوبی جانتا ہے، جیسا کہ خود اللہ تبارک و

تعالیٰ ہی کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ اَوَ لَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ [العنكبوت : ١٠]

''اور کیا اللہ اس کو زیادہ جاننے والا نہیں، جو سارے جہانوں کے سینوں میں ہے۔''

سلف میں سے مفسرین نے یہاں 'لَعَلَّ' کا معنی 'تا کہ' کیا ہے تاہم اردو مفسرین میں سے بعض نے اس کو 'شاید' کے معنوں میں لیا ہے، جو درست نہیں۔

«تَعْقِلُوْنَ»: قرآن مجید کے نزول کا یہاں مقصد یہ بتایا جا رہا ہے کہ اسے سمجھا جائے، اس میں گہرا تدبر اور غور وفکر کیا جائے۔ افسوس ہے کہ بہت سے لوگ قرآن مجید کو محض ثواب کی کتاب سمجھتے ہیں یا پھر جھوٹے سچے حلف اٹھانے میں اس کتاب کی تقدیس کو استعمال کر لیتے ہیں۔ دراصل خود بعض نام نہاد علماء نے بڑی محنت سے اس فکر کو پروان چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے تو سولہ علوم میں ماہر ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ وہ کسی کو اس کا ترجمہ پڑھنے نہیں دیتے کہ تمھاری سمجھ میں نہیں آ سکتی بلکہ ایک دور تھا کہ برصغیر میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ کرنے والے شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کو چھپنا پڑا تھا کہ لوگ اس 'جرمِ عظیم' کی پاداش میں ان کے قتل کے در پے ہو گئے تھے۔ اب تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے ویسے حالات نہیں، بہر حال یہ بڑی غلط فکر ہے۔ قرآن مجید محض کتابِ ثواب ہی نہیں، جہاں بانی اور جہانگیری کے اسلوب سکھانے والی کتاب بھی ہے، جس کے معانی اور تفسیر جاننا ازبس ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بڑی عمدہ بات کی ہے، انھوں نے پہلے بطور دلیل تین آیات پیش کی ہیں:

﴿ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ﴾ [محمد : ٢٤]

''یہ لوگ قرآن مجید میں غور کیوں نہیں کرتے؟''

﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ ﴾ [المؤمنون : ٦٨]

''تو کیا انھوں نے بات میں خوب غور نہیں کیا؟''

ظاہر ہے جب تک بات کے معنی نہ سمجھے جائیں فہم و تدبر ممکن ہی نہیں۔

پھر مذکورہ آیت: ﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ پیش کر کے لکھتے ہیں:

''اور بات عقل میں کیسے آ سکتی ہے جب تک سمجھی نہ جائے۔''

مزید فرماتے ہیں:

''پھر معلوم ہے کہ ہر گفتگو اسی لیے ہوتی ہے کہ اس کے معنی سمجھے جائیں نہ کہ محض لفظ سن لیے جائیں، پھر قرآن کا معاملہ تو بالاولیٰ فہم و تدبر کا متقاضی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ لوگ کسی فن مثلاً طب یا حساب کی کتاب تو پڑھیں مگر اسے سمجھنے کی کوشش نہ کریں۔ جب عام کتابوں کا یہ حال ہے تو پھر کتاب اللہ کا فہم کس قدر ضروری ٹھہرتا ہے۔ وہ کتاب اللہ جو مسلمانوں کے لیے اصلی بچاؤ ہے جس میں ان کی نجات اور سعادت ہے۔ جس سے ان کے دین اور دنیا کا قیام ہے۔''

[اصول تفسیر از ابن تیمیه، ص ١٤]

منصبِ رسالت پر الٰہی توضیحات

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۳

''ہم تجھے سب سے اچھا بیان سناتے ہیں، اس واسطے سے کہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن وحی کیا ہے۔''

مدینہ میں موجود یہودی رسول اللہ ﷺ کے متعلق خوب جانتے تھے کہ آپ سچے رسول ہیں۔ اتنا جانتے تھے کہ قرآنِ مجید کی زبان میں ﴿ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ﴾ [البقرۃ : ١٤٦] جتنا والدین اپنی اولاد کو جانتے ہیں، مگر محض اس حسد کی وجہ سے کہ آپ اولادِ اسماعیل میں کیوں مبعوث ہوئے، اعتراض پر اعتراض جڑتے جا رہے تھے۔ جب ماننا ہی نہ ہو تو پھر اعتراضات کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ اب انھوں نے اپنی طرف سے بڑا تیر مارا تھا کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ امی ہیں۔ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور تاریخ سے ناواقف ہیں تو ان سے واقعہ یوسف کے متعلق سوال کرتے ہیں، جب بتا نہ پائیں گے تو ہم تالیاں پیٹیں گے۔

سوال کیا تھا؟

یعقوب علیہ السلام کا خاندان فلسطین میں آباد تھا۔ فلسطین تب شام کا حصہ تھا، شام بڑی وسیع علاقوں پر مبنی سلطنت تھی۔ اردن، یروشلم اور فلسطین سبھی شام میں شامل تھے۔ یعقوب علیہ السلام یہیں بستے تھے۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق سے ہجرت فرمائی اور فلسطین کو اپنا مسکن بنا لیا۔ یہیں اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے جنھیں بعد ازاں ابراہیم علیہ السلام مکے کی بے آب و گیاہ وادی

میں چھوڑ آئے اور اللہ سے اپنی محبت میں سرخرو ٹھہرے۔ پھر اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اسحاق علیہ السلام کے ہاں یعقوب تولد ہوئے۔ آگے یعقوب علیہ السلام کی جتنی بھی اولاد ہے، انھیں بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ 'اسرا' کا معنی بندہ ہے اور 'ایل' کا لفظ عبرانی میں اللہ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جیسے ہم خدا کہہ لیتے ہیں تو اس کا معنی ہوا عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔

بنی کا معنی 'بیٹے' ہیں۔ یعقوب علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بارہ بیٹے عطا فرمائے تھے۔ ان بارہ بیٹوں کی اولاد آگے بنی اسرائیل کہلائی۔ بنی اسرائیل کے کل بارہ قبیلے تھے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی ان کے بارہ ہی قبیلے تھے۔ جب بنی اسرائیل جہاد سے روگردانی کی پاداش میں میدان تِیہ میں بھٹک رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بارہ ہی چشمے جاری فرما دیے تھے تاکہ ہر قبیلہ با آسانی اپنے چشمے سے پانی پیتا رہے۔ قرآن مجید میں اس کے متعلق آیت ہے:

﴿ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰی مُوْسٰۤی اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗۤ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ ﴾

[الأعراف: ۱٦۰]

''اور ہم نے انھیں بارہ قبیلوں میں تقسیم کر دیا، جو کئی گروہ تھے اور ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی، جب اس کی قوم نے اس سے پانی مانگا کہ اپنی لاٹھی اس پتھر پر مار تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، بلاشبہ سب لوگوں نے اپنی پانی پینے کی جگہ معلوم کر لی۔''

بہرحال یہودیوں نے سوال کیا اور سوال یہ تھا کہ جب یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا مسکن شام کا علاقہ فلسطین تھا تو پھر یہ مصر کیسے پہنچ گئے؟ ہمیں یہ سارا واقعہ بتاؤ۔ یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ دیگر انبیاء کے واقعات عربوں کے ہاں معروف تھے۔ وہ قومِ عاد کے متعلق جانتے تھے اور ثمود کی خبروں سے بھی آگاہ تھے، تاہم یوسف علیہ السلام کا قصہ معروف تو تھا مگر اس

کی تفصیلات کہیں سے نہ ملتی تھیں۔ اہل کتاب یعنی یہودیوں کو ہی معلوم تھا وہ بھی اس لیے کہ ان کی کتابوں میں یہ واقعہ موجود تھا۔ عرب اور خود رسول اللہ ﷺ بھی چونکہ اس سے آگاہ نہ تھے، یہی سوچ کر اپنی طرف سے وہ بڑا عاجز کر دینے والا سوال لے کر آئے تھے۔ اب یہودیوں کے خیال میں دو صورتیں تھیں۔ اول تو یہ کہ جناب رسالت مآب بتا نہیں سکیں گے۔ دوم بتانا بھی چاہا تو ہم سے دریافت کر کے بتائیں گے اور یوں ہر دو صورتوں میں نعوذ باللہ رسول اللہ ﷺ کو عاجز دکھانے کا یہودیوں کا منشا پورا ہو جاتا، مگر وہ بھول گئے تھے کہ جناب رسالتمآب کو بھیجنے والا بھی کوئی موجود ہے اور جس کو وہ سر بلند کرنا چاہے، ساری کائنات مل کے بھی اسے نیچا نہیں دکھا سکتی۔ بہر حال یہودی یہاں بھی مار کھا گئے۔ وہ سوچتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان سے پوچھیں گے۔ رب العالمین نے فرما دیا، نہیں۔ «نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ» تمھیں کسی اور سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سارا واقعہ ہم آپ کو بتائیں گے۔

قصص کا معنی ہے کسی چیز کی پیروی کرنا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ﴾ [القصص : ١١]

''اور ام موسیٰ نے موسیٰ کی بہن سے کہا: ''اس کا پیچھا کرتی رہو۔''

کہانی اور واقعہ کو اس لیے قصہ کہتے ہیں کہ اس میں واقعات کی تفصیلات یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے پیچھے چلتی جاتی ہیں۔

پھر اس قصے کو خود رب العالمین نے احسن القصص قرار دیا ہے۔ مفسرین نے اس قصہ کے 'احسن القصص' ہونے کے امتیازات ذکر کیے ہیں، مثلاً ایک تو یہی کہ اس میں کسی بھی عمدہ اور پرکشش واقعہ کے تمام طبعی لوازمات موجود ہیں۔ دیگر واقعاتِ قرآن کے برعکس یہاں ایک ترتیب اور سلیقہ ہے۔ ابتدا ہے، عروج ہے اور پھر اختتام ہے اور نہایت عمدہ انجام، یوں محسوس ہوتا ہے گویا موتیوں کا ایک منظم ہار ہے، جس میں واقعات پوری حسنِ ترتیب سے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ پھر معنوی طور پر نہایت فکر انگیز اور جامع قصہ ہے۔ اس میں حاسد و محسود کی نفسیات ہیں۔ آقا و غلام کی کیفیات ہیں۔ محبوب و مطلوب کے تذکرے ہیں۔

قید و بند اور پھر تاج وتخت کے شب و روز ہیں۔ قحط سالی اور خوشحالی کے منظر ہیں۔ فراق و وصال اور صحت و بیماری کا ذکر ہے۔ سفر وحضر، عزت و ذلت اور تنگی و آسانی کے معاملات ہیں۔ پھر سارا کچھ دل نشیں ربانی اسلوب اور کوثر وتسنیم سے دھلے پاکیزہ رحمانی لہجے میں ہے۔ عمدہ، پر تاثیر اور دل نشیں، سبق آموز اور عبرت انگیز

احسن القصص ہونے کی ایک وجہ عدم تکرار بھی ہے۔ یعنی اس قصے کو بہ کمال وتمام اسی جگہ بیان کر دیا گیا، کہیں دوسری جگہ دہرایا نہیں گیا۔ قرآن مجید میں صرف ایک اور ایسی جگہ ہے جہاں یوسف علیہ السلام کا حوالہ ملتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ ﴾ [غافر : ٣٤]

''بالتحقیق، قبل ازیں تمھارے پاس یوسف علیہ السلام واضح دلائل لا چکے ہیں۔''

غرض کسی دوسری جگہ قصہ نہیں دہرایا گیا۔ پھر اس قصۂ مبارک میں بڑے اسباق اور حکمتیں ہیں۔ جو جتنا غور وخوض کرتا ہے اور جتنی اس بحرِ زخار کی شناوری کرتا ہے اتنے ہی فوائد کے موتی چنتا جاتا ہے۔ ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے چند ایک فوائد و اسباق حسبِ ذیل سامنے آتے ہیں:

- اللہ رب العزت کے فیصلے اور قضا و قدر کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب اللہ تعالیٰ کسی سے خیر و بھلائی اور فوز و فلاح کا ارادہ فرما لے تو سارے اہلِ کائنات مل کے بھی اس شخص سے کچھ چھین نہیں سکتے۔
- حسد صرف اور صرف ذلت ونقصان ہی میں اضافہ کرتا ہے۔
- صبر اور استقامت ہی وہ جوہر ہے جو کٹھن حالات کی سنگلاخ زمین میں بھی آسائش وکشائش کے گلاب کھلا سکتا ہے۔
- دانش اور ہوش مندی سے کی گئی تدبیر پیچیدہ ترین معاملات کی بھی گرہ کھول دیتی ہے۔
- دل اور دنیا صرف کردار کی سچی عظمت ہی سے تسخیر کیے جا سکتے ہیں۔

«وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ» ''اور یقیناً آپ اس سے پہلے بے خبروں

میں سے تھے۔“

یہاں ایک بڑی اہم بات بتائی جا رہی ہے۔ ایک نعمتِ بے پایاں کا اظہار بھی ہے اور ایک مغالطے کا ازالہ بھی ہے۔ نعمت یہ کہ آپ اس واقعہ سے ہرگز آگاہ نہ تھے۔ معاندین نے آپ کو زیر کرنے کا منصوبہ بنایا تو اللہ رب العزت نے کمال لطف و مہربانی سے آپ کو سارا واقعہ پوری شرح و بسط سے سنا دیا۔ یہ شان صرف نبی ہی کی ہوتی ہے کہ وہ براہِ راست اللہ رب العزت سے سیکھتا ہے۔ باقی تمام اہلِ کائنات نبی سے سیکھتے ہیں، یعنی نبی کا استاد خود اللہ رب العزت ہوتا ہے۔ نبی کی تعلیمات اور دینی معلومات کا ذریعہ وحی ہوتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جس کا اظہار قرآن حکیم بجا طور پر متعدد مقامات پر کرتا ہے۔ سورۂ آل عمران میں سیدہ مریم علیہا السلام کا واقعہ مذکور ہے، واقعات کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد وہاں بھی اسی نعمت کا بایں الفاظ اظہار ہے، ارشاد گرامی ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴾ [آل عمران : ٤٤]

”یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں، آپ تو اس وقت وہاں نہ تھے جب وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا، اور نہ آپ اس وقت وہاں تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔“

سورۂ یوسف ہی میں ایک اور مقام پر یہی مضمون دہرایا گیا ہے، جس سے اس مسئلے کی قرآن کے نزدیک اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ارشادِ گرامی ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴾ [یوسف : ١٠٢]

”یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہ تھا جب انھوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کیا اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔“

دراصل یہ ایک بڑے مغالطے کا ازالہ بھی ہے، جو بعض لوگوں کو ہو گیا ہے کہ ”نبی غیب

جانتے ہیں' اور یہ کہ ''وہ ہر جگہ حاضر رہتے ہیں۔''

یہ دونوں ہی عقیدے قرآن مجید سے متصادم اور قطعی غلط ہیں۔ قرآن مجید نے اس کی بڑی شدت کے ساتھ نفی کی ہے۔ اگر نبی کو غیب داں متصور کر لیا جائے تو وحی کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے، نیز بعض مقامات پر یہ نبی کی توہین ثابت ہونے لگتی ہے، مثلاً جب ایک قبیلے نے چالیس حفاظِ صحابہ کو بغرض تبلیغ لے جا کر شہید کر دیا تو آپ چالیس یوم تک مسلسل ان کے خلاف بد دعا فرماتے رہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آپ جانتے تھے تو بھیجا ہی کیوں؟ سورۂ نور میں واقعہ افک کے ضمن میں کم وبیش پورا ماہ رسول اللہ ﷺ سیدہ عائشہ اور سارے صحابہ شدید رنج وغم میں مبتلا رہے، یہاں تک کہ قرآن کی آیات نے حقیقت حال آشکار فرمائی۔ سوال یہاں بھی وہی ہے کہ اگر آپ غیب سے آگاہ تھے تو اس پورے مہینے کے شدید حزن کا باعث کیا تھا۔ آزمائش تو ہوتی ہی تب ہے جب انسان نتیجے اور مستقبل سے آگاہ نہیں ہوتا۔ جب آپ مستقبل کا سارا حال جانتے ہوں تو پھر آزمائش تو ممکن ہی نہیں رہتی۔ تمام انسانوں میں انبیائے کرام علیہم السلام ہی وہ مقدس طائفہ ہے جو سب سے زیادہ آزمائش و ابتلا کی بھٹی میں سے گزرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اَشَدُّ الْبَلَاءِ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاُمْثَلُ))

[مستدرك حاكم : ١/٤٠، ٤١، ح : ١٢٠]

''سخت ترین آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے، پھر ان علماء کی جو عمل میں ان جیسے ہوتے ہیں اور پھر ان لوگوں کی جو ان علماء جیسے ہوتے ہیں۔''

یہاں سوال یہ ہے کہ اگر نبی کو سب معلوم ہوتا ہے تو پھر آزمائش کیسی؟ دراصل یہ ایک گمراہی ہے جو نہیں معلوم کیوں کر اہل اسلام میں پھیلائی جا رہی ہے، رسول اللہ ﷺ کی زبانِ اقدس واطہر سے تو قرآنِ مقدس نے واشگاف اعلان کروا دیا ہے:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ﴾ [الأنعام : ٥٠]

''کہہ دیجیے، میں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔''

مسئلہ کی مزید توضیح کے لیے، آپ ﷺ کی زبانِ اقدس سے یہ فرمان بھی جاری کروایا گیا:

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾

[الأعراف : ۱۸۸]

''فرما دیجیے کہ میں خود اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں، سوائے اس کے کہ جو اللہ چاہے، اگر غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت کچھ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی مگر میں تو اہل ایمان کو ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں۔''

بخاری میں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، آپ فرماتی ہیں:

''وہ شخص جھوٹا ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے تھے، اس لیے کہ خود رسول اللہ ﷺ فرما چکے کہ اللہ کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا۔''

یہ وہ عقیدہ اور اعتقاد ہے جو قرآن فہمی کا لازمی نتیجہ ہے۔ بعض لوگ مصر ہوتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیب کی خبروں سے آگاہ کر دیا تھا، سو آپ غیب دان ہوئے۔ اگر غیب دان ہونے کی یہی شرط ٹھہری ہے کہ غیب کی خبر سے آگاہی حاصل ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے پھر پوری امت ہی کو غیب داں کیوں تسلیم نہ کر لیا جائے کہ آپ نے یہ 'غیب کی خبریں' اپنے تک محدود ہرگز نہیں رکھیں، بلکہ پوری امت تک کماحقہ پہنچا دی ہیں۔ اس اصول کے تحت تو پوری امت ہی غیب داں ہو گئی؟

اصل بات یہ ہے کہ غیب بلاواسطہ جاننے سے ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا علم وحی کے ذریعے سے ہے سو ہمیں قرآن سمجھنا چاہیے اور وحی کی بے توقیری سے باز رہنا چاہیے۔

اگر ہم غور کریں تو یہاں سورج کو چاند پر مقدم بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کے مطالعے سے یہ دلچسپ بات سامنے آتی ہے کہ ہر جگہ سورج، چاند پر مقدم ہی ہے، چند ایک مثالیں دیکھ لیجیے:

﴿ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ [القیامة : ٩]

''اور سورج اور چاند اکٹھے کر دیے جائیں گے۔''

﴿ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا ﴾ [یونس : ١٥]

''وہی ہے جس نے سورج کو تیز روشنی اور چاند کو نور بنایا۔''

﴿ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ﴾ [الرحمن : ٥]

''سورج اور چاند ایک حساب سے چل رہے ہیں۔''

باقی ہر جگہ بھی ایسے ہی ہے، ایسا کیوں ہے؟ شاید اس لیے کہ سورج چاند کی نسبت کثیر الفوائد ہے اور پھر چاند سورج سے اس لیے بھی تاخیر ہی کا مستحق ہے کہ اس کی ساری رعنائی و روشنی کا انحصار نورِ مستعار پر ہے۔

اگر سورج کی چاند پر تقدیم میں یہی راز پنہاں ہے تو پھر سیکھنا چاہیے کہ قوم ہوں یا افراد وہ مقدم و محترم تب ہی رہتے ہیں جب خود ان کے اپنے اندر صلاحیت اور قوت عمل پائی جاتی ہے۔ دوسروں کے سہارے چلنے والے دوڑ جیت نہیں سکتے۔ صرف ذاتی صلاحیت و عمل ہی یہاں وہاں باعثِ عزت اور موجبِ فلاح و نجاح ہے۔ باپ دادا کا شرف ہو کہ حسب و نسب کا افتخار، یہ سب اس شخص کے کسی کام کا نہیں، جس کی اپنی میزان عمل میں حرکت و جستجو ناپید ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان اس معاملے میں نہایت واضح ہے، ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ))

[مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب فضل الاجتماع...... الخ : ٢٦٩٩]

''جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے چھوڑ دیا، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔''

❀❀❀

خواب اور آداب

اِذْ قَالَ يُوسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِىْ سٰجِدِيْنَ ۞ قَالَ يٰبُنَىَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۞

''جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا اے میرے باپ! بے شک میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے، میں نے انھیں دیکھا کہ مجھے سجدہ کرنے والے ہیں۔ اس نے کہا اے میرے چھوٹے بیٹے! اپنا خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کرنا، ورنہ وہ تیرے لیے تدبیر کریں گے، کوئی بری تدبیر۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

مختصر اور ضروری تمہید کے بعد اب قصے کی ابتدا ہو رہی ہے۔ یہاں پہلی دفعہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا نام آیا ہے۔ یوسف عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ بعض مفسرین اسے عربی کے لفظ ''الاسف'' سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ تاہم یہ بات قرین قیاس نہیں۔ اس میں وزن فعل ثابت کرنا بھی نا درست ہے، کیونکہ مضارع کا پہلا حرف کبھی پیش والا نہیں ہوتا۔ اس میں منع صرف کا عمل بھی اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے۔

ابتدا سیدنا یوسف علیہ السلام کے ایک خواب دیکھنے سے ہوئی۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ سورج چاند اور گیارہ ستارے ان کے حضور جھک کر انھیں سجدہ کر رہے ہیں۔ خواب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بلند اقبال اور عروج آئندہ پر ایک واضح اشارہ ہے۔ باپ کو سنایا گیا تو وہ اپنی پیغمبرانہ فراست سے بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ ان کے خاندان پر اللہ تعالیٰ کی نعمت نبوت سے سیدنا یوسف علیہ السلام بھی سرفراز ہونے والے ہیں۔ خواب تھا بھی نہایت واضح کہ سورج اور چاند سے باپ اور ماں جبکہ گیارہ ستاروں سے گیارہ بھائی مراد تھے۔ اب ان سب کا خواب میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے حضور تعظیم بجا لانا ان کے علو مرتبہ اور سعادت و خیر

کے اعزاز کا اظہار تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اور رسول کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی نبوت کے اشارے اچھے خوابوں سے شروع ہوئے۔ دراصل خواب انسانی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ رب العزت کا فرمان ہے:

﴿ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾ [يونس : ٦٤]

''اہل ایمان ہی کے لیے دنیا کی زندگی میں خوشخبری ہے اور آخرت میں بھی۔''

سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ نے آیت میں مذکور ''خوشخبری'' کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ تَرٰى لَهٗ)) [مستدرك حاكم : ٨٢٩٤]

''یہ وہ نیک خواب ہے جو مسلمان خود دیکھتا ہے یا کوئی دوسرا اس کے لیے دیکھتا ہے۔''

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب سے رغبت کا یہ عالم تھا کہ آپ ہر صبح نماز کے بعد دریافت فرماتے کہ کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے تو سنائے، مستدرک حاکم کے لفظ ہیں:

((كَانَ اِذَا نْصَرَفَ مِنْ صَلَاةِ الْغَدَاةِ يَقُوْلُ هَلْ لِأَحَدٍ مِنْكُمُ اللَّيْلَةَ رُؤْيَا، اَلَا اِنَّهٗ لَا يَبْقٰى بَعْدِيْ مِنَ النُّبُوةِ اِلَّا الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ))

[مستدرك حاكم : ١٢٩٥]

''جب آپ نماز صبح کے بعد رخ مبارک نمازیوں کی طرف کرتے تو دریافت فرماتے آج شب تم میں سے کسی نے خواب دیکھا ہے؟ نیز فرماتے: آگاہ رہو! میرے بعد نبوت میں سے نیک خواب ہی باقی ہیں۔''

یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں سے خواب ذکر نہ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اہلِ کتاب نے لکھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اس بات پر قائم نہ رہ سکے، تاہم یہ بلا دلیل ہے۔ قرآنِ مجید اس سلسلے میں خاموش ہے اور کریم ابن کریم کی معصومانہ فطرت سے بھی یہ بات یقیناً بعید ہے۔ جہاں تک منع فرمانے کا تعلق ہے تو یہ اس لیے تھا کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام

شیطان کی کارستانیوں اور انسانی فطرت کی کمزوریوں سے آگاہ تھے۔ سو انھوں نے خدشہ محسوس کیا کہ بھائی یوسف علیہ السلام کے اس عظیم الشان اعزاز کو برداشت نہ کر پائیں گے اور بر بنائے حسد انھیں نقصان پہنچانے کی جستجو کریں گے۔ سیاقِ کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی اس بات پر یوسف علیہ السلام نے معصومانہ حیرت ظاہر کی تھی کہ کیا بھائی بھی ایسا کر سکتے ہیں، تو آیت کا اگلا حصہ اسی سوال کا جواب ہے کہ یقیناً کر سکتے ہیں اس لیے کہ ''شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

آیتِ مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حاسد سے نعمت چھپا لینا نا صرف جائز بلکہ انجام کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ نیز ثابت ہوا کہ نقصان کا اندیشہ ہو تو کسی کا عیب بتایا جا سکتا ہے اور یہ غیبت میں شامل نہیں۔

خواب کے آداب:

صحیح بخاری میں ہے:

«اَلرُّؤْيَا ثَلَاثٌ حَدِيثُ النَّفْسِ، وَ تَخْوِيفُ الشَّيْطَانِ وَ بُشْرٰى مِنَ اللّٰهِ»

[بخاری : ٧٠١٧]

''خواب تین قسم کا ہوتا ہے، روز مرہ کے خیالات، شیطان کی طرف سے ڈراوا اور اللہ کی جانب سے مومن کے لیے خوشخبری۔''

حدیثِ نفس کی ظاہر ہے کوئی اہمیت نہیں، یہ انسان کی وہ تشنہ خواہشات اور آرزوئیں ہوتی ہیں، عالم بیداری میں جن کا وقوع محال ہوتا ہے، چنانچہ دل کے بہلانے کو پھر نفسِ انسان انھی محال امور کی خواب میں تکمیل و تعمیل کر کے شاد کام ہوتا ہے، رہ گئی دو قسمیں یعنی شیطانی ڈراوے اور پھر رحمانی بشارتیں۔ اگر اچھا خواب ہے تو یہ اللہ رب العزت کی طرف سے ایک بشارت اور خوشخبری ہے۔ ایسا خواب بھی ہر کسی کو نہیں بتانا چاہیے، بالخصوص حاسد سرشت لوگوں سے چھپانا نہایت مناسب ہے۔ صرف انھی لوگوں کو سنایا جائے جو نیک، صالح، ہمدرد، سچے خیر خواہ اور محبت کرنے والے لوگ ہوں۔ خود قرآن مجید کی یہ آیت «لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ»

اس پر دلیل ہے، نیز حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

« اِنَّ الرُّؤْيَا تَقَعُ عَلٰى مَا تُعَبَّرُ وَ مَثَلُ ذٰلِكَ رَجل رَفَعَ رَجله فَهُوَ يَنْتَظِرُ فَهُوَ مَتٰى يَضَعُهَا فَإِذَا رَأىٰ اَحَدُكُمْ رُؤْيَا فَلَا يُحَدِّثُ بِهَا اِلَّا نَاصِحًا اَوْ عَالِمًا » [مستدرك حاكم : ٤/ ٣٩١، ح : ٨١٧٧]

نیز ارشاد نبوی ہے:

« اَلرُّؤْيَا حَسَنَةٌ مِنَ اللّٰهِ فَإِذَا رَأَى اَحَدُكُمْ مَا يُحِبُّ فَلَا يُحَدِّثُ بِهِ اِلَّا مَنْ يُحِبُّ » [بخاری : ٦٦٣٧]

''نیک خواب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے، سو تم میں سے کوئی ایک جب کوئی پسندیدہ خواب دیکھے تو صرف اسے ہی بتائے جو تم سے محبت کرتا ہے یعنی جو تمھارا خیر خواہ ہے۔''

خواب جزوِ نبوت:

صحیح احادیث میں خواب کو نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے۔ بعض احادیث میں چالیسواں، بعض میں چھیالیسواں اور بعض میں انچاسواں، پچاسواں اور بعض روایات میں اسے نبوت کا سترواں جزو قرار دیا گیا ہے۔ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ ہر روایت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے۔ دراصل اجزاء کی تعداد کا مختلف ہونا خواب دیکھنے والے کی استعداد و کیفیات کے مختلف ہونے کی بنا پر ہے۔ جو شخص صدق و سچائی، امانت و دیانت اور کمالِ ایمان و ایقان کے ساتھ جتنا زیادہ متصف ہے۔ اتنا ہی اس کا خواب زیادہ سچا ہوگا۔ جیسا کہ ترمذی شریف میں مذکور ہے:

« اِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ تَكَدْ رُؤْيَا الْمُؤمِنِ تَكْذِبُ وَ اَصْدَقُهُمْ رُؤْيَا اَصْدَقُهُمْ حَدِيْثًا وَ رُؤْيَا الْمُسْلِمِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَ اَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ » [ترمذی، کتاب الرُّؤْيَا، باب ان رؤيا المومن......الخ : ٢٢٧٠]

''قربِ قیامت بہت کم ہوگا کہ مومن کا خواب جھوٹا ہو سب سے سچے خواب اس

شخص کے ہوتے ہیں جو گفتگو میں سب سے زیادہ سچا ہو۔ مسلمان کا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔"

رہی یہ بات کہ خواب نبوت کا جزو کیسے ہے؟ تو اس سلسلے میں قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض اوقات انسان خواب میں وہ چیزیں دیکھتا ہے جو اس کے بس میں نہیں، مثلاً وہ خود کو آسمان پر اڑتے ہوئے دیکھتا ہے یا غیب کی وہ چیزیں دیکھتا ہے جنھیں جاننا اس کے بس میں نہ تھا تو ایسی اشیاء کے علم کا حصول اس کے لیے بجز توفیق والہامِ الٰہی کے علاوہ ممکن نہ تھا، جو فی الاصل نبوت کا خاصہ ہے، چنانچہ یہی باعث ہے کہ خواب کو نبوت کا ایک جز قرار دیا گیا ہے۔"

یہ بھی یاد رہے کہ ہر قاعدے اور کلیے میں استثناء بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ کبھی جھوٹے اور فاسق و فاجر کو بھی سچا خواب دکھائی دے سکتا ہے اس سے اس فاسق و فاجر کو نیک و صالح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہاں حدیث میں عام طور پر جو وقوع پذیر ہوتا ہے اس کی بات کی گئی ہے۔ کبھی کبھار اس کے الٹ بھی ہو سکتا ہے اور اس سے حدیث کی سچائی متاثر نہیں ہوتی۔

ممانعت حرام نہیں:

یہاں یہ جو کہا گیا کہ برا خواب بیان نہ کیا جائے، اس حکم کو جب دیگر احادیث سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے یہ ممانعت قطعی نہیں محض ہمدردی وشفقت کی بنا پر دیا گیا حکم ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بعض ایسے خواب صحابہ رضی اللہ عنہم سے بیان فرمائے ہیں کہ جن کو بشارت یا خوشخبری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صحیح بخاری میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتایا:

((رَأَیْتُ فِی رُؤْیَایَ أَنِّی هَزَزْتُ سَیْفًا فَانْقَطَعَ صَدْرُهُ فَإِذَا هُوَ مَا أُصِیبَ مِنَ الْمُؤْمِنِینَ یَوْمَ أُحُدٍ ثُمَّ هَزَزْتُهُ أُخْرَی فَعَادَ أَحْسَنَ مَا کَانَ فَإِذَا هُوَ مَا جَاءَ بِهِ اللّٰهُ مِنَ الْفَتْحِ وَاجْتِمَاعِ الْمُؤْمِنِینَ وَرَأَیْتُ فِیهَا

بَقَرًا وَاللّٰهُ خَيْرٌ فَإِذَا هُمُ الْمُؤْمِنُونَ يَوْمَ أُحُدٍ》

[بخاری، کتاب المغازی، باب من قتل من المسلمین یوم أحد : ٤٠٨١]

''میں نے خواب دیکھا کہ میں نے تلوار کو ہلایا تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا۔ اس کی تعبیر اس نقصان کی صورت میں ظاہر ہوئی جو مسلمانوں کو احد کی جنگ میں اٹھانا پڑا۔'' ''میں نے دوبارہ اس تلوار کو ہلایا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ شاندار بن گئی۔ اس کی تعبیر اس طرح سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو (شکست کے بعد) فتح سے نوازا اور تتر بتر مسلمان نئے سرے سے (لڑائی کے لیے) ایک جگہ جمع ہو گئے...... میں نے خواب میں ایک گائے بھی دیکھی (جو ذبح ہو رہی تھی)، اللہ کے سارے کاموں ہی میں خیر و برکت ہوتی ہے۔ گائے سے مراد وہ مسلمان تھے جو احد کی جنگ میں شہید ہو گئے۔''

خوابِ بد کے اثرات سے نجات:

خوابِ بد کے سلسلے میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

《 الرُّؤْيَا مِنَ اللّٰهِ وَالْحُلُمُ مِنَ الشَّيْطَانِ فَإِذَا حَلَمَ أَحَدُكُمُ الْحُلُمَ يَكْرَهُهُ فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ وَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنْهُ فَلَنْ يَضُرَّهُ 》

[بخاری، کتاب التعبیر، باب الحلم من الشیطن...... الخ : ٧٠٠٥]

''اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی جانب سے ہے، جب تم میں سے کوئی برا اور ناپسندیدہ خواب دیکھے، تو وہ اپنی بائیں طرف تھوکے اور اس خواب سے اللہ کی پناہ مانگے تو یہ خواب اس کے لیے چنداں ضرر رساں ثابت نہیں ہوگا۔''

دوسری روایت میں ہے:

《فَمَنْ رَأَى شَيْئًا يَكْرَهُهُ فَلَا يَقُصُّهُ عَلَى أَحَدٍ وَلْيَقُمْ فَلْيُصَلِّ 》

[بخاری، کتاب التعبیر، باب القید فی المنام : ٧٠١٧]

”جب کوئی ناپسندیدہ خواب دیکھے تو (اولاً) کسی سے بیان نہ کرے (ثانیاً) اٹھے اور اٹھ کر نوافل ادا کرے۔“

بخاری ہی میں دوسری جگہ یہ بھی ارشاد ہے:

« وَ اِذَا رَأَی مَا یَکْرَہُ فَلْیَتَعَوَّذْ بِاللّٰہِ مِنْ شَرِّھَا وَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ وَلْیَتْفُلْ ثَلَاثًا وَ لَا یُحَدِّثْ بِھَا اَحَدًا فَاِنَّھَا لَنْ تَضُرَّہٗ »

[بخاری، کتاب التعبیر، باب اذا رای مایکرہ...... الخ : ۷۰۴٤]

”جب کوئی خواب میں ناپسندہ چیز دیکھے، تو اس خواب کے شر سے اور شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرے۔ مزید یہ کہ تین بار بائیں طرف تھوک دے اور کسی سے بھی اس کا تذکرہ نہ کرے، ایسی صورت میں اس کا کچھ نقصان نہ ہوگا۔“

ابن سیرین رحمہ اللہ ایک صالح اور بہت بڑے ماہر تعبیر گزرے ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچ جانے اور نہایت قرین قیاس تعبیر کرنے میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ ایک شخص نے نہایت ڈراؤنا خواب دیکھا وہ سخت پریشان تھا تو ابن سیرین نے انھیں بایں الفاظ نصیحت فرمائی:

« اِتَّقِ اللّٰہَ فِی الْیَقْظَۃِ وَلَا تُبَالِ بِمَا رَأَیْتَ فِی الْمَنَامِ »

[کتاب الزھد لاحمد ابن حنبل : ٤٣٢]

”حالت بیداری میں اللہ سے ڈرتے رہو اور پھر خواب میں جو کچھ بھی دیکھو اس کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔“

« اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ » : ”یقیناً شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔“ شیطان انسان کا وہ دشمن ہے جو اعلانیہ اس کی دشمنی پر ہر آن چوکس رہتا ہے۔ جب تک وہ بندوں سے کوئی غلطی اور کوئی گناہ کروا نہیں لیتا اسے چین نصیب نہیں ہوتا، اس نے خود نافرمانی کر کے اپنا ٹھکانا جہنم بنا لیا ہے اب دوسروں کا جنت جانا اس سے برداشت نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے اہل ایمان کو اس سے باخبر رہنے کا اعلان کیا ہے، ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا ؕ اِنَّمَا یَدْعُوْا حِزْبَہٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ

السَّعِيْرِ﴾ [فاطر : ٦]

''یقیناً شیطان تمھارا دشمن ہے، سوتم اسے دشمن جانو، یہ اپنی جماعت کو پکارتا ہے تاکہ انھیں اہلِ جہنم میں سے کر دے۔''

یہی اس کا مقصدِ حیات ہے اور اسی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے مہلت طلب کی ہے۔ یہ شیطان ہی ہے جس نے ہمارے باپ اور ماں سے دشمنی کی انتہا اور ان کے لباس تار تار کروائے، جیسا کہ قرآن مجید خبر دیتا ہے:

﴿ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ﴾ [البقرة : ٣٦]

''تو شیطان نے دونوں کو اس سے پھسلا دیا، پس انھیں اس سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔''

شیطان کا اولیں ہدف کیا ہے؟

شیطان کا اولیں ہدف انسانوں کے باہمی تعلقات میں دراڑیں ڈال کر انھیں جدا کر دینا ہے یہ بھائی کو بھائی سے جدا کرتا ہے۔ خونی رشتہ داروں کو ایک دوسرے کے خلاف اکساتا اور باہم دگر سازشیں کرواتا ہے۔ اگر اس نے برادرانِ یوسف کو اپنے بھائی کے قتل پر ابھارا تو یہ اس کا پرانا وار تھا۔ اس روئے ارض پر پہلا قتل بھی اس نے ایک بھائی کے ہاتھوں بھائی ہی کا کروایا تھا۔ یہ شیطان ہی تھا جس نے کائنات میں اس پہلے قتل کے لیے ایک بھائی کو تیار کیا۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ [المائدة : ٣٠]

''تو اس کے نفس نے اس کے لیے اس کے بھائی کا قتل پسندیدہ بنا دیا، سو اس نے اسے قتل کر دیا، پس خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔''

بہت گہرے اور مضبوط رشتوں کو سبوتاژ کر کے شیطان کو جتنی خوشی میسر آتی ہے دیگر بڑے بڑے گناہ کروا کے بھی اتنی خوشی نہیں ہوتی، جیسا کہ حدیث صراحت کرتی ہے:

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهٗ عَلَى الْمَاءِ ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ فَعَلْتُ كَذَا وَ كَذَا فَيَقُولُ مَا صَنَعْتَ شَيْئًا قَالَ ثُمَّ يَجِيءُ أَحَدُهُمْ فَيَقُولُ مَا تَرَكْتُهٗ حَتّٰى فَرَّقْتُ بَيْنَهٗ وَ بَيْنَ امْرَأَتِهِ قَالَ فَيُدْنِيهِ مِنْهُ وَ يَقُولُ نِعْمَ أَنْتَ قَالَ الْأَعْمَشُ أُرَاهُ قَالَ : فَيَلْتَزِمُهٗ » [مسلم : ۷۱۰۶]

"ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے، پھر اپنے لشکروں کو عالم میں فساد کرنے کو بھیجتا ہے۔ ازروئے مرتبہ اس کے قریب وہ شیطان ہوتا ہے جو بڑا فساد بپا کرے۔ کوئی شیطان کہتا ہے میں نے فلاں کام کیا، کوئی کہتا ہے فلاں کیا، شیطان کہتا ہے تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے فلاں کو نہ چھوڑا یہاں تک کہ اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال کے رکھ دی۔ شیطان اسے قریب کرتے ہوئے کہتا ہے ہاں تو نے بڑا کام کیا ہے۔ راوئ حدیث اعمش کہتے ہیں بلکہ وہ اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیتا ہے۔"

چنانچہ ہمیں شیطان کے وار اور طریقۂ کار سے آگاہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ اسی صورت اس سے بچنا ممکن ہو گا۔ اس مردود کی کارستانیاں ہمارے بھی مشاہدے میں بہت آئی ہیں۔ ناہنجار جماعت میں ایک بھائی کو دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے پر لگا دیتا ہے۔ وہ ہمہ وقت اپنے بھائی کے خلاف بولتا رہے گا، اس حقیقت سے بے خبر کہ یہ شخص خود نہیں بول رہا، بلکہ اس کے اندر شیطان سرایت کر چکا ہے، دراصل وہ بول رہا ہے۔ چنانچہ یہ بھائی، مسئول کے کان بھرے گا، اس کا ذہن خراب کرے گا کہ فلاں شخص بل غلط بناتا ہے۔ فلاں جہاد کے پیسے کھا گیا ہے۔ اب یہ دن رات نیت اصلاح سے پروپیگنڈہ کرنے میں لگا ہوا ہے۔ نہیں جانتا کہ کس قدر شیطان کے نرغے میں آ چکا ہے۔ اگر اس کا بیان کردہ شخص اس گناہ میں

ملوث نہیں تو پھر تو اس کا یہ عمل سراسر ظلم ہے۔ تاہم اگر وہ ایسی کسی غلطی کا مرتکب بھی ہے تو خود یہ کون سا محفوظ رہا ہے یہ تو اس سے بھی بڑا گناہ کر رہا ہے اس نے غیبت میں دن رات ایک کر رکھا ہے۔ یہ اصلاح کا طریق نہیں۔ اس سلسلے میں چند باتیں ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہیں۔

سب سے اہم بات یہ کہ سنی سنائی بات سے کلی احتراز ہونا چاہیے، تاہم اگر بات پکی ہو تو نہایت نیک نیتی سے اصلاح کرنی چاہیے۔ باہر شور کر کے بد نامیاں پیدا کرنے کی بجائے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بھائی سمجھانا اور نصیحت کرنا چاہیے کہ نصیحت میں مومنوں کے لیے بڑے فائدے ہیں۔ رب کا قرآن کہتا ہے:

﴿ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ [الذاريات : ٥٥]

''اور نصیحت کیجیے، کیونکہ نصیحت یقیناً ایمان والوں کو نفع دیتی ہے۔''

اسے سمجھاؤ کہ خیانت اور پھر مالِ جہاد میں خیانت کس قدر گھناؤنا اور قبیح فعل ہے۔ اسے اخلاص، ہمدردی اور اچھے اسلوب سے جب نصیحت کرو گے تو یقیناً نصیحت برگ و بار لائے گی۔ اسے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سناؤ کہ خیانت کس طرح انسان کو جنت سے دور کر دیتی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا ایک غلام تھا، جسے "مِدعَم" کہا جاتا تھا۔ بنو ضباب کے ایک شخص نے آپ ﷺ کی خدمت میں یہ غلام بطور تحفہ پیش کیا تھا۔ ایک دفعہ جب وہ اللہ کے رسول ﷺ کا کجاوہ سواری سے اتار رہا تھا تو کسی نا معلوم سمت سے دشمن کا ایک تیر آیا اور اس غلام کو جا لگا۔ اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کہنے لگے:

((هَنِيْئًا لَهُ الشَّهَادَةُ)) ''اسے شہادت مبارک ہو۔''

اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((بَلْ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ اِنَّ الشَّمْلَةَ الَّتِيْ اَصَابَهَا يَوْمَ خَيْبَرَ مِنَ الْمَغَانِمِ لَمْ تُصِبْهَا الْمَقَاسِمُ لَتَشْتَعِلُ عَلَيْهِ نَارًا))

[بخاري، كتاب المغازي، باب غزوة خيبر : ٤٢٣٤]

''ہرگز نہیں ! اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! جو چادر اس نے خیبر میں تقسیم سے قبل ہی مال غنیمت میں سے چرا لی تھی، وہ اس پر آگ کا الاؤ بن کر بھڑک رہی ہے۔''

یہ سننا تھا کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک یا دو تسمے حاضر کر کے کہنے لگا: ''میں نے یہ اٹھا لیے تھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''اگر پیش نہ کیے جاتے تو یہ بھی آگ بن جاتے۔''

تو مقصد یہ ہے کہ انسان سے غلطی ہو جاتی ہے، معصوم صرف نبی ﷺ کی ذات ہے۔ صحابہ کرام سے بھی غلطیاں ہو جاتی تھیں، مگر ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ بہت جلد توبہ کر لیتے۔ اس لیے ہم سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَ خَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ »

''آدم کے سارے ہی بیٹے گنہگار ہیں ان گنہگاروں میں بہترین وہ ہیں جو بہت توبہ کرنے والے ہیں۔''

چنانچہ ایسی کمزوریوں کے حاملین کو سمجھایا جائے۔ گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر نصیحت کی جائے۔ پھر بھی باز نہ آئے تو مسئول کو بتا دیا جائے، یہ بتانا غیبت میں شمار نہیں ہوتا، پھر مسئول زیادہ اخلاص، زیادہ ہمدردی اور زیادہ احسن انداز سے یہ معاملہ سلجھائے گا۔ اس کے برعکس معاملہ کرنے میں کوئی خیر نہیں۔ ہم نے دیکھا ہے ہمارے بھائی چند ٹکوں کو بچانے کے زعم میں پورا بھائی گنوا بیٹھتے ہیں۔ وہ الزام تراشیاں اور وہ شور وغوغا کرتے ہیں کہ بے چارے کی اصلاح کی گنجائش اور جماعت میں رہنے کا معاملہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسی الزام تراشیوں پر اتر آنے والے بالآخر خود جماعت میں ٹک نہیں سکتے۔

تو یہ سب شیطان کی کارستانیاں ہیں دیکھیے، ایک شخص کو شک کی بنیاد پر، جو اللہ جانے مجرم ہے بھی کہ نہیں، یہ الزام تراش کر اس نے کتنے جرائم کا ارتکاب کیا۔ اس کے جرائم کی ٹوہ میں لگ کر جاسوسی کرتا رہا۔ حالانکہ ایسا کرنا جائز ہی نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَلَا تَجَسَّسُوْا ﴾ [الحجرات : ١٢]

''اور جاسوسی نہ کیا کرو۔''

ایک تو جاسوسی کرنے کا جرم کیا پھر مناسب اسلوب اختیار کرنے کی بجائے غیبت اور الزام تراشی کے گناہ کیے اور اس طرح بجائے خود اس سے بھی بڑا مجرم بن گیا۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ اگر مجرم ہے بھی تو اسے احساس تو ہے مگر اس پر پارسائی اور اصلاح کا خبط سوار ہو چکا ہے۔ پھر بالآخر یہ غلط ردِعمل کے باعث ایک بھائی کی اصلاح کرنے کی بجائے اسے جماعت ہی سے توڑنے کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

تو ایسے راستے کے راہی کو اتنا تو جان لینا چاہیے کہ وہ جو یہ سارا عمل اصلاح کے نام پر کر رہا ہے یہ مقصودِ رحمان نہیں مطلوبِ شیطان ہے۔ یہ سب شیطانی چالیں ہیں جن کا ہمیں علم ہونا چاہیے، چنانچہ مذکورہ آیت میں شیطانی سرشت اور سازش کا بخوبی ادراک رکھنے والے پیغمبر سیدنا یوسف علیہ السلام کو بتلا رہے ہیں کہ چونکہ شیطان رشتے توڑنے میں خصوصی محنت بروئے کار لاتا ہے سو تم اس نعمت کو سردست چھپا لو، بھائیوں سے مت ذکر کرو۔ وگرنہ وہ:

''تیرے لیے سوءِ تدبیر کریں گے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

﴿ وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ ﴾: انبیاء ہمیشہ ہی نہایت عمدہ تعبیر کرنے والے ہوتے ہیں، چنانچہ بیٹے کے اس خواب سے سیدنا یعقوب علیہ السلام پر یوسف علیہ السلام کا درخشاں مستقبل روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔ وہ جان گئے کہ بیٹے کے اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے اشارے نہایت واضح ہیں سو بیٹے کو بتانے لگے کہ اللہ رب العزت تمھیں اپنے خاص اور مخلص بندوں میں شامل کرنے والا ہے۔ وہ تمھیں نبوت ونعمت سے سرفراز کرنے والا ہے۔

''اجتبیٰ'' کا معنی ہے پسند فرمانا، برگزیدہ اور صاحب عزت کرنا۔ یہ بڑا خاص لفظ ہے اور اس انعام سے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص خاص بندوں کو سرفراز فرمایا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مجتبیٰ ہیں، دیگر انبیاء کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫

وَمِنۡ ذُرِّیَّۃِ اِبۡرٰہِیۡمَ وَاِسۡرَآءِیۡلَ ۫ وَمِمَّنۡ ہَدَیۡنَا وَاجۡتَبَیۡنَا ﴾ [مریم : ۵۸]

”یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے نعمت فرمائی، انبیاء میں سے جو آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں یا وہ جو نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار ہوئے یا وہ جو ابراہیم اور اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی اور برگزیدہ فرمایا۔“

پھر راہِ جہاد کی کٹھنائیاں سہنے والے، قیامت خیز معرکوں میں ثابت قدم رہنے والے اور الفتِ الٰہی میں اپنی شہ رگ پہ تیر وتلوار کا وار سہنے والے مجاہدین کو بھی اللہ رب العزت برگزیدہ کرتا ہے۔ انھیں بھی عامۃ الناس سے بلندتر درجات عنایت فرماتا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت نے سورۃ الحج میں اہل جہاد کے حق میں یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ ارشادِ گرامی ہے:

﴿ وَجَاہِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ؕ ہُوَ اجۡتَبٰىکُمۡ ﴾ [الحج : ۷۸]

”(اب) راہِ اللہ میں یوں جہاد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے کہ اس نے تمھیں برگزیدہ کیا ہے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ اور کلیہ ہے وہ کائنات میں سے افراد اور جماعتوں کو اپنے دین کے لیے منتخب فرماتا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے توفیق سے نواز دیتا ہے۔ اسے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ افراد اور جماعتوں کو کردار کی پختگی اور عبادت ومحبت الٰہی میں محنت وریاضت کرنی چاہیے۔ رب کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کرنا چاہییں تاکہ اللہ انھیں اپنے دین کے لیے انتخاب فرمائے۔ اللہ اپنے لیے چن لے اور دین کا کام لے لے۔ یاد رکھیے! کسان اسی زمین میں بیج بوتا ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔ جہاں بیج کے ضائع ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا۔ سو ہمیں بھی عبادت وریاضت سے اپنا ظرف کشادہ کرنا چاہیے پھر دعا کو شعار کرنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی وہ کام لے جو وہ نیک بندوں سے لیتا ہے۔ اہل جہاد سے لیتا ہے۔ جس طرح دنیاوی مناصب کے حصول کے لیے دوڑ دھوپ کی جاتی ہے اس سے کہیں بڑھ کر رب کے حضور پیش ہونے میں جانفشانی دکھانی چاہیے۔ اس لیے کہ دنیاوی مناصب تو اللہ ہر کسی کو دیے دیتا ہے، مگر اپنے امور میں ان لوگوں کو لگاتا ہے جن کے لیے اللہ بھلائی اور خیر چاہتا

ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ»

[بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة، باب قول النبیؐ...... الخ : ۷۳۱۲]

''اللہ جس شخص سے ارادۂ خیر فرماتا ہے اسے فہم دین عطا کر دیتا ہے۔''

«وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ»: سیدنا یعقوب علیہ السلام بدستور سیدنا یوسف علیہ السلام پر ہونے والی رب کی نوازشات کا ذکر فرما رہے ہیں۔ ان باتوں کا سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یا تو فراست وبصیرت سے اندازہ لگا لیا تھا یا پھر وحی کے ذریعے سے انھیں ان امور پر مطلع کر دیا گیا تھا۔ بہر حال وہ بتا رہے ہیں کہ ایک اور انعام تم پر اللہ تعالیٰ یہ فرمائے گا کہ تمھیں معاملات کی تہ میں جھانکنے کی صلاحیت عطا کرے گا اور خوابوں کی تعبیر کا فن ودیعت کر دے گا۔ بات کی تہ تک پہنچ جانے کا ملکہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص عطا ہے۔ ہر بندہ اس کا اہل نہیں ہوتا، اکثر لوگ ظاہر بین ہی ہوتے ہیں اور بہت کم لوگ اس فراست سے آراستہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھ لیجیے۔ جب قرآن مجید کی آخری آیت:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾ [المائدۃ : ۳]

اتری تو تب دیگر صحابہ اظہارِ مسرت فرما رہے تھے مگر صدیق اکبر اس موقع پر آنسو بہاتے پائے گئے۔ پوچھا گیا دین کی تکمیل کے پر مسرت موقع پر آنسو بہانے کے کیا معانی ہیں؟ انھوں نے فرمایا ان آیات سے جو میں نے سمجھا ہے وہ آپ لوگ نہیں سمجھے۔ جب دین کی تکمیل ہو جائے تو پھر انبیاء کی ضرورت بھی ختم ہو جاتی ہے، سو میں آئندہ ایام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جدائی دیکھ رہا ہوں اور اس تصورِ فراق میں آنسو بہا رہا ہوں۔

تو یہ بصیرت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے سیدنا یوسف علیہ السلام بھی انھیں خواص میں سے ایک تھے۔

«كَمَآ اَتَمَّهَا......»: سے معلوم ہوتا ہے، آپ کے اجداد اسحاق اور ابراہیم علیہما السلام بھی اس وصف سے کما حقہ متصف تھے۔

«يُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ»: ''وہ آپ کو کامل نعمت سے نوازے گا۔''لغتاً نعمت ہر اس حالت کو کہتے ہیں جس سے انسان خوشی اور مسرت کشید کرتا ہے۔

قرآن مجید میں روحانی و مادی اور دینی و دنیوی ہر دو حالتوں کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ﴾ [لقمان : ۲۰]

''اللہ نے تمھیں ظاہری و باطنی ہر دو نعمتیں بھرپور عطا فرمائیں۔''

قرآن مجید میں جہاں کسی روحانی یا دینی نعمت کا ذکر ہے وہاں بالخصوص اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ ذکر کیا ہے، مثلاً:

﴿ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ﴾ [النحل : ۱۸]

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو شمار نہ کر سکو۔''

اور جیسے فرمایا:

﴿ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴾ [الضحیٰ : ۱۱]

''اور اپنے پروردگار کی نعمت کو بیان کیجیے۔''

لفظ نعمت کے ضمن میں یہ بات بھی جاننے کی ہے کہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ وہ واحد خوش قسمت صحابی ہیں جن کو قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم ہر دو کی نعمتوں کا حامل قرار دیا ہے، آیت ہے:

﴿ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ ﴾ [الاحزاب : ۳۷]

''اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر انعام فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان پر انعام کیا۔''

یہی وہ واحد خوش نصیب صحابی ہیں، جن کا قرآن مجید میں نام مذکور ہے۔ بہر حال، سیدنا یعقوب علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نعمت کامل سے سرفراز فرمائے گا۔ اس نعمت سے مراد حکومت، سعادت، عزت و شرف سمیت اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں ہو سکتی ہیں مگر «كَمَآ اَتَمَّهَا» کے الفاظ سے تشبیہ چونکہ اسحاق و ابراہیم علیہما السلام سے دی گئی ہے اس لیے بالخصوص

نعمتِ نبوت مراد ہے۔ پھر نبوت اللہ تعالیٰ کا وہ انعام اور نعمت ہے کہ جس کے مقابل کائنات کی کوئی اور نعمت نہیں رکھی جا سکتی۔ یہ وہ نعمت ہے جو تمام نعمتوں سے بالا اور تمام اعزازات سے اعلیٰ ہے۔

«وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ»: ''اور اللہ رب العزت آل یعقوب پر بھی ان نعمتوں کو کامل فرمائے گا۔'' لفظ آل کے متعلق یہ جاننے کی بات ہے کہ یہ لفظ ہمیشہ کسی صاحب شرف اور صاحب حیثیت فرد کے متعلقین اور نسبت رکھنے والے افراد کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ کبھی بھی کم حیثیت اور بے مایہ افراد کی طرف مضاف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ درج ذیل ارشاداتِ ربانی سے یہ چیز واضح ہوتی ہے :

﴿ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ [البقرة : ٢٤٨]

''بے شک اس کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ تمھارے پاس وہ صندوق آ جائے گا جس میں تمھارے رب کی طرف سے ایک تسلی ہے اور موسیٰ کی آل اور ہارون کی آل نے جو کچھ چھوڑا تھا اس میں سے چند باقی ماندہ چیزیں ہیں، فرشتے اسے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔''

﴿ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ﴾ [الحجر : ٥٩]

''سوائے لوط علیہ السلام کی آل کے۔''

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴾ [الأعراف : ١٣٠]

''اور بلاشبہ ہم نے فرعون کی آل کو قحط سالیوں اور پیداوار کی کمی میں گرفتار کیا تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔''

قرآن مجید میں آل کا لفظ جن افراد کے ساتھ آیا ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

آلِ ابراہیم، آلِ یعقوب، آلِ لوط، آلِ موسیٰ، آلِ ہارون، آلِ داؤد اور آلِ فرعون۔

قرآن مجید میں سب سے زیادہ تذکرہ آلِ فرعون کا ہے کہ ان کی سرکشی کی طوالت کے باعث ذکرِ بد بھی طولانی ہی ہے۔

بہر حال آل یعقوب سے مراد یعقوب علیہ السلام کی اولاد و ذریت ہے۔ ان میں یوسف علیہ السلام بھی آتے ہیں اوران کے بھائی بھی، انھی کو بنی اسرائیل بھی کہتے ہیں۔

آل کے ضمن میں دو باتیں:

پہلی بات یہ کہ آل ضروری نہیں نسب ہی سے ثابت ہو، دیگر ماننے والے اور پیروکار بھی اس میں داخل ہوتے ہیں، جیسے کہ قرآن مجید نے فرعون کے متعلق بتایا:

﴿ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ ﴾ [البقرۃ : ۵۰]

''اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔''

دوسری یہ کہ شرعی اعتبار سے آل وہی لوگ کہلا سکتے ہیں جو ایمان اور عملِ صالح کے اعتبار سے پیروکار ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ایمان نہیں تو پھر تعلق خواہ نسب ہی کا کیوں نہ ہو، ایسے افراد کو شریعت آل سے خارج کر دیتی ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے سگے بیٹے کے متعلق فرمایا تھا کہ اس کا تجھ سے کوئی تعلق نہیں اور وجہ یہ بتلائی تھی کہ اس کے اعمال نادرست ہیں۔

قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں:

﴿ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ﴾ [ھود : ٤٦]

''یہ تیرے اہل سے نہیں ہے، کیونکہ اس کے عمل صالح نہیں۔''

تو ثابت ہوا اہل و آل انھی کے لیے ثابت ہوتی ہے جو کسی کے پیروکار ہوتے ہیں اور شریعت اہلِ ایمان کے لیے اس دائرے کو مزید محدود کر کے صرف انھیں لوگوں کو آل قرار دیتی ہے جو ایمان و عمل میں نبی کے پیروکار ہوتے ہیں۔ یہاں یعقوب علیہ السلام نے خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نا صرف تمھیں بلکہ میرے دیگر بیٹوں کو بھی سرفراز فرمائے گا۔

«كَمَاۤ اَتَمَّهَا عَلٰۤى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ»: ''جیسا کہ قبل ازیں تمھارے

آباء ابراہیم و اسحاق پر نعمت کامل فرمائی۔''

یہاں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی طرف سے تحدیثِ نعمت ہے اور اس بات کا اعتراف کہ جیسے اس خاندان پر رحمت و نبوت کا سلسلہ چلا آ رہا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ تمھاری نسلِ آئندہ کو بھی سرفراز فرمائے گا۔ یہاں ابراہیم اور اسحاق علیہما السلام کو باپ کہا گیا ہے۔ دراصل باپ کے والد بھی باپ ہی ہوتے ہیں۔ یہاں گویا اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو نارِ نمرود سے اور اسحاق علیہ السلام کو ذبح ہونے سے محفوظ رکھا۔ ویسے ہی اللہ تعالیٰ اتمام نعمت کے ساتھ ساتھ تمھیں بھی معاندین کی سازش اور حاسدین کے حسد سے محفوظ فرمائے گا۔ اس طرزِ کلام سے سیدنا یعقوب علیہ السلام کا حسنِ ادب، تعظیم اکابر اور انکسارِ ذات بھی خوب عیاں ہوتا ہے، یہ کمالِ تواضع اور خیالِ ادب ہی ہے کہ اپنے آبائے کرام کے ساتھ اپنا نام نہیں لیا۔ حالانکہ ہر دو نعمتوں سے خود یعقوب علیہ السلام بھی فیض یاب تھے۔ اس سے ہمیں بھی حسنِ ادب اور تعظیمِ اکابر کا درس لینا چاہیے۔

﴿لَقَدْ كَانَ فِىْ يُوْسُفَ وَ اِخْوَتِهٖۤ اٰيٰتٌ لِّلسَّآىِٕلِيْنَ﴾

''یقیناً یوسف علیہ السلام اور برادران یوسف میں سوال کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

قرآنِ مجید نے انسان کی ہدایت و اصلاح کے لیے مختلف انداز اور متنوع اسالیب اختیار کیے ہیں۔ کہیں زجر و توبیخ ہے تو کہیں ترغیب و تحریص ہے، پھر کہیں وعظ، کہیں واقعہ اور کہیں قصہ بیان ہوا ہے۔ سورۂ یوسف اور اس کے علاوہ بھی کئی واقعات بیان کیے گئے، مگر اس سے مقصود محض قصہ خوانی یا تفریحِ طبع نہیں، بلکہ انسان کی رہنمائی اور اصلاح مطلوب ہے، چنانچہ آغازِ قصہ ہی میں اسی بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ گو یہ قصہ ہے بلکہ خوبصورت ترین قصہ ہے مگر اس سے تفریحِ طبع نہیں، حصول عبرت و نصیحت مطلوب ہے۔ ویسے تو سبھی انسانوں کے لیے تاہم بالخصوص ان سوال کرنے والوں کے لیے جو اپنے زعم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کڑی آزمائش لانے کا ارادہ کیے ہوئے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوال کا نہایت مناسب اور بہت واضح جواب دے کر اپنی رسالت ثابت کر دی۔ یہ بہت بڑی نشانی تھی۔ ایسی ہی

دیگر لا تعداد حکمتوں، نصیحتوں اور نشانیوں سے یہ قصہ بھرا ہوا ہے۔ اس میں حقائق و معارف کے دریا بہتے ہیں اور زبانی منہج و اسلوب کا چمن آراستہ ہے۔ افسوس آج کے واعظین نے قصہ یوسف کو محض ایک تفریح بنا کے رکھ دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس میں موجود حکمت و بصیرت اور نصیحت و عبرت کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جہاں آغاز قصہ مبارکہ میں اس طرف توجہ مبذول کروائی گئی یقیناً یوسف علیہ السلام اور برادران یوسف (کے قصہ) میں پوچھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں، وہیں سورۂ مبارکہ کے اختتام پر ایک دفعہ پھر ادھر ہی توجہ دلائی گئی ہے، ارشاد ہوا:

﴿ لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ؕ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾

[یوسف: ۱۱۱]

"بلاشبہ یقیناً ان کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے، یہ ہرگز ایسی بات نہیں جو گھڑ لی جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔"

ان دونوں آیات کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی یہی منشا نظر آتی ہے کہ سورۂ یوسف کا مطالعہ محض وقت گزاری کے لیے افسانہ سننے کی عادی طبیعتوں کے تقاضا کے لیے نہیں بلکہ نصیحت و عبرت کے حصول کے لیے بہت باریک بینی اور نہایت غور و احتیاط سے اس قصہ کو پڑھنے کی ضرورت ہے۔

❁❁❁

غلطی پر کون، یعقوب علیہ السلام یا آلِ یعقوب؟

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰۤى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنِ ۞

"جب انھوں نے کہا یقیناً یوسف اور اس کا بھائی ہمارے باپ کے ہاں ہم سے

زیادہ پیارے ہیں، حالانکہ ہم ایک قوی جماعت ہیں۔ بے شک ہمارا باپ یقیناً کھلی غلطی میں ہے۔''

اب سب برادرانِ یوسف مجلس مشاورت منعقد کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ ہونے والے بزعم خود ظلم و زیادتی کا تذکرہ کرتے ہوئے آئندہ کے لیے لائحۂ عمل طے کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انسان کی فطرت میں اللہ رب العزت نے جو معصومیت اور نیکی رکھ چھوڑی ہے۔ اسے پامال کرنا اتنا آسان نہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ جب تک انسان جھوٹے سچے دلائل سے کسی حد تک اپنا ضمیر مطمئن نہیں کر لیتا جرم و گناہ پر آمادہ ہونا اس کے لیے دشوار ہی رہتا ہے، چنانچہ اب یہی مرحلہ انھیں بھی درپیش ہے۔ وہ اپنے غصب شدہ حقوق کا تذکرہ کر کے گویا عملِ آئندہ کو جواز فراہم کر رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ لوگ ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی بجائے خود اپنے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنا چاہتے تھے، چنانچہ کہنے لگے کہ دیکھیے ہمارے والد صاحب ناانصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ باوجود اس کے کہ ہم قوی الاعضاء، مضبوط جسم والے اور تنومند و توانا ہیں۔ تعداد میں ایک مضبوط جماعت اور جتھہ ہیں۔ کما کے لاتے ہیں اور ہر طرح کے فائدے پہنچانے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں۔ جب ہم ہر معاملہ میں آگے ہیں تو چاہیے کہ باپ کی محبت و شفقت اور سلوک و مہربانی کے بھی زیادہ حق دار ہوں مگر ادھر معاملہ سراسر الٹ اور مختلف ہے۔ یوسف اور اس کا بھائی، دونوں ہمارے باپ کو بہت زیادہ عزیز اور ہم سے کہیں زیادہ محبوب ہیں۔

یہاں سے ہمیں سیکھنا اور یاد رکھنا چاہیے کہ خرابی کہاں سے در آتی ہے اور شیطان کو اپنی گھناؤنی چال چلنے کے لیے انسانی ذہن کی کون سی سطح درکار ہے۔ یہاں خرابی دراصل معاملات کو صحیح تناظر میں نہ دیکھنے، حقائق سے تجاہل برتنے اور منفی طرزِ فکر کو اختیار کر کے خود ترحمی کا شکار ہونے سے جنم لیتی نظر آتی ہے۔ اسلام نے ہر حال میں اپنے مسلمان بھائی سے حسنِ ظن اختیار کرنے پر ابھارا ہے مگر شیطان نے انھیں اس طرز پر سوچنے ہی نہیں دیا، حالانکہ اگر وہ یہ روش اختیار کرتے تو ضرور معاملے کی حقیقی تہہ تک پہنچ جاتے کہ دیکھیے ایک تو یوسف

ابھی چھوٹا ہے۔ ظاہر ہے چھوٹے بچے فطری طور پر زیادہ محبت کے مستحق ہوتے ہیں۔ پھر ان کی والدہ بھی فوت ہو چکی ہیں۔ اس اعتبار سے بھی انھیں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے پھر ایک بات اور بھی تھی کہ یوسف علیہ السلام کے ناصیۂ اقبال پر اوجِ آئندہ اور کمالِ آمدہ کی جو روشنیاں پھوٹ رہی تھیں، وہ زمانہ شناس بصیرت اور نورِ نبوت کی نظر سے ہرگز پوشیدہ نہ تھیں، تو اگر سیدنا یعقوب علیہ السلام کا سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف التفات تھا بھی تو وہ دلائل و وجوہات رکھتا تھا اور اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ برادرانِ یوسف نظر انداز ہو رہے تھے یا ان کا حق چھینا جا رہا تھا۔ ایسا نہ تھا، لیکن جب شیطان نے ان کے ذہنوں میں حسد کی تباہ کن آگ بھڑکا دی تو پھر انھیں یہی نظر آنے لگا۔ دیکھیے شیطان کہاں کہاں آ کے نقب لگاتا ہے۔ اب یہاں ایک پیغمبر کے گھر میں اس کا داؤ چل رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔

باپ غلطی پر ہے؟

آتشِ رشک و حسد میں تپتے برادرانِ یوسف کی مشاورت کا یہ حصہ نہایت خوفناک ہے۔ قتل جیسے ہولناک جرم کو جواز فراہم کرنے کے لیے اب وہ اس حد تک جا چکے ہیں کہ اپنے پیغمبر باپ کو موردِ الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ ویسے یہ وقت اولاد پر آتا ہی ہے۔ جب اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوتی ہے۔ جسم توانا اور فکر رعنا ہو جاتی ہے تو ایسے لمحوں میں اسے عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ 'بوڑھا' غلطی پر لگا ہی کرتا ہے مگر یہ چار دن کی چاندنی ہوتی ہے پھر جب اپنے کندھوں پہ بوجھ پڑتا ہے تو بہر حال عقل ٹھکانے آ ہی جاتی ہے، تو اب وہ شیطان کے شکنجے میں آئے یہی کہہ رہے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا، انسانی معصومیت اگر مسخ نہ ہو چکی ہو تو جرم و گناہ کے لیے جواز ضروری ہوتے ہیں۔ اب چونکہ خود ایک گناہ کرنے جا رہے ہیں، ایک بہت ہولناک غلطی پر آمادہ ہو چکے ہیں تو انھیں باپ غلطی پر محسوس ہو رہا ہے۔ ذرا لفظوں پر غور فرمایئے:

«إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ»: ''بے شک ہمارا باپ یقیناً کھلی غلطی پر ہے۔'' یہاں یہ بھی واضح رہے کہ لفظِ 'ضلال' سے گمراہی مراد نہیں، محض رائے کی غلطی اور امرِ دنیا مراد ہے

بصورت دیگر تو وہ کافر ہو جاتے۔

یہ انسانوں کی نفسیات ہے۔ آج بھی جو غلطی کرنا چاہتا ہے اسے دوسروں کی غلطیاں تو نظر آتی ہیں مگر اپنی آنکھوں کے شہتیر نظر نہیں آتے، اب دیکھیے باپ کو غلطی پر بتاتے ہیں حالانکہ وہ تو نبی ہیں اور نبی معصوم ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ نہیں، اصل مسئلہ یہ ہے کہ غلطی خود کرنی ہے اور اس کے لیے جواز کی تلاش ہے۔

قرآنِ مجید اصلاحِ احوال کے لیے آیا ہے اور ہمیں یہ قصہ اسی غرض سے سنایا جا رہا ہے۔ یہی بیماریاں ہمارے اندر بھی ہیں۔ کتنے لوگ آپ کو ایسے ملیں گے کہ وہ غلطی باقاعدہ پیدا کریں گے اور پھر دوسرے کے سر ڈال کر پروپیگنڈہ کرنا شروع کر دیں گے۔ پھر اس پر وہ شورِ قیامت بپا کریں گے، وہ حاشیہ چڑھائیں گے، وہ پروپیگنڈا کریں گے کہ اچھے بھلے فہم وفراست کے حامل بھی متاثر ہو جائیں گے۔ جماعت میں بھی ایسی نظیریں ملتی ہیں۔ کبھی سارے لوگ مسئول کے خلاف اکٹھے ہو جاتے ہیں، پھر تلاش شروع ہوتی ہے، کوئی جواز، کوئی چھوٹی موٹی غلطی بالآخر تلاش کر لی جاتی ہے اور پھر بات کا بتنگڑ بنتے دیر نہیں لگتی۔ ایسا کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ان کی اس چھوٹی سی حرکت اور ادنیٰ سے مفاد کی پاداش میں جماعت کی کس قدر بدنامی ہوتی ہے۔ اس بے گناہ شخص کی زندگی الگ برباد ہو کے رہ جاتی ہے۔ تو یہاں یہی کچھ برادرانِ یوسف کرتے دکھائی دیتے ہیں مگر حق یہی ہے کہ غلطی پر یعقوب علیہ السلام نہیں...... اولادِ یعقوب تھی۔

❀❀❀

بھائی کے قتل پر اپنے سکون کی بنیاد!!

اِقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ ۝

”یوسف کو قتل کر دو، یا اسے کسی زمین میں پھینک دو، تمھارے باپ کا چہرہ تمھارے

لیے اکیلا رہ جائے گا اور اس کے بعد تم نیک لوگ بن جانا۔"

حسد کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات کے کتنے ہی مضبوط اور خوش نما جزیرے اسی حسد کے طوفانی ریلے میں بہہ جاتے ہیں۔ اس زہرناک بیماری کو معمولی گردانے والے دیکھیں کہ ایک پاکباز اور معصوم انسان کا بے رحمانہ قتل اسی حسد کی بدولت بروئے کار آ رہا ہے۔ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ حسد اس سے بھی کہیں زیادہ شرمناک اور قبیح افعال سرزد کروا سکتا ہے۔ اب طے پا رہا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ ظلم کی مزید انتہا یہ ہے کہ ایک دو نہیں دس گیارہ افراد اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ سبھی اس نقطے پر متفق ہیں۔ افرادی نہیں اجتماعی بے حسی قوموں کو تباہی کی بے آب و گیاہ اور سنگلاخ وادیوں میں اتارا کرتی ہے اور نا قابل معافی ہوتی ہے۔ سچ ہے کہ فطرت افراد سے تو اغماض بھی کر لیتی ہے مگر یہ ملت کے گناہوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اب مقصد سیدنا یوسف علیہ السلام سے نجات ہے تو یہ کہتے ہیں کہ اسے قتل کر دو یا کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ بس جیسے بھی ہو اس سے نجات حاصل کرو تا کہ باپ کی محبت مل سکے۔ کیا منصوبہ ساز لوگ تھے اور محبت کے حصول کا کیا عمدہ طریقہ اختیار کرنے والے تھے۔ پہلے باپ کو خطا وار قرار دیا اور اب باپ کی مزعومہ غلطی کی سزا معصوم یوسف کو دینا چاہتے ہیں۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنے منصوبوں اور نظریات کو پرکھتے رہنا چاہیے؟ کیا عجب کہ جسے ہم صواب سمجھتے ہوں۔ حقیقت حال میں وہ نا درست ہو؟

اب یہاں وہ قتل کے ساتھ ہی نیت توبہ کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ ایک بار یہ غلطی کر لو، پھر توبہ کر کے پاک صاف ہو جاؤ۔" اس کے بعد اپنا معاملہ درست کر لو" کے دو مطلب مفسرین نے بیان فرمائے ہیں:

۱۔ اپنے اس گناہ سے توبہ کر لو اور نیک بن جاؤ۔

۲۔ یا یہ کہ اپنے باپ سے معاملہ درست کر لو یعنی اسے راضی کر لو۔

دیکھیے یہ ہے مومن کا معاملہ کہ وہ گناہ کرتا ہے تو اسے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ آخر

کار گناہ ہے، چنانچہ وہ ساتھ ہی توبہ کو بھی دھیان میں رکھتا ہے۔ مفسرِ قرآن مقاتل رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس قصے میں ایک عجیب نکتہ ہے:

﴿ اِنَّهُمْ عَزَمُوْا عَلَى التَّوبَةِ قَبْلَ الذَّنْبِ وَ كَذَالِكَ الْمُؤْمِنُ لَا يَنْسَى التَّوْبَةَ وَ اِنْ كَانَ مُرْتَكِبًا لِلْخَطَايَا ﴾

''انھوں نے ارتکابِ گناہ سے قبل ہی توبہ کا عزم کر لیا۔ مومن ایسا ہی ہوتا ہے، وہ توبہ کو کبھی فراموش نہیں کرتا اگرچہ مرتکبِ گناہ ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔''

نیز علماء نے اس آیت سے قاتل کی توبہ کی قبولیت کا بھی استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کی نیت توبہ پر گرفت نہیں فرمائی۔

برادرانِ یوسف عین گناہ کی منصوبہ بندی کے وقت اگر توبہ کی نیت کر رہے ہیں تو یہ بھی مومن ہونے کی علامت ہے۔ جس کے دل سے نیکی و بدی اور برائی اچھائی کا احساس ہی مٹ چکا ہو وہ توبہ کی کیا سوچے گا۔ یہ احساس بہت بڑی نعمت ہے، یہ مٹ جائے تو دل بے آباد ہو جاتا ہے۔ کثرتِ گناہ دل کے اس احساس کو کھا جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب انسان گناہ کرتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اگر توبہ نہ کرے تو دل پر ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جاتا ہے، جو گناہوں پر اصرار اور توبہ سے انکار پر مسلسل پھیلتا چلا جاتا ہے۔ تا آنکہ دل سیاہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گم ہو جاتا ہے اور یہ وہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب پھر دل سے احساسِ گناہ بھی مٹ جاتا ہے اور یہی انسان کی اصل ناکامی ہے......

وائے ناکامی، متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

یہ ٹھیک ہے کہ احساسِ گناہ بھی بڑی دولت ہے اور مومن برائی میں ملوث ہوتا ہے تو توبہ کی طرف لپکتا ہے تاہم حتی المقدور برائی سے اجتناب ہی لازم ہے۔ ہر آن اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور گناہ پر کبھی بھی جرأت اختیار نہ کرنا چاہیے۔ آیتِ مذکورہ میں ان کا یہ فعل مذمت کے پیرائے میں لا کر دراصل اللہ تعالیٰ امتِ محمد ﷺ کو تدبر و تفکر کی دعوت دے رہا ہے۔

انسان جب گناہ پر جرأت اختیار کرنے لگتا ہے اور توبہ کی نیت سے گناہ پر بہت جری ہو جاتا ہے تو پھر کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ مہلت عمل گناہوں سے تمام ہو جاتی ہے اور فرصتِ توبہ میسر ہی نہیں آتی۔ ایسے لوگ ضرور اللہ سے ڈریں کہ اگر اس نے توبہ کی توفیق ہی سلب کر لی تب؟ اور برف کی صورت ہر آن گھٹتی عمر نے اگر چند ساعتیں بھی مزید دینے سے انکار کر دیا تب؟ صاحب مومن کے لیے احتیاط ہی لازم ہے اور دانا شخص کے لیے گناہوں سے اجتناب ہی بہتر ہے۔

ایک بے توفیق بوڑھے کا وقتِ آخر:

یہاں ایک واقعہ یاد آ گیا اور یہ واقعہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ تب میں بہت کم عمر تھا اور قرآنِ مجید حفظ کر رہا تھا۔ مجھے ایک رشتہ دار کے گھر لے جایا گیا، وہاں ہمارا ایک رشتہ دار بوڑھا بستر پر دراز تھا۔ اس کا وقتِ آخر آ گیا تھا مگر جان نکلتی نہ تھی، وہ سخت اذیت میں تھا، عزیز و اقارب آ رہے تھے اور پاس بیٹھے لوگ بزرگ کو بتاتے جاتے تھے کہ اب فلاں رشتہ دار آیا ہے اور اب تیرا فلاں آیا ہے۔ وہ سب سے مل رہا تھا، سروں پر ہاتھ پھیر رہا تھا، کسی کسی کو کوئی وصیت بھی کر رہا تھا۔ کسی نے کہا: ''کلمہ پڑھو۔'' مگر افسوس اس نے یہ سن کر انکار میں ہاتھ ہلا دیا۔ اسی لیے حکم ہے کہ یہ نہ کہو: ''کلمہ پڑھ۔'' کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ انکار کر دے بلکہ خود با آوازِ بلند پڑھو تا کہ اسے بھی رغبت ہو۔

بہر حال میں نے اس چیز کا خود مشاہدہ کیا کہ وہ بوڑھا ہوش و حواس میں تھا، سروں پر ہاتھ پھیر رہا تھا مگر دمِ آخر کلمہ کا ورد نہیں کر سکا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے بتایا کہ نہیں پڑھ سکتا، تو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اللہ توفیق ہی چھین لے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱسْتَجِيبُواْ لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ ۖ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ ٱلْمَرْءِ وَقَلْبِهِۦ ﴾ [الأنفال : ٢٤]

''اے لوگو جو، ایمان لائے ہو! اللہ کی اور رسول کی دعوت قبول کرو، جب وہ

تمھیں اس چیز کے لیے دعوت دے جو تمھیں زندگی بخشتی ہے اور جان لو کہ بے شک اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔‘‘

یہ آیت خاص طور پر جہاد کے تناظر میں نازل ہوئی ہے اور توفیقِ الٰہی کی اہمیت کو دو چند کر دینے والی ہے۔ یعنی جب اللہ اور اس کا رسول تمھیں ترغیبِ جہاد دے تو فی الفور لبیک کہو اور ہرگز تاخیر مت کرو، کیونکہ دیر کی صورت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے اور تمھارے دل کے درمیان حائل ہو جائے اور پھر کچھ کر گزرنے کی ہمت و توفیق ہی چھن جائے۔ چنانچہ توبہ کی نیت سے گناہ پر دلیر نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ خبر نہیں کب اجل کا پیام آ جائے اور پھر یہ بھی معلوم رہے کہ یہ وقت ہمیشہ کسی پیشگی اطلاع کے بغیر آیا کرتا ہے۔ موت کو ہمیشہ پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے اور جب تک مہلتِ عمل میسر ہو گناہوں میں لتھڑے رہنے کی بجائے اعمالِ صالحہ میں منہمک رہنا چاہیے تاکہ وقت موت کچھ نہ کر سکنے کی ندامت سے بچا جا سکے۔

❀❀❀

قتل کی بجائے کنویں میں پھینکنے کا منصوبہ

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ لَا تَقْتُلُوْا يُوْسُفَ وَ اَلْقُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ يَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّيَّارَةِ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۝۱۰

’’ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اور اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو، کوئی راہ چلتا قافلہ اسے اٹھا لے گا، اگر تم کرنے ہی والے ہو۔‘‘

اب ان میں سے ایک، مفسرین نے جسے یہودا یا روبیل قرار دیا ہے، کہنے لگا کہ اگر تم نے ہر صورت یوسف سے چھٹکارا حاصل کرنے کا عزم کر لیا ہے تو میں تمھیں ایک تجویز دیتا ہوں یہ ان سب میں بڑا تھا اور صاحب الرائے، فہیم اور خدا ترس انسان تھا۔ یہاں بھی دیکھیے کہ اسم ضمیر کی بجائے یوسف کا نام لیتا ہے تاکہ بھائیوں کی شفقت و محبت کو ابھارے

اور جس قبیح جرم پر وہ تل گئے ہیں، ان پر اس کی قباحت و شناعت واضح کر دے۔

مگر یہاں یہ بھی دیکھیے کہ نیک اور صالح بھی جب صحبت بد کا شکار ہوتے اور ایسے غلط منصوبہ سازوں کے ساتھ ملتے ہیں تو وہ بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہ شریف الطبع اور سلیم الفطرت شخص بھی پروپیگنڈے کا شکار ہو گیا۔ تاہم فطری نیکی غالب رہی اور جب دیکھا کہ بھائی کسی صورت ٹلنے والے نہیں تو ایک قدرے معقول تجویز دینے لگا کہ بھئی قتل کا ظلم تو ہرگز نہ کرو، یوسف سے جان ہی چھڑانا چاہتے ہو تو اسے کسی گہرے کنویں میں پھینک دو۔ اس صورت میں یوسف سے تمھاری جان چھوٹ جائے گی اور چونکہ اس میں یوسف کے بچنے کی بھی امید ہے سو تم پر کھلے قتل کا الزام بھی نہ آئے گا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ کوئی مسافر قافلہ اسے اٹھا لے جائے۔ چھوٹا بچہ ہے واپس کہاں آ سکے گا، سو یوں تمھارا مقصود بھی حاصل ہو جائے گا اور یوسف کے بھی کچھ نہ کچھ بچنے کی امید ہو گی۔

«يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ»: 'التقاط' کا معنی ہوتا ہے ''ایسی جگہ سے کچھ پا لینا جہاں سے امید نہ ہو۔'' راستوں میں چلتے پھرتے راہ گیروں کو غیر متوقع طور پر دوسروں کی گری پڑی جو چیزیں مل جاتی ہیں، ان کے لیے بھی 'لقطہ'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ شریعت میں ایک باقاعدہ اصطلاح ہے اور اس کے مستقل احکام ہیں، مثلاً یہ کہ اسے استعمال میں لانا درست نہیں بلکہ وہ حکام کے سپرد کر دی جائے۔ اگر خود رکھنا ہے تو ایک سال تک اعلان کیا جاتا رہے۔ پھر اگر اس کا مالک مل جائے، تو اس کے حوالے کر دی جائے۔ اگر سال تک مالک نہیں آتا تو استعمال کر لے، ہاں اس کے بعد جب مالک آ پہنچے اور استعمال بھی ہو چکی ہو تو اس کی قیمت ادا کرنا لازم ہو گی۔ زیادہ بہتر یہی ہے کہ سال کے بعد بھی اگر مالک نہیں ملتا تو کسی مستحق کو دے دے۔ بہر حال یہی لفظ یہاں استعمال ہوا ہے کہ ﴿يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ﴾ اسے کوئی قافلہ اٹھا لے جائے گا۔

'سیارہ' قافلے کو کہتے ہیں مگر آج کی جدید عربی میں یہ لفظ 'کار' کے لیے بولا جاتا ہے۔ شاید اس لیے کہ قافلہ بھی کئی مسافروں کے اجتماع سے تشکیل پاتا ہے اور کار بھی چار پانچ

افراد کو لے کر سفر کرتی ہے۔

بہر حال یہ تجویز مناسب تھی چنانچہ سبھی اس پر متفق ہو گئے کہ چلو یوسف کو قتل نہیں کرتے، کسی ویران کنویں میں پھینک دیتے ہیں۔

❁❁❁

باپ کو اعتماد دلانے کی کوششیں

قَالُوْا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ وَ اِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

''انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! تجھے کیا ہے کہ تو یوسف کے بارے میں ہم پر اعتبار نہیں کرتا، حالانکہ بے شک ہم یقیناً اس کے خیر خواہ ہیں۔''

جب برادرانِ یوسف منصوبہ بنا چکے تو اب اگلا مرحلہ باپ سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کرنے کا تھا۔ سو دیکھیے اب باپ اور یوسف علیہ السلام سے کس محبت اور شفقت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ انداز تخاطب ملاحظہ کیجیے: ﴿ يٰۤاَبَانَا ﴾ ''اے ہمارے ابا جان!'' گویا اولاد کے لیے باپ کی فطری محبت کو آواز دی تاکہ باپ کو زیادہ سے زیادہ نرم کر کے مطلب برآری کی جائے۔ ان کے الفاظ ''کیا ہے کہ آپ یوسف کے معاملہ میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے۔'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یوسف کے متعلق ہمیشہ آپ اندیشوں میں گھرے رہتے تھے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی سعی لا حاصل کر چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ باپ کے جواب دینے سے قبل ہی یہ نہ کہتے کہ آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے۔

دیکھنا چاہیے کہ انسان غلط یا صحیح جب کسی موقف پر ڈٹ جائے تو کس جستجو اور حیلوں بہانوں سے مقصد پورا کرنے کی کاوش کرتا ہے۔ اب یہاں ایک طرف باپ اور یوسف سے بے انتہا محبت وشفقت برتی جا رہی ہے تو ساتھ ہی اپنے اس فعل کے فوائد و دلائل بیان کیے جا رہے ہیں کہ آپ کے یوسف کو اس طرح گھر بٹھائے رکھنے اور ہمارے ساتھ عدمِ اعتماد

کی بنا پر نہ بھیجنے میں یوسف کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ وہ کھیلنے کودنے سے محروم ہے، وہ باہر جنگل کی سیاحت سے محروم ہے اور باہر کی آب و ہوا اور جسمانی تربیت سے دور ہے۔ ہم اس کے دشمن تو نہیں، بھائی ہی تو ہیں اور پھر اس سے محبت کرنے والے، اس کے خیر خواہ، ایک دو نہیں، اکٹھے گیارہ ہیں ایک مضبوط جتھہ اور ایک طاقت ور جماعت! جو اپنے سامان اور بھائی کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔ سو آپ اسے ہمارے ساتھ روانہ فرما دیجیے۔ یہ باہر کی دنیا دیکھے، کھیلے کودے اور جب وہاں سے پھل کھائے گا تو اس کی طبیعت خوش ہو گی اور صلاحیتیں نکھریں گی۔ پھر اتنے سچے خیر خواہوں کی موجودگی میں اسے خطرہ ہی کیا ہے؟ جانتے تھے کہ باپ کو یوسف سے جو بے انتہا محبت ہے تو اس کا فائدہ سن کر وہ ضرور اجازت دے دیں گے۔

برادرانِ یوسف باپ کے سامنے سیر و سیاحت، کھیل کود اور کھانے پینے کے فوائد سنا کر اجازت کے طلب گار ہوتے ہیں۔ ہمارے مسؤلین بھائی بھی گاہ یہی حیلہ اختیار کرتے ہیں کہ جون جولائی کے مہینوں میں جب پنجاب جھلستی لو اور جسم جلاتی دھوپ کی صورت آتش کدہ بنا ہوتا ہے تو ہم ادھر شمالی علاقہ جات کے راحت بخش موسم میں بھائیوں کو تربیت کے لیے جاتے ہیں۔ مسؤلین میں سے بعض وہ بھی ہیں جو لوگوں کو تیار کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ وہاں سیاحت ہو گی، ناشپاتیاں! اخروٹ، بادام کی سرزمین پر بے مثال وقت گزرے گا۔ وہ ایسی منظر کشی کرتے ہیں گویا تربیت کے لیے نہیں بس سیاحت کے لیے لے جا رہے ہیں۔ درست ہے کہ سیاحت بھی ہو جاتی ہے بلکہ سیاحت تو ہے ہی جہاد میں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

《سَيَاحَةُ أُمَّتِي الْجِهَادُ》

''میری امت کی سیاحت جہاد میں ہے۔''

یہ بھی درست ہے کہ سبزوں سے ڈھکے، فلک چھوتے پہاڑ اور پھر ان پہاڑوں کے سینوں پر ایستادہ فلک بوس اشجار کے مناظر دلکشی رکھتے ہیں اخروٹ، بادام اور خوبانی کی

مہک سے رچی فضا کی سر زمین کی اپنی ہی کشش اور اپنا ہی سحر ہے، مگر یاد رکھیں ! بھائیوں کو یوں کہہ کر ہرگز نہ لائیں۔ جھوٹ مسلمان کا شیوہ نہیں۔ انھیں صاف بتائیں کہ تربیت کے لیے جانا ہے۔ بہر حال برادرانِ یوسف یہی کچھ بیان کر کے باپ سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگتے ہیں۔

❀❀❀

باپ کے تحفظات و خدشات

قَالَ اِنِّیْ لَیَحْزُنُنِیْۤ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾

”اس نے کہا بے شک میں، یقیناً مجھے یہ بات غمگین کرتی ہے کہ تم اسے لے جاؤ اور میں ڈرتا ہوں کہ اسے کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو۔“

برادرانِ یوسف منصوبہ سازی کر کے، باپ کی شفقت و محبت کی خوابیدہ حسیات کو بیدار کرتے ہوئے اپنی تمام صلاحیتوں کا بھر پور استعمال کر کے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت چاہتے ہیں، لیکن شاید والدین کے دلوں میں اللہ رب العزت نے اولاد کے لیے کوئی ایسا خانہ رکھا ہوتا ہے کہ جہاں قبل از وقت ہی خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ ادھر باپ تمام بیٹوں کے متفقہ اصرار کے سامنے بے بس تو ہے، مگر ادھر دل کی دھرتی پر جدائی کا زلزلہ بپا ہے۔ معصوم یوسف کو لاحق ہونے والے خطرات کے اندیشے سنپولیے بن کر پھنکارنے لگتے ہیں۔ اک عجیب کشمکش کی کیفیت ہے۔ شاید بہت ہی بھیگے لہجے میں انھوں نے ایک اور کوشش کی، فرمایا ایک تو تمھارا اس کو میرے پاس سے لے جانا ہی مجھ پر سخت گراں ہے۔ اس کی جدائی مجھے بے طرح ڈسنے لگتی ہے۔ پھر اگر دل پر پتھر رکھ بھی لوں تو ڈرتا ہوں کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے۔ بڑے بھائیوں کی سیدنا یوسف علیہ السلام سے محبت اور ہمدردی باپ سے پوشیدہ تو نہ تھی۔ یہ سارا تناظر تھا جس کے تحت آپ فرماتے ہیں کہ تم اپنی

مصروفیات یعنی بھیڑ بکریاں چرانے یا پھل وغیرہ کھانے میں کھو جاؤ گے یوں تمھارا دھیان یوسف سے ہٹ جائے گا، تم اسے فراموش کر دو گے لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بھیڑیا موقع پا کر بچے کو کھا جائے۔ سو اگر تم اپنا یہ اصرار چھوڑ ہی دو تو بہتر ہے۔

یہاں ہمیں ایک باپ کی اولاد سے محبت کا ایک منظر دکھائی دیتا ہے۔ کیا اولاد کو خبر ہوتی ہے کہ ان کے والدین کے دل ان کی محبت سے کیوں کر معمور ہوتے ہیں۔ والدین کے دل و دماغ میں کیوں کر ہمہ وقت اولاد کے لیے اندیشے کلبلاتے رہتے ہیں۔ دیکھیے یہاں ایک باپ کس طرح اولاد کے نقصان سے برافروختہ ہے اور سچی بات ہے کہ اچھے باپ کو اپنی اولاد کے بارے میں پریشانی ہونی ہی چاہیے۔ ایک طرف اس والد کی اپنے بیٹے سے خیر خواہی دیکھیے اور دوسری طرف مغربی والدین کو دیکھیے کہ فطرت سے لڑتے لڑتے آج وہ اس خالص ترین جذبے سے بھی ہاتھ دھوتے جا رہے ہیں۔ چوبیس جولائی دو ہزار آٹھ کے اخبار میں یہ خبر چھپی ہے کہ ایک باپ اپنے دو سالہ معصوم بیٹے کو شدتِ پیاس سے بلبلاتا، تنہا گاڑی میں چھوڑ کر فلم دیکھنے کے لیے بے دھڑک سینما کا گیٹ عبور کر گیا۔ زار روتے اور پیاس سے بلکتے بچے کو پولیس نے بچایا اور باپ کو گرفتار کر لیا۔ یہ ایک ہلکا سا موازنہ ہے، مغرب و مشرق کی اقدار کا۔ مگر افسوس آج کے والدین مغرب کی بے تحاشا تقلید میں سرگرداں ہیں اور بالخصوص تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مغربی تعلیمی ادارے ہی ان کی نظروں میں جچتے ہیں۔

ہمارے کچھ بھائی قرآن مجید سے اپنی مرضی کے نظریات کشید کرنے میں لگے رہتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ ان کے ایسے خام نظریات کے محل اگلے ہی لمحے قرآن و سنت کی کسی واضح اور ٹھوس دلیل سے ٹکرا کر زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔ مثلاً یہاں وہ کہتے ہیں کہ دیکھیے یعقوب علیہ السلام نبی تھے اور علم غیب رکھتے تھے۔ اسی لیے تو کہہ دیا کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے تو جہاں قرآن و سنت کی لاتعداد آیات و احادیث کا انکار لازم آئے گا، وہیں یہ سوال بھی اٹھے گا کہ اگر وہ جانتے تھے تو کیا انھوں نے جان بوجھ کر اپنا محبوب بیٹا مرنے کے لیے بھیج دیا؟ اور اگر پیغمبر کو غیب کا علم ہوتا ہے تو آپ نے واپسی پر

18638

جعلی روتے پیٹتے بیٹوں کو واضح طور پر یہ کیوں نہ باور کروا دیا کہ تم سخت جھوٹے ہو۔ یوسف کو بھیڑیے نے نہیں کھایا وہ تو فلاں کنویں میں بے یارو مددگار پڑا ہے۔

اللہ ہمیں سمجھ دے کہ ہم اپنے نظریات قرآنی تعلیمات کے مطابق اختیار کریں نا کہ اپنے خیالات کے مطابق قرآن کی غلط توجیہ میں لگے رہیں۔ قرآن مجید میں رب کریم کا واضح ارشاد ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ کی زبان سے کہلوایا گیا:

﴿ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ ﴾

”اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں تو ایک فرشتہ ہوں۔“[هود : ٣١]

ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ﴾ [الأنعام : ٥٩]

”اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے۔“

نیز ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [النمل : ٦٥]

”کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔“

❀❀❀

بھیڑیا؟ اور وہ بھی ہماری موجودگی میں؟؟

قَالُوْا لَىِٕنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿١٤﴾

”انھوں نے کہا واقعی اگر اسے بھیڑیا کھا جائے، حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت

ہیں تو بلاشبہ ہم اس وقت یقیناً خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔''

اس آیت میں بیٹوں کا جواب مرقوم ہے۔ باپ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور بیٹے اپنی سازش پہ عمل پیرا ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔ وہ مسلسل دلائل سے باپ کو قائل کرنے میں منہمک ہیں۔ گو ان کے دلائل مسلسل پیش ہو رہے ہیں، مگر باپ کا دل کوئی اور سگنل موصول کر رہا ہے، پھر ایک پیغمبرانہ بصیرت کا حامل باپ ہے اور بیٹوں کے ماضی کے رویے بھی اس کے پیشِ نگاہ ہیں سو وہ احتراز کرنا چاہتے ہیں بہر حال بیٹے کہتے ہیں کہ اگر یوسف کو بھیڑیا کھا جائے اور وہ بھی ہماری موجودگی میں، کڑیل جوانوں کی ایک مضبوط جماعت اور طاقتور جتھے کی موجودگی میں تو پھر ہمارا بھی کیا جینا ہے؟ گویا ایک بھیڑیا اتنا طاقت ور ہو گیا کہ ہم دس گیارہ افراد کے بھی قابو میں نہیں آئے گا۔ اگر آج ہم اپنے بھائی کو بھیڑیے سے نہ بچا سکے تو کل کلاں مال مویشی اور بھیڑ بکریوں کی حفاظت بھی نہ کر سکیں گے، تب تو سوائے خسارے کے کچھ ہمارے ہاتھ نہ آئے گا۔ ابا جان! آپ ان فکروں اور اندیشوں کو چھوڑیے اور ہم پر اعتماد کیجیے۔ بھائی کو ہمارے ساتھ روانہ کیجیے، ہم اس کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔

اس مرحلے میں باپ اور بیٹوں کی قرآن مجید نے اتنی ہی گفتگو نقل کی ہے تاہم معلوم ہوتا ہے اب کے باپ نے مزید مزاحمت ترک کر دی اور چند ضروری نصیحتیں کر کے دھڑکتے دل اور لرزتے ہاتھوں سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ساتھ لے جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔

❁❁❁

کنویں کی گہرائی میں وحی

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾

''پھر جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے اندھے کنویں میں ڈال دیں اور ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو ضرور ہی انھیں ان کے اس کام کی

خبر دے گا، اس حال میں کہ وہ سوچتے نہ ہوں گے۔"

واقعات کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ جب برادرانِ یوسف اپنے پرزور دلائل اور بظاہر پر خلوص محبت سے باپ کو قائل کر چکے تو بادل نخواستہ باپ نے اجازت دے دی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ بھائیوں نے ایک چالاکی یہ بھی کی تھی کہ خود یوسف کو باہر کے قدرتی مناظر اور وہاں کھیل کود کا جھانسا دے کر آمادہ کیا کہ وہ خود بھی باپ سے باہر جانے کی اجازت مانگے۔ چنانچہ وہ بے چارہ مستقبل کے خطرات سے بے خبر اور بھائیوں کے سینے میں چھپے کینے سے بے علم خوشی خوشی ان کے ساتھ چل دیا۔

جب بھائی جنگل میں لے آئے تو ظاہر ہے ہمدردی، خیر خواہی اور محبت کا مصنوعی نقاب ان کے چہروں سے اتر گیا۔ بے رخی اور بے رحمی ان کے چہروں اور رویوں سے آشکار ہونے لگی۔

بہر حال قرآن مقدس کی آیات بتاتی ہیں کہ اب وہ متفق ہو گئے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اندھے کنویں کی نذر کر دیا جائے اور پھر ان پتھر دل بھائیوں نے اس پر عمل بھی کر دکھایا۔

بھولے بھالے، معصوم صورت اور پاکیزہ سیرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ سب کوئی اور نہیں خود اس کے اپنے بھائی کر رہے تھے۔ کون جانتا ہے یوسف کے نازک دل پر اس وقت کیا قیامت بیت رہی ہوگی، اس کے سندر جذبات میں کیا ہلچل بپا ہوگی اور اس کے موتیوں سے قیمتی آنسو گلاب رنگ رخساروں پر کیوں کر روانی سے بہتے ہوں گے۔ چاند چہرے پر غم و الم کے سیاہ بادل کس طور چھائے ہوں گے۔ ذرا تصور کیجیے جب بھائیوں نے قمیص اتار لی، بدن ننگا کر دیا، اسے کنویں میں پھینک دیا اور پھر اسے تن تنہا چھوڑ کر واپس چل دیے۔ تب سیدنا یوسف علیہ السلام ان کے واپس پلٹتے اور قدم بہ قدم دور ہوتے قدموں کی چاپ سنتے ہوں گے تو ان کا کیا عالم ہوگا۔ کیا یہاں ایک لمحے کے لیے ہم سوچنا گوارا کر سکتے ہیں کہ خود ہم نے راہ جہاد اور راہِ دین متین میں کتنی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ہمارے کنج لب سے مصائب پر کیسے الفاظ پھوٹتے ہیں۔ شکوہ و شکایات یا توکل اور صبر و رضا؟ کس قدر برا ہے یہ حسد کہ دل سے احساس، آنکھ سے حیا اور دماغ سے عقل چھین لیتا ہے۔

دل کو پتھر کر دیتا ہے یوسف یہ سب دیکھ رہے تھے۔ لاچار و بے یار و مددگار سیدنا یوسف علیہ السلام کے گرد گھبراہٹ، شدت اور مصائب و آلام کا ایک دردانگیز سلسلہ تھا کون تھا یہاں جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے آنسو پونچھتا اور تسلی دے کر اس کی دل جوئی کرتا؟ وہ اللہ جو اپنے بندے کو ہر حال میں دیکھتا ہے۔ وہ ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ذات، ان لمحوں میں بھی انسان پر سایہ فگن رہتی ہے، جب سارے اسباب و ذرائع مفقود ہو جائیں اور جب سب اپنے پرائے دغا دے جائیں۔ چنانچہ اس عالم کسمپرسی میں اس تاریک کنویں کے قیدی کو آسمان کی بلندیوں سے وحی کی نورانی تسلی میسر آتی ہے۔ سب چھوڑ گئے تو کیا ہوا عرش والے نے تو نہیں چھوڑا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

«وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ»: ''ہم نے یوسف کی طرف وحی کی۔''

قربان جائیے رب کی عطا پر! بھائیوں نے تحت الثریٰ میں پھینکا ہے تو رب نے اسی تحت الثریٰ کو اوجِ ثریا سے بدل دیا ہے۔ بھائیوں نے یوسف کو کنویں کی قبر میں اتارا ہے تو رب نے اس قبر کو مصر کا تخت بنا دیا ہے۔ یہاں آپ قرآن کا یہ سبق سیکھ لیجیے کہ گاہے شر میں بھی خیر کے امکانات ہوتے ہیں۔ بہرحال اس عالم میں سیدنا یوسف علیہ السلام پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ سو جاننا چاہیے کہ آزمائش میں گھبرانے کی نہیں استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

«لَتُنَبِّئَنَّهُم بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ»: یہاں قرآن مقدس کے ایجاز اور اختصار کو ملاحظہ کیجیے کہ چند لفظوں میں کس عمدگی سے ایک پوری داستان کہہ دی ہے۔ یہ آیت گویا یوسف علیہ السلام کے لیے حرف تسلی ہے، اس میں مستقبل کا حال بھی ہے اور آج کے ظالموں کے کل کے عبرتناک انجام کی خبر بھی ہے۔ کس بلاغت سے رب قدیر نے بہت عرصہ بعد مصر میں بپا ہونے والا منظر سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے کر دیا کہ گھبراؤ نہیں تم پڑے تو کنویں میں ہو، مگر ذرا وحی کے آئینہ میں مستقبل کی ایک خوش رنگ تصویر تو دیکھ لو۔ وقت آئے گا کہ آج کے یہ گیارہ ظالم نم آنکھوں، جھکی نظروں اور ندامت سے عرق آلود پیشانیوں کے ساتھ تیرے رو برو کھڑے ہوں گے، اور تب آپ انھیں آج کی بات بتا رہے ہوں گے مگر اس

وقت امتدادِ زمانہ اور نیرنگی حالات کے باعث یہ کچھ بھی نہ جانتے ہوں گے۔ یہ سب ہوگا ضرور، مگر اک ذرا صبر کے بعد!

کیا آج اہلِ ایمان کے لیے لازم نہیں کہ وہ اپنے عصری حالات میں اس قصہ سے سبق لیں۔ درست کہ آج ہم کفار کے پیدا کردہ نام نہاد دہشت گردی کے کنویں میں محبوس ہیں اور مثلِ برادرانِ یوسف ہمارے اپنے حکمرانوں کا مضبوط جتھہ اور طاقتور جماعت خود اپنے ہی ہاتھوں ہمیں اس کنویں کی نذر کر چکی ہے۔ بظاہر آج اہلِ ایمان کے لیے سہارے معدوم اور معین و مددگار ناپید ہیں۔ حالات ایسے ہی ہیں، مگر ان حالات کا تقاضا کیا ہے؟ کیا امید کا دیا بجھا دیا جائے؟ کیا ناامیدی کا زہر رگِ جاں میں اتار لیا جائے؟ نہیں اور اللہ کی قسم ہرگز نہیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ مسلمانو! یہ دہشت گردی کا کنواں نہیں سیادتِ عالم کا تخت ہے۔ اے اہلِ ایمان! سن لیجیے کہ حالات کی یہ تاریکیاں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اس لیے کہ ہمارے دلوں میں کبھی نہ بجھنے والے آرزو کے چراغ روشن ہیں، ہمارے قدم کانٹوں پر ہیں، مگر ان میں جنبش یا لغزش ہرگز نہیں ہے! ہماری نگاہیں اسلام کے روشن مستقبل پر ہیں اور یہ درس ہم نے قرآنِ مقدس کی دیگر آیات کے علاوہ سورۂ یوسف سے کشید کیا ہے۔

کم سنی میں وحی؟

مفسرین کی ایک کثیر جماعت نے اس وحی کو باقاعدہ وحی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس اعتراض کو کہ ''بچے پر کیوں کر وحی کا نزول ہوا؟'' یہ کہہ کر مسترد کر دیا ہے کہ گو آپ نابالغ تھے مگر عقل و فراست میں کامل تھے۔ ہمیں کسی تاویل کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ اللہ رب العزت قادر ہے۔ وہ جو کرنا چاہتا ہے کر گزرتا ہے، کوئی اسے پوچھنے والا نہیں، پھر ایک بچے پر وحی کا یہ واحد واقعہ نہیں کہ جسے جھٹلا دیا جائے، اسی قرآنِ مجید میں سورۂ مریم میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب مریم علیہا السلام نے بغیر خاوند کے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا اور قوم نے طعن و تشنیع

کرتے ہوئے بچے کی بابت دریافت کیا تو اس نوزائیدہ بچے پر رب نے وحی کی اور خود اسی بچے سے کہلوایا:

﴿ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛؕ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴾ [مریم : ۳۰]

''بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔''

پھر فرعون اور موسیٰ کے مابین واقعات کو یاد کیجیے، وہاں ام موسیٰ پر وحی کا نزول ہوا:

﴿ وَاَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّ مُوْسٰۤى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ﴾ [القصص : ۷]

''اور ہم نے موسیٰ کی ماں کی طرف وحی کی کہ اسے دودھ پلا۔''

مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر کام پر قادر ہے، قرآن کہتا ہے یہ وحی تھی تو ہمیں اس سلسلے میں پریشان ہونے یا تاویل کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ اس چیز پر قادر ہے۔

❁❁❁

اندھیری شب میں ماتمی جلوس کا بہروپ

وَجَآءُوْۤ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

''اور وہ اپنے باپ کے پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے آئے۔ کہا اے ہمارے باپ! بے شک ہم دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکلتے چلے گئے اور ہم نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تو اسے کوئی بھیڑیا کھا گیا اور تو ہرگز ہمارا اعتبار کرنے والا نہیں، خواہ ہم سچے ہوں۔''

برادرانِ یوسف نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی قمیص اتروالی اور اسے کسی جانور کے خون سے رنگین بھی کرلیا تھا۔ پھر وہ بیٹھے شام اترنے کا انتظار کرتے رہے اور جونہی رات گہری ہوئی شب کی تاریکی میں روتے، پیٹتے اور واویلا کرتے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی تلاش میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی بلکہ وہ سارا دن دوڑ

دھوپ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے ہر کونا اور ہر گوشہ چھان مارا ہے مگر وہ نہیں ملا تو ناچار اب تھک ہار کر رات کو گھر لوٹے ہیں۔ دیکھیے! یہاں قرآن مجید نے جھوٹوں کی نفسیات اور ان کے رویے کی عکاسی کی ہے کہ دن کی روشنی کی بجائے وہ شب کی تاریکی میں آئیں گے اور پھر روتے اور پیٹتے ہوئے تاکہ لوگوں کو یقین ہو کہ یہ سچے ہیں۔ دراصل جھوٹوں کے پاس سوائے رونے کے کوئی چارہ ہوتا ہے اور نہ کوئی دلیل، چنانچہ وہ ایک کیفیت ماتم میں آئے اور یوں کہ غم والم میں ڈوبے ہونے کا بہروپ بھرے آہ و بکا کرتے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔

اب ذرا ملاحظہ کیجیے کہ کیا داستان طراز لوگ تھے اور کیا اعلیٰ پائے کی Cover Story تخلیق کر کے لائے تھے۔ کہنے لگے، ابا جان! ہم سے تو بڑی کوتاہی ہوگئی۔ دراصل ہم نے باہم دوڑ کا مقابلہ کیا کہ دیکھیں کون سب سے تیز رفتار ہے۔ اب آپ جانیں یوسف تو بچہ تھا اس نے کیا دوڑنا تھا، سو اسے ہم نے سامان کے پاس بٹھا دیا کہ تو نے کیا تھکنا ہے بس سامان کے پاس بیٹھا رہ۔ اب ہم نے جو دوڑ شروع کی تو آگے سے آگے نکلتے گئے۔ بھول گئے کہ یوسف پیچھے اکیلا رہ گیا ہے۔ جب دوڑ ختم ہوئی تو پلٹ کے دیکھا تو یوسف کو مفقود پایا۔ ابا جان! ہماری غفلت کے باعث اسے تو بھیڑیا کھا گیا۔ یہ دیکھیے ان کی خون سے لتھڑی ہوئی قمیص، یہ ہے وہ دلیل جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسے واقعی بھیڑیا کھا گیا ہے۔

ابا جان! ہم نے یہ سب آپ کے گوش گزار کر تو دیا ہے مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ ہماری بات کبھی نہ مانیں گے، اگرچہ ہم سچے ہی کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ یوسف سے آپ کی حد سے بڑھی ہوئی محبت آپ کو ہماری سچی بات بھی تسلیم نہ کرنے پر مجبور کر دے گی۔ آپ نہ مانیں گے لیکن بہر حال جو حقیقت تھی وہ ہم نے آپ کو کہہ سنائی ہے۔

یہ تھی وہ کہانی جو انھوں نے اپنے باپ کے لیے فوراً گھڑ لی تھی۔ اب کدھر ہیں ہمارے غیب ثابت کرنے والے دوست؟ شاید وہ یہاں بھی استدلال کرنا چاہیں کہ دیکھیے برادرانِ یوسف بھی غیب جانتے تھے۔ دیکھتے نہیں کہ انھوں نے پہلے ہی اپنے باپ سے کہہ دیا کہ

آپ تو نہ مانیں گے اور پھر ایسے ہوا بھی؟

اللہ ہمیں عقل سلیم اور فہم مستقیم سے نوازے۔ آمین!

سچائی ہی ذریعہ نجات ہے:

انسان نسیان سے مرکب ہے۔ یہ معصوم نہیں خطا کار ہے۔ گاہے بہت بڑی غلطی بھی کر بیٹھتا ہے، مگر اس کے بعد جھوٹ کا سہارا لینا مزید گھناؤنا جرم ہے۔ بہت سے ایسے لوگوں سے ہمارا بھی واسطہ پڑتا ہے، جو سراسر غلط کاری کے مرتکب ہو چکے ہوتے ہیں مگر پر لے درجے کے لسان اور داستان طراز لوگ ہوتے ہیں، اپنی سچائی کے متعلق بڑی یقین دہانیاں کروائیں گے مگر حقیقت چھپتی کب ہے؟ بہت جلد بات نکل آتی ہے پھر منہ چھپاتے پھرتے ہیں تو کیا فائدہ ایسے عارضی سہارے کا جو بعد ازاں مزید رسوائی پر منتج ہو؟ نہیں ایسے لوگوں کو فوراً اعتراف گناہ کر لینا چاہیے۔ اگر وہ جماعت سے وابستہ ہیں تو امیر کے پاس آ کر صاف بتا دیں کہ فلاں غلطی ہوگئی ہے۔ اس سے معاملہ سلجھ جاتا ہے اور دل صاف ہو جاتے ہیں، اگر غلطی کی سزا تجویز ہو تو اسے خوش دلی سے جھیل کر بارِ گناہ سے نجات حاصل کر لینا چاہیے۔

آپ سورۂ توبہ میں مذکور صحابیٔ رسول کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ دیکھ لیجیے۔ آپ اس خاتون کا قصہ پڑھ لیجیے جو زنا کی مرتکب ہوگئی تھی۔ دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر اس نے صاف اعترافِ گناہ کیا اور سزا جھیلنے پر اصرار کرنے لگی۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا کہ پیٹ میں پلنے والے بچے کا کیا قصور؟ اسے جنم دے لو تو آنا، بچے کی پیدائش کے بعد پھر حاضر ہوئی تو آنجناب نے فرمایا ابھی اسے دودھ پلاؤ کچھ اور کھانے پینے کے قابل ہو جائے تو تب آنا۔ بہت جلد وہ دوبارہ آپ کی خدمت میں موجود تھی، یوں کہ بچے نے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا پکڑ رکھا تھا۔ اب کے کہنے لگی اللہ کے رسول! اب مجھے واپس نہ کر دیجیے گا۔ ڈرتی ہوں کہ اسی حال میں مرگئی تو آخرت کی سزا نہ جھیل سکوں گی۔ ذرا اس محترم خاتون کا جذبہ ایمان ملاحظہ کیجیے، خوب جانتی ہے کہ کون سی سزا ملنے والی ہے یعنی سنگسار

ہونے جارہی ہے، لیکن ایمان اتنا مضبوط ہے کہ بار بار پلٹ کے آتی ہے، اب بچے کو ایک انصاری صحابی نے گود لے لیا اور خاتون کو ایک گڑھا کھود کے سینے تک اس میں گاڑ دیا گیا۔ جب سنگ باری شروع ہوئی ایک پتھر سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے اسے لگا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دامن پر اپنے اثرات چھوڑ گیا۔ سپہ سالاری کی دنیا کے ممتاز ترین نام، سیدنا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے منہ سے کچھ نا زیبا کلمات نکل گئے۔ الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشِ سماعت تک پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ناپسند فرمایا۔ یعنی ایک مجرمہ جب سچی توبہ کر لیتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے برا کہنا برداشت نہیں فرماتے۔

تو بھائیو! گناہ ہو جائے تو اصلاح کی بجائے گناہوں کا اک پورا سلسلہ مت شروع کر لیا کرو۔ پلٹ آیا کرو، توبہ اور سچائی کا راستہ اختیار کیا کرو کہ یہی ذریعۂ نجات ہے۔ جھوٹ سے کبھی مسائل حل نہیں ہوتے ہاں بحران ضرور جنم لیتے ہیں۔

یہاں برادرانِ یوسف کی گفتگو پر غور کیجیے، وہ جو کہتے ہیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، وہی بات کہ خود اپنے مونہوں سے کہہ رہے ہیں:

«وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ»: ''اور تو ہرگز ہمارا اعتبار کرنے والا نہیں، خواہ ہم سچے ہوں۔''

تو کیا ان کا جھوٹ انھیں بچا سکا؟ نہیں بلکہ رسوائی اور ذلت میں قدرے اور اضافہ کر گیا۔

❀❀❀

جعلی خون، جھوٹے دعوے اور صبرِ جمیل

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾

''اور وہ اس کی قمیص پر ایک جھوٹا خون لگا لائے۔ اس نے کہا بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک کام مزین بنا دیا ہے، سو (میرا کام) اچھا صبر ہے اور اللہ

ہی ہے جس سے اس پر مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ برادرانِ یوسف نے قمیص کو خون کسی جانور کا لگایا اور یعقوب علیہ السلام کے سامنے بطور دلیل پیش کر دیا کہ دیکھیے اسے تو بھیڑیا کھا گیا...... یہی چیز یہاں قرآن سے عیاں ہے 'جھوٹ موٹ کا خون' کہہ کر قرآن مجید نے اپنے آفاقی ایجاز سے سب قصہ کہہ سنایا ہے۔

حیرت ہے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بغیر کسی ثبوت اور دلیل کے ان کے اس قول کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ اولاً تو یہ کہ وہ برادرانِ یوسف کے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں حسد وحقد کے متعلق پہلے ہی خوب جانتے تھے۔

ثانیاً: سیدنا یوسف علیہ السلام کے خواب کے جواب میں خود کہہ چکے تھے:

«وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ ....»

''اور اسی طرح تیرا رب تجھے چنے گا......''

ثالثاً: قمیص انھوں نے دیکھی تو حیرت زدہ رہ گئے۔ برادرانِ یوسف نے بظاہر بڑی بے داغ سازش تیار کی تھی۔ گیارہ عقلوں نے جمع ہوکر منصوبہ سازی کی تھی۔ کہانی بھی خوب بنائی تھی مگر ہوتا یہ ہے کہ ذہین سے ذہین مجرم بھی کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کر جاتا ہے جو بالآخر اس کی گردن میں پھندا کسنے کا باعث بن جاتی ہے۔ اب یہی دیکھیے کہ جب یعقوب علیہ السلام نے قمیص ملاحظہ کی تو نہایت تعجب سے دیکھا کہ قمیص خون آلود تو ضرور ہے مگر کہیں سے بھی پھٹی ہرگز نہیں، فرمانے لگے ''بڑا رحیم وشفیق بھیڑیا تھا کہ یوسف کو تو سالم نگل گیا مگر قمیص پر دانت گاڑنے بھی بھول گیا؟''

دراصل یہی وہ سراغ تھے جن کی بدولت یعقوب علیہ السلام نے یہ جعلی کہانی ماننے سے انکار کر دیا اور فرمایا تھا:

«بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا»: ''نہیں بلکہ یہ کہانی خود تمھارے اپنے نفس نے گھڑ لی ہے۔''

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ کو پختہ یقین تھا کہ یوسف علیہ السلام زندہ ہیں اور برادرانِ

یوسف جھوٹے ہیں تو آپ نے یوسف کو تلاش کرنے کی جستجو کیوں نہ کی۔ اس کا ایک جواب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام اس واقعہ کو منشائے ایزدی سمجھ کر چپ رہے۔ دوسری بات جو زیادہ قرینِ قیاس لگتی ہے، وہ یہ کہ وہ ضعیف العمر بزرگ تھے اور سازش کرنے والے گیارہ کڑیل جوان تھے، شاید خدشہ رہا ہو کہ اگر انھوں نے بیٹوں کو بے نقاب کرنے کی کاوش کی تو وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے کہیں یوسف علیہ السلام کو واقعتاً ہی قتل نہ کر دیں کہ حسد سے بھرے ہوئے لوگوں سے یہ بعید نہ تھا۔ بہر حال حالات یہی کی وہ مصلحتیں تھیں کہ آپ نے دکھی دل اور ویران آنکھوں سے کہا تو بس یہی کہ ﴿فَصَبْرٌ جَمِيلٌ﴾ ''اب میں صبر جمیل ہی اختیار کرتا ہوں۔''

قرآن مجید کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں:

① صبر جمیل۔ ② صبر غیر جمیل۔

حسن رحمہ اللہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: ''صبر جمیل کیا ہے؟'' فرمایا: ''جو شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ ہو۔'' جس نے واویلا کیا اس نے صبر نہیں کیا، قرآن مجید کی یہ آیت اس پر دلیل ہے:

﴿ إِنَّمَآ أَشْكُوا۟ بَثِّى وَحُزْنِىٓ إِلَى ٱللَّهِ ﴾ [یوسف : ٨٦]

''میں تو اپنی ظاہر ہو جانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں۔''

مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جس میں جزع فزع نہ ہو، ایسا صبر صبرِ جمیل کہلاتا ہے۔ سفیان ثوری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ صبر جمیل یہ ہے کہ اپنی بیماری اور مصیبت کا اظہار نہ کرے اور اپنے آپ کی براءت ظاہر نہ کرتا پھرے۔

بہر حال ان تمام اقوال سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی قضا و قدر کے سامنے خندہ پیشانی سے سر جھکا دیا جائے، یہی صبر جمیل ہے۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام کے اس قول کو بہت بعد میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے دہرایا تھا، جب ان پر واقعہ افک کی تہمت لگی تھی تو انھوں نے کہا تھا:

((وَلَئِنْ قُلْتُ لَكُمْ : إِنِّي بَرِيئَةٌ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَنِّي لَبَرِيئَةٌ، لَا تُصَدِّقُونَنِي بِذٰلِكَ، وَلَئِنِ اعْتَرَفْتُ لَكُمْ بِأَمْرٍ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَنِّي بَرِيئَةٌ لَتُصَدِّقُنِّي، وَاللّٰهُ مَا أَجِدُ لِي وَلَكُمْ مَثَلًا إِلَّا أَبَا يُوسُفَ إِذْ قَالَ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُونَ))

[بخاری، کتاب الشهادات، باب تعديل النسا بعضهن بعضا : ٢٦٦١]

''اور اگر میں تمھیں کہوں کہ میں اس جرم سے بری ہوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں واقعی بری ہوں، تو تم نہیں مانو گے اور اگر میں اس معاملے کا اعتراف کرلوں اور اللہ جانتا ہے کہ میں بری ہوں تو تم اس اعتراف کو سچ جانو گے۔ اللہ کی قسم میں اپنے اور تمھارے لیے ابو یوسف کے علاوہ کوئی مثال نہیں پاتی اس وقت کہ جب انھوں نے کہا تھا۔ میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جو تم کہہ رہے ہو اس پر اللہ ہی میرا امدگار ہے۔''

دراصل صبر جمیل کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان جان لے کہ پیش آمدہ مصیبت اللہ ہی کی طرف سے آئی ہے اور وہ مالک الملک ہے۔ جب مالک ہے تو مالک کے اپنی ملکیت میں تصرف پر اعتراض کیسا ؟ سو جب دل میں یہ بات جاگزیں ہو جاتی ہے تو پھر دل سے درد اور لب سے شکوہ جاتا رہتا ہے اور چہرے پر آسودگی پھیل جاتی ہے۔

پھر مصیبت کے وقت یہ بھی خیال رہے کہ یہ بلائے ناگہانی اس اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو صاحبِ حکمت ہے اور جو انجان نہیں بلکہ وہ ایسا جاننے والا ہے جسے کبھی کچھ فراموش نہیں ہوتا، علیم ایسا ہے کہ اسے کبھی نسیان لاحق نہیں ہوتا، رحیم ایسا ہے کہ کبھی کسی پر زیادتی نہیں کرتا، چنانچہ انسان سوچے کہ یہ جو کچھ ہمیں درپیش ہے ضرور بربنائے حکمت کے ہے، جب انسان اس مثبت انداز سے سوچتا ہے تو اس کی یہ سوچیں زبان سے شکوہ چھین لیتی ہیں اور لب پہ مہر سکوت لگا دیتی ہیں اور یہی عمل انسان کو اسے صبر جمیل کرنے والا بنا دیتا ہے۔

❀❀❀

خوشخبری ہو، کیا پیارا بچہ ہے!

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَأَرْسَلُوا وَارِدَهُمْ فَأَدْلَىٰ دَلْوَهُ ۖ قَالَ يَا بُشْرَىٰ هَٰذَا غُلَامٌ ۚ وَأَسَرُّوهُ بِضَاعَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿١٩﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿٢٠﴾

''اور ایک راہ چلتا قافلہ آیا تو انھوں نے اپنے پانی لانے والے کو بھیجا، سو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔ کہا اوہ! خوشخبری ہو! یہ ایک لڑکا ہے۔ اور انھوں نے اسے سامان تجارت بنا کر چھپا لیا اور اللہ خوب جاننے والا ہے جو وہ کر رہے تھے اور انھوں نے اسے تھوڑی قیمت، چند گنے ہوئے درہموں میں بیچ دیا اور وہ اس میں رغبت نہ رکھنے والوں سے تھے۔''

یوسف کے بے حس بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو کنویں میں پھینکا تو جانا ہوگا کہ معاملہ تمام ہوا، وہ نہیں جانتے تھے کہ معاملہ ہرگز تمام نہیں ہوا بلکہ وہ تو اب شروع ہو رہا ہے۔ لوگوں کی اپنی تدبیریں اور سوچیں ہیں اور میرے اللہ کے اپنے منصوبے ہیں۔ انھیں کیا علم تھا کہ وہ یوسف علیہ السلام کو کنویں کے پاتال میں نہیں اتار رہے بلکہ سرزمین مصر کے تخت کا وارث بنا رہے ہیں۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کا کرنا دیکھیے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول ایک قافلہ جو مدین سے مصر عازم سفر تھا، راہ بھٹک کر اس کنویں کی طرف آ نکلا۔ کیونکہ یہ کنواں شاہراہِ عام پر واقع نہ تھا، بلکہ قدرے ہٹ کر تھا، جہاں صرف چرواہے وغیرہ جایا کرتے تھے۔ زمانۂ قدیم میں نہ آج کی سی سفری سہولیات تھیں اور نہ آج کے سے سفر ہوتے تھے۔ تب بہت سے مسافر مل کر سفر کیا کرتے اور ان سب مسافروں کے مجموعے کو قافلہ کہا جاتا۔ ایک یا ایک سے زیادہ افراد کی ذمہ داری یہ ہوتی کہ قافلہ کے آگے آگے چلیں اور قافلے کے لیے قیام و طعام اور پانی وغیرہ کا بندوبست کریں۔ جسے آج کے دور میں آپ ایڈوانس پارٹی کہہ لیجیے یہ پانی کی جستجو میں اس کنویں تک جا پہنچے۔ ڈول ڈالا اور رسہ کھینچنے لگے۔ مگر جب ڈول باہر

نکلا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ زندگی میں پہلی دفعہ کنویں سے پانی کی بجائے ایک نہایت حسین وجمیل بچہ نکل پڑا ہے۔ مارے خوشی کے اس نے اہل قافلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''خوشخبری ہو کہ ایک غلام دستیاب ہوا ہے۔'' ''بشریٰ'' عربی میں خوشخبری کو کہتے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ ''بشریٰ'' وہاں قافلے میں کسی شخص کا نام تھا جسے مخاطب کر کے اس شخص نے آواز لگائی تھی:

«أَسَرُّوهُ بِضَاعَةً» : ''انھوں نے یوسف کو مال تجارت جان کر چھپا لیا۔''

یہاں چھپا لینے والے کون ہیں؟ ایڈوانس پارٹی، قافلہ والے یا خود برادرانِ یوسف؟

یہاں مفسرین کی دو رائے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ برادرانِ یوسف میں سے ہمیشہ قدرے معقول رائے دینے والا 'یہودا' یوسف کے لیے کھانا لایا کرتا تھا اور دیگر بھائی بھی کنویں پر نظر رکھے ہوئے تھے کہ دیکھیں کیا بنتا ہے، سو جونہی اہل قافلہ نے یوسف کو کنویں سے برآمد کیا، یہ بھی فوراً آن وارد ہوئے اور یوں انھوں نے یوسف کو اپنا بھاگا ہوا غلام بتا کر اہل قافلہ کو فروخت کر دیا۔ بیچا بھی نہایت کم داموں میں، ثمن کہتے ہیں قیمت کو اور بخس کا معنی ہے 'ناقص اور بے برکت' تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خرید و فروخت کو ''ثمن بخس'' یعنی ''ناقص قیمت'' قرار دیا ہے۔

''دراہم'' درہم کی جمع ہے اور یہ عربوں کی تب کی کرنسی کا نام ہے۔ 'معدودہ' کا مطلب ہے 'چند ایک' اردو میں بھی یہ لفظ 'معدودے چند' کی صورت میں مستعمل ہے۔ بعض مفسرین نے معدودے چند درہموں کی تعداد بیس درہم بتائی ہے، یعنی کل بیس درہموں میں 'شطرِ حسن' کے مالک یوسف کو بیچ دیا گیا، آہ کس قدر بیش قیمت بلکہ انمول شخصیت کو کس قدر ارزاں بیچ دیا گیا۔ کیوں؟ اس کی وجہ قرآن مجید نے بتائی ہے:

«وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ» کہ وہ اس معاملے میں بڑے بے رغبت ثابت ہوئے تھے۔ انھیں قدرِ یوسف سے آگاہی ہی نہ تھی، یہ بے قدرے لوگ تھے۔ انھیں معلوم ہی نہ تھا کہ نبوت کی کہکشاں کا ایک درخشندہ ستارہ اور تاریخ کے سنہری باب کا ایک درخشاں استعارہ

آج ان کی بے قدری کی زد میں ہے۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ ان کے نزدیک انسان کی نہیں مال وزر کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ درہم و دینار اور مال و زر کے ان پجاریوں کے نزدیک انسان کی اہمیت اور قیمت نہیں ہوتی۔

تو دیکھیے اللہ رب العزت یہاں افسوس کا اظہار فرما رہے ہیں کہ ظالموں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو چند کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ دراصل ہیرے کی پرکھ اور موتی کی پہچان جوہری کو ہوتی ہے۔ بے بصیرت اور نادان شخص تو کوہِ نور کے بدلے بھی آپ کو آدھ کلو سبزی تک دینے سے انکار کر دے گا، جبکہ آشنائے حقیقت جوہری شاید اس کے بدلے نقدِ جاں بھی نذر کرنے کو تیار ملے۔

آج کے اس مادیت پرست دور میں ہمیں شکوہ رہتا ہے کہ روحانی اقدار اور علمِ دین و دانش کی تحقیر ہوا کرتی ہے اور حاملانِ دین متین کی بے قدری وتیرہ ہو چکی ہے۔ میرے بھائی ایسا موقع بن جائے تو دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ ان مادیت کی چکا چوند سے چندھیائی آنکھوں والوں کو دراصل اس حقیقت کا علم ہی نہیں، بے بصیرت اور نادان سے بھلا بے قدری کی کیا شکایت؟ یہ لوگ آج دینی شعار اور اہل دین کے وقار کا استہزاء کرتے ہیں تو کیا کریں، کل کا منظر کچھ اور ہوگا اور اس کی ایک تصویر کشی خود قرآن نے کی ہے؟

آیت بتا رہی ہے کہ انھوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو مال تجارت جان کر چھپا لیا۔ چھپا کیوں لیا؟ دراصل یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی چیز مفت ہاتھ لگتی ہے تو حریص طبیعت اکساتی ہے کہ وہ اسے چھپا لے تاکہ کوئی اور دیکھ کر شریک نہ ہو جائے۔ ممکن ہے یہی حرص یہاں غالب آ گیا ہو پھر انھیں یہ بھی اندیشہ ہوگا کہ جس کا بھی لڑکا گم ہوا ہے کہیں وہ تلاش کرتا ہوا نہ آ جائے اور یوں مفت ہاتھ آئی چیز سے ہاتھ ہی نہ دھونے پڑیں۔ سو انھوں نے اسے چھپا لیا۔

غور کیجیے ایک طرف برادرانِ یوسف تھے، سیدنا یوسف علیہ السلام کو صفحہ ہستی سے معدوم کر دینے کی خواہش رکھنے والے! اور دوسری طرف اہل قافلہ تھے، یوسف کو اک مالِ تجارت

جان کر چند ٹکے کمانے کی آرزو رکھنے والے! اور یہ دونوں نہ جانتے تھے کہ یہ تو بس مہرے اور ظاہری کردار ہیں۔ یہ سب حقیقتِ حال سے بے خبر تھے اور بس اپنے اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ اللہ جانتا تھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نہ تو منڈی میں بکنے والا مال ہے اور نہ صفحۂ ہستی سے مٹ جانے والا کوئی شخص، یہ نہیں جانتے تھے مگر اللہ تو جانتا تھا کہ اللہ تو علیم ہے، اسے سب علم تھا، چنانچہ یہ اپنی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اور اصل حقیقت حال کو جاننے والا اللہ اپنا منصوبہ آگے بڑھا رہا تھا۔

❀❀❀

عزیزِ مصر کی اپنی بیوی کو ہدایت

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِن مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ أَكْرِمِي مَثْوَاهُ عَسَىٰ أَن يَنفَعَنَا أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهُ مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ ۚ وَاللَّهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢١﴾

"اور جس شخص نے اسے مصر سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اس کی رہائش باعزت رکھ، ہوسکتا ہے کہ ہمیں فائدہ دے، یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ اور اسی طرح ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ دی اور تاکہ ہم اسے باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھائیں اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔"

قرآن مجید نے یہاں ایجاز کا مظاہرہ کرتے ہوئے سفر کے تمام تر احوال حذف کر دیے ہیں، اس لیے بھی کہ ان کے بیان کی ضرورت نہ تھی اتنا تو خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے، بہرحال قافلہ منزلوں پر منزلیں طے کرتا مصر پہنچ گیا۔ یوسف جو کل تک ایک پیار کرنے والے باپ کا آزاد لختِ جگر، نورِ نظر اور باپ کی محبتوں کا مرکز تھا، آج ایک غلام کی حیثیت سے بازارِ مصر میں بک رہا تھا۔ لیکن آج یوسف اتنا بے وقعت نہیں رہا تھا، اس کے مکھڑے کا حسن و جمال، اس کے دلکش و حسین خدوخال، اس کے چہرے کی وجاہت اور اس کی پیشانی پہ چمکتی

نجابت چیخ چیخ کر اعلان کر رہی تھی کہ یہ کوئی معمولی شخص نہیں، سو آج پورے مصر میں اس غلام کا تذکرہ تھا، اس کی رعنائی و شرافت کا شہرہ تھا۔ قرطبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ جب قیمتیں لگنا شروع ہوئیں تو پھر کمال ہوتا گیا، وہ جو کہتے ہیں ......؎

کوئے وفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آ گئے تو گرمئ بازار دیکھنا

بالکل یہی منظر تھا یہاں، قرطبی کے مطابق، سیدنا یوسف علیہ السلام کے جسدِ اطہر کے ہم وزن سونا، اتنا ہی خالص مشک اور اتنے ہی وزن میں ریشم کے بیش قیمت کپڑے تو لے گئے۔ بھاؤ اتنا بیش تھا کہ بڑے بڑے سردار اور زردار بغلیں جھانکنے لگے۔ اس دور میں مصر کا بادشاہ قوم عمالقہ میں سے ایک شخص ریان بن اسید تھا اور عزیز مصر کہ نام جس کا قطفیر یا اطفر تھا، اس کی حکومت میں وزیر خزانہ تھا۔ اس نے یوسف علیہ السلام کو خریدا اور گھر لا کے بیوی جس کا نام راعیل یا زلیخا بتایا جاتا ہے، سے کہنے لگا: اس بچے کو دیکھو! اس کے چہرے پہ قائم نورانی ہالہ اس کے نجیب الطرفین ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ جانے کس خاندان کا محورِ محبت ہے اور نہیں معلوم کہ حالات کی کس گردش کے پھیر میں ہمارے ہاتھوں لگا ہے، بہر حال اب:

«اَكْرِمِيْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا» : ”باعزت رکھ، ہوسکتا ہے کہ ہمیں فائدہ دے، یا ہم اسے بیٹا بنالیں۔“

سو جس قدر بھی ممکن ہو اس کی عزت و توقیر کرو۔ اس کے چہرے سے پھوٹتی سعادت اور اس کی نظروں سے آشکار ہوتی حیا بتاتی ہے کہ یہ ہمارے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا، عین ممکن ہے ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔ قربان جایئے رب کائنات کی اپنے بندے سے محبت پر کہ برادرانِ یوسف نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو باپ کی محبت سے محروم کر دیا تھا تو یہاں عزیز مصر کے لبوں سے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لیے پہلا ہی جملہ باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کرتا نظر آتا ہے۔ درست کہ ......؎

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

«وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ» اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس انداز سے ہم نے یوسف کو کنویں کی قتل گاہ سے اٹھایا اور مصر کے ایک نہایت عالی شان، معزز اور بارسوخ گھرانے میں عزت کی جگہ پر متمکن فرما دیا، برادرانِ یوسف نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو موت کے تختہ کی نذر کرنا چاہا تھا مگر اللہ رب العزت نے انھیں مصر کے تخت کی طرف گامزن فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت، فہم بصیرت اور دین و دانش کے لیے سیدنا یوسف علیہ السلام کا سینہ فراخ فرما دیا۔ بات کی تہہ تک پہنچنے کا ملکہ دیا، گفتگو کا سلیقہ دیا۔ خوابوں کی تعبیر میں وہ درک دیا کہ اک وقت مصر کا دربارِ شاہی اپنے خوابوں کی تعبیر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے یوسف کا محتاج دکھائی دینے لگا۔ پھر مزید یہ کہ مصر کی درباری اشرافیہ میں ممتاز ترین گھرانے کے ذریعے دربارِ شاہی تک رسائی عطا کر دی۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اندازِ کرم ہیں۔ وہ کسی کو مال دے کر نمایاں کرتا ہے اور کسی کو علم کے ذریعے سے سرفراز کر دیتا ہے۔ شاید آج کے عہد میں ہم علم اور عالم کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن عہدِ گزشتہ میں تخت پر بیٹھے بادشاہ اہلِ علم کی بے پناہ توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ وہ اہلِ علم و فن کو اپنے قرب سے نوازتے اور اپنے مصاحبین میں شامل کر لیتے، سو اللہ تعالیٰ نے دربارِ مصر میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو اہل علم کا پر جلال ٹھکانا عطا فرما دیا۔

«وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ»: آیت کا یہ ٹکڑا انسانی زندگی کی بساط اور امور الٰہی کے نظام کو سمجھنے میں نہایت اہم ہے۔ بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے وہ اپنے امور سرانجام دینے کے لیے مناسبِ حال حالات پیدا کرتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا:

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ [البروج: ١٦]

”اللہ جس کام کو چاہتا ہے بخوبی سرانجام دے دیتا ہے۔“

نیز فرمایا:

﴿ لَا یُسْـَٔلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْـَٔلُوْنَ ﴾ [الأنبیاء : ۲۳]

''اللہ سے نہیں پوچھا جاتا اُس کے متعلق جو وہ کرے اور اِن سے پوچھا جاتا ہے۔''

یہ تو انسان ہے کہ جو حالات کے سامنے بے بس ہے، یہ اپنی تمام تر آزادی وخود مختاری کے باوجود بہت حد تک لاچار ہے۔ ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اب یہ اللہ کا فیصلہ تھا کہ یوسف علیہ السلام کو مصر کے تخت و تاج کا وارث بنانا ہے، مگر لوگ یہ کب جانتے تھے؟ لوگوں کے سامنے کے مناظر تو کچھ اور تھے۔ ایک غلام، اور منڈی میں بکتا ہوا ایک بے آسرا غلام...... کون جانتا تھا کہ یہ بکنا بکانا تو بس اک ظاہری امر ہے، فی الاصل یہ قومِ مصر کی سیادت کا اک سفر ہے۔ یہاں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ جسے اللہ نوازنا چاہے تو پھر کوئی رکاوٹ اس کے رستے میں حائل نہیں ہوسکتی، پھر کوئی اس کی راہ روک نہیں سکتا۔ کسی کا بے بس ہونا، بے ما یہ ہونا یا غلام ہونا بھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ یہیں سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسانوں کو ظاہری اسباب و ذرائع پر کامل توکل و بھروسا نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ اللہ پر بھروسا، اس کی قدرت پہ اعتماد اور اس کی قوت و طاقت پر توکل ہونا چاہیے۔ اسی سے اپنا رشتہ مضبوط اور گہرا کرنا چاہیے۔ اسی کے در کی گدائی اختیار کرنا چاہیے، دراصل یہ وہ عقیدہ ہے جو جس کے دل میں اتر جاتا ہے اور جس کے عمل سے جھلکنے لگتا ہے پھر خوف و ڈر اس شخص کے دل میں بسیرا نہیں کر سکتے جو اس در کا ہو جاتا ہے اسے ہر ہر در کی غلامی سے یک قلم نجات مل جاتی ہے، مگر یہ کام مادیت پرست انسان اور اس کی ظاہر پرست طبیعت پہ قدرے گراں ہوتا ہے۔ اقبال کے بقول:...... ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو دیتا ہے نجات

یہاں ایک سوال اور ہے۔ وہ یہ کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر ہی نے کیوں خریدا، کوئی اور بھی تو خرید سکتا تھا؟ مفسرین نے اس پر بحث کی اور نتیجہ یہ نکالا کہ دراصل اللہ تعالیٰ

یوسف علیہ السلام کی تربیت کرنا چاہتا تھا۔قوانینِ جہاں بانی اور آئین جہانگیری کے اسلوب سکھانا چاہتا تھا۔ امورِ سلطنت کا انتہائی قریب سے مشاہدہ کروانا چاہتا تھا، تو یہ حالات دراصل اللہ رب العزت کے ہاں سیدنا یوسف علیہ السلام کی تربیت کے لیے نہایت ضروری تھے، مگر ظاہر ہے لوگ ان لطیف باریکیوں کو جان سکتے تھے اور نہ ان کٹھن حالات کی تہوں میں پوشیدہ حکمت کی پنہائیاں محسوس کر سکتے تھے۔قرآن مجید نے اس آیت کریمہ کے مختصر ترین الفاظ میں ان سارے پہلوؤں کو نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا، یعنی:

''اللہ اپنے امور پر غالب ہے مگر اکثر لوگ اسے نہیں جانتے۔''

❀❀❀

سیدنا یوسف علیہ السلام پر رب کی مزید نوازشات

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

''اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے بڑا حکم اور بڑا علم عطا کیا اور ہم نیکی کرنے والوں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔''

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی ان نعمتوں کا احساس دلانا چاہتے ہیں جو اللہ رب العزت کی بندوں پر ہیں۔ اگر اللہ رب العزت کسی شخصیت کو نبوت سے سرفراز فرماتا ہے تو یہ اس فرد پر ہی نہیں ساری انسانیت پر احسان اور نعمت ہے اس لیے کہ نبی نبوت سے سرفراز ہو کر بیٹھ نہیں رہتے بلکہ وہ تو اصلاحِ انسانیت کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے دورِ طفولیت سے عہدِ شباب میں قدم رکھا، جسمانی قوت عروج کو پہنچی، علم وعقل میں پختہ ہوئے، انھیں تجربات ومشاہدات سے خاطر خواہ آگہی حاصل ہوگئی اور جب اس عمر کو پہنچے کہ معاملاتِ زندگی اور امورِ حیات سلجھانے کی صلاحیت کے حامل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انھیں حکمت وعلم کی بیش قیمت دولت سے سرفراز فرما دیا۔

”حکماً وعلماً“ دراصل قرآن مجید کی باقاعدہ اصطلاح ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں جہاں بھی یہ اصطلاح بندوں کے لیے استعمال ہوئی، وہاں اس سے نبوت مراد ہے۔ بہرطور اس سے مراد عمومی طور پر حکمت اور علم بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾: آیت کے مذکورہ حصے میں ایک بات خصوصی طور پر سمجھنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو بڑی بڑی صلاحیتوں سے کیسے نوازتا ہے؟ وہ کن لوگوں کو اور کس بنیاد پر نوازتا ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب اس آیت میں موجود ہے۔ اللہ رب العزت کے ارشاد سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ ساری جزائیں اور یہ ساری خوبیاں اللہ تعالیٰ ”محسنین“ کو عنایت فرماتے ہیں۔ محسن کہتے ہیں احسان کرنے والے کو، ہماری زبان میں احسان کا مفہوم بہت محدود ہے، شریعتِ اسلامیہ نے بہت سے الفاظ کو وسیع مفاہیم کے اک نئے افق سے متعارف کروایا ہے۔ احسان اور محسن کی صحیح اور شریعتِ اسلامیہ کے موافق تعبیر ہمیں حدیث جبرئیل میں بہت وضاحت سے ملتی ہے۔ حدیثِ جبریل جس میں مذکور ہے کہ ”ایک روز جبرئیل علیہ السلام انسانی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے، چمکتا ہوا چہرہ، آنکھیں بہت زیادہ سیاہ اور سفید براق کپڑے پہنے ہوئے، صحابہ فرماتے ہیں ہم میں سے انھیں کوئی جانتا نہ تھا مگر ہم انھیں دیکھتے تو ان پر آثارِ سفر بھی نہیں پاتے تھے، یعنی مقامی بھی نظر نہ آتے تھے اور مسافروں کی سی ہیئت بھی دکھا نہ دیتی تھی۔

بہرحال انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کیے۔ یہ سوالات دراصل صحابہ کی تعلیم کے لیے تھے۔ ان سوالات میں سے ایک سوال احسان کے متعلق بھی تھا۔ جبرئیل علیہ السلام نے دریافت کیا تھا: ﴿ مَا الْإِحْسَانُ ﴾ ”احسان کیا ہے؟“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ ﴾

[بخاري، باب سؤال جبريل : ٥٠]

”احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے، اگر ایسا

تصور کرنا ممکن نہیں تو پھر یہ یقین تو ہونا چاہیے کہ اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔''

عبادت میں یکسوئی، انہماک، توجہ کی یہ کیفیت ہی دراصل احسان ہے اور اس کیفیتِ خاص کے ذائقے سے آشنا شخص 'محسن' کہلاتا ہے، محسن وہ شخص ہے جس کا تعلق رب سے اتنا گہرا ہو کہ وہ نماز میں ہو تو توجہ ادھر ادھر نہ بھٹکتی پھرے۔ وہ نماز میں ہو تو یوں لگے گویا دیدارِ الٰہی سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ جب تکبیرِ تحریمہ کہہ چکے تو پھر ساری دنیا سے کٹ جائے، کاروبار کی الجھی گرہیں اس کے ذہن سے نکل جائیں، دنیاوی جھمیلے پردۂ دل سے کافور ہو جائیں۔ خاندانی مسائل و تنازعات سے دل آزاد ہو جائے۔ دل و دماغ اور چشم و گوش دنیاوی علائق سے کٹ کر ایک ماورائی تصور کہ ''اللہ مجھے دیکھ رہا ہے'' میں ڈوب جائیں، اور یہ عبادت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے جب مسلسل نیک عمل کے بعد یہ کیفیت حاصل ہو جائے اور اس پر دوام اختیار کیا جائے تو انسان محسن کہلاتا ہے۔

عبادات اور نیک اعمال میں دوام اور پیہم عمل نہایت اہم ہیں، دراصل رب کو بندے کی ادا ہی یہ بھاتی ہے کہ عبادات اور نیک اعمال میں مستقل مزاج ہو متلون مزاج نہ ہو کہ کبھی شب بھر مصلے پر اور کبھی دن کو بھی مسجد کا رخ نہیں، یہاں مستقل مزاجی اور متانت و سنجیدگی کا حامل ذمہ دارانہ رویہ چاہیے، رہا عمل، تو وہ قلیل بھی ہو تو کفایت کرتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

«وَ اَنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اَدْوَمُهَا اِلَى اللّٰهِ اِنْ قَلَّ»

[بخاری، باب القصد والمداومة : ٦٥٩٩]

''بلا شبہ اللہ کے نزدیک محبوب ترین اعمال وہ ہیں جن پر دوام یعنی ہمیشگی اختیار کی جائے اگرچہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہوں۔''

واضح رہے کہ اللہ رب العزت نے عزلت نشینی اور رہبانیت کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ معاشروں میں رہ کر اصلاح معاشرہ اور انسانی سدھار پر زور دیا ہے، تاہم اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ جب تم اس کے حضور آؤ تو پھر دنیاوی معاملات سے دامن جھاڑ کے آؤ، پھر من میں امورِ دنیا کے بت سجا کے نہ آجاؤ۔ جب آؤ تو بس سب سے کٹ کر ایک واحد رب سے جڑ

جاؤ۔ جیسا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

﴿ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ﴾ [المزمل : ۸]

''اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا۔''

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی کیفیت بیان فرمائی ہے۔ اسود بن یزید کہتے ہیں میں نے سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ ہم میں بیٹھے رہتے مگر جونہی اذان کی آواز سنتے تب یوں اٹھ کے چل دیتے گویا ہمیں جانتے ہی نہ ہوں۔

اللہ سے تعلق بہتر سے بہتر اور مضبوط سے مضبوط بنانا چاہیے۔ جب انسان کا رب سے تعلق گہرا ہو جاتا ہے تو پھر طبیعت میں بشاشت اور نرمی آ جاتی ہے۔ چہرے پہ رونق اور لہجے میں شیرینی گھل جاتی ہے۔ جب رب سے تعلق درست ہو جائے تو پھر بندوں سے بھی تعلق بڑا زبردست ہو جاتا ہے اور جب اللہ سے معاملات نادرست ہوتے ہیں تو پھر لوگوں سے بھی خراب ہو جاتے ہیں۔

یہاں رب کریم نے محسنین کی تعریف فرمائی ہے آپ قرآن مجید دیکھیے آپ کو متقین و محسنین سے اللہ کی مدد، نصرت، تائید اور حمایت کے جا بجا وعدے نظر آئیں گے۔

کبھی کہا:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ﴾ [التوبۃ : ۱۲۰]

''بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

کہیں فرمایا: ''اللہ تعالیٰ متقین کے ساتھ ہے۔'' آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں آپ کو بار بار یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنے محسن بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتا، وہ ہمیشہ ان کی مدد کرتا ہے۔ دراصل جو شخص جتنا گناہوں سے بچ کر چلتا جائے گا وہ اتنا ہی متقی اور محسن ہوتا جائے گا۔ یہ قاعدہ ہے، گناہوں سے اجتناب ہی انسان کو درجہ احسان تک پہنچاتا ہے، کیونکہ گناہ تو

دل کو سیاہ اور دماغ کو تاریک کرتا جاتا ہے اجالے گناہ سے نہیں وہ تو نیکیوں سے پھوٹتے ہیں۔ روشنیاں تو اعمالِ صالحہ سے دو چند ہوتی ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے انسان قربِ الٰہی سے ہم کنار ہوتا ہے، ہمیں التجا کرتے رہنا چاہیے اور اس دعا کو اپنی روزمرہ دعاؤں میں شامل کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں محسن بنا دے، اللہ ہمیں بھی اپنے محسن بندوں میں شمار فرما لے، وہ کہ جن کو دنیا و آخرت کی نعمتیں اور انعامات نصیب ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ انھی میں کہیں ہمارا بھی شمار فرما لے۔ آمین!

❀❀❀

بند دروازوں کے پیچھے سے عورت کی پکار

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ إِنَّهُ رَبِّيٓ أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٣﴾

’’اور اس عورت نے، جس کے گھر میں وہ تھا، اسے اس کے نفس سے پھسلایا اور دروازے اچھی طرح بند کر لیے اور کہنے لگی جلدی آ۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ، بے شک وہ میرا مالک ہے، اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنایا۔ بلاشبہ حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح نہیں پاتے۔‘‘

جیسا کہ ہمیں معلوم ہو گیا یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر نے اپنی بیوی کے سپرد کر دیا، حکم دیا کہ اس کا قیام و طعام اس کا احترام و مقام نہایت عمدہ اور بہت شان و شوکت والا ہونا چاہیے۔ چنانچہ اب سیدنا یوسف علیہ السلام اس گھر میں رہنے لگے، اونچے خاندان اور اعلیٰ سوسائٹی کے انداز و اطوار دیکھنے اور سیکھنے لگے۔ حکمرانی اور جہاں بانی کے طور طریقوں کا مشاہدہ کرنے لگے۔ آپ ذرا یوسف علیہ السلام پر غور کیجیے۔ جناب حسن و جمال میں یکتا تھے اور وجاہت و نجابت میں لاثانی، چہرے پر ایمان کا نور بہار دیتا تھا اور چڑھتی جوانی کا عجب رنگ تھا۔ خود رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق:

((أُعْطِيَ يُوسُفُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ شَطْرَ الْحُسْنِ))

[مسند أحمد : ٢٨٦/٣، ح : ١٤٠٩٦، و إسناده صحيح۔ مسلم : ١٦٢]

''یوسف علیہ السلام کو نصف حسن دیا گیا تھا۔''

عزیز مصر کی بیوی جس کا نام زلیخا یا شاید کچھ اور تھا، وہ تھی تو اونچے گھرانے کی بیگمات میں سے مگر حیا سے کھوکھلی تھی۔ چنانچہ شیطان نے اسے بہکایا تو وہ شیطان کے وار سے چت ہوگئی اور اس کے دل میں ہوس کا سمندر موجزن ہوگیا۔ نہیں معلوم کتنا عرصہ وہ اس آتشِ گناہ میں جلتی رہی اور کب حیا کا لبادہ تار تار کر کے بذات خود یوسف علیہ السلام دعوتِ گناہ دینے لگی۔ ذرا اس عہد کے مصر کے اونچے گھرانوں کی بیگمات کی اخلاقی حالت ملاحظہ فرمایئے۔ یہ طبقہ اشرافیہ شاید ہر عہد میں حیا سے کورا اور عفت وعصمت سے ناآشنا ہوتا ہے، بہر حال ہوس کی ماری یہ خاتون کوئی تنہائی کا موقع پا کر سیدنا یوسف علیہ السلام کو آمادۂ گناہ کرنے لگی، یوسف جیسے پاکباز کو دعوتِ گناہ دینے لگی۔

من میں چور آ جائے تو پھر بڑے بڑے مرحلے بھی نہایت جلدی طے ہو جاتے ہیں، سوایک موقع پا کر اس نے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں، پردے گرا دیے اور خلوت وتنہائی کا ماحول بنا کے یوسف علیہ السلام سے کہا: ''ذرا نظر اٹھا کے تو دیکھیے'' اور آپ اس خاتون کے اس جملے سے سیدنا یوسف علیہ السلام کا درخشاں کردار دیکھیے۔ سبحان اللہ! اس کا یہ جملہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار پر کیا عمدہ دلیل ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس کے اس سارے اہتمام کو اک نظر غلط اٹھا کر بھی دیکھنے کے لائق نہیں جانا بلکہ نظریں جھکائے کھڑے رہے، جب اس نے یوسف کو غیر ملتفت پایا اور جب دیکھا کہ عجب نوجوان ہے جس کے سینے میں دھڑکتا دل ہے۔ ہاتھ پاؤں میں جان ہے مگر اس کی نظریں نیچی ہیں، سانس ہموار ہے اور لہجہ ہیجان سے بے خبر ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب اس نے حسن کی حشر سامانیوں اور خلوت کدے کی رعنائیوں کا وار خالی جاتے دیکھا تو حیرت وحسرت کی ملی جلی کیفیت میں کہا کہ یوسف ذرا نظر اٹھا کے تو مجھے دیکھ لو کہ میں کس طور سراپائے دعوت بنی

کھڑی ہوں، مگر قربان جائیے! عفت و حیا کے پیکر سیدنا یوسف علیہ السلام پاکباز پر کہ جذبات کے اس طوفانی ریلے میں بہنے کی بجائے انھوں نے کمال سکینت اور عجب اطمینان سے کہا: ''معاذ اللہ'' میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، میں نظر کیسے اٹھاؤں اور تمھاری دعوتِ گناہ پہ لبیک کیسے کہوں، میں کہ جس پر رب کی عنایتوں کا شمار نہیں، وہ رب جس نے کنویں سے اٹھایا، قتل سے بچایا اور جس کی آسائش و راحت کا نگران خود مصر کے وزیر خوراک کو متعین فرما دیا۔ میں اس رب کی نافرمانی کیسے کروں، جس نے مجھے یہ عالی شان مقام دیا ہے۔ سبحان اللہ! یوسف علیہ السلام کا برائی سے بچنے کے لیے استدلال دیکھیے اور آج کے حالات بھی دیکھیے کہ جب برائی کے ارتکاب کے لیے دلائل تراشے جاتے ہیں۔

سیدنا یوسف علیہ السلام سوچ رہے ہیں، جب اللہ نے مجھ پر اتنا انعام کیا تو اب کیا میں اپنے آپ کو اوچھا ثابت کروں؟ خائن بن جاؤں؟ اور ظلم پر اتر آؤں اس موقع پر یوسف علیہ السلام نے جو 'رب' کا لفظ استعمال کیا اس کے لغوی اور اصطلاحی دونوں معانی علماء نے مراد لیے ہیں عربی میں 'رب' کہتے ہیں تربیت و پرداخت کرنے والے کو..... چونکہ عزیز مصر اس وقت یوسف علیہ السلام کی ظاہری پرورش کا ذمہ دار تھا اور اس نے واقعی یوسف پر بڑا احسان کیا تھا۔ بہت قیمت ادا کر کے خریدا تھا مگر غلام بنا کر رکھنے کی بجائے شہزادوں کی سی آسائش دے رکھی تھی۔ چنانچہ 'ربیٔ' سے وہ بھی مراد ہوسکتا ہے اور اگر حقیقی طور پر دیکھیں تو یہ دنیاوی سہارے تو بس ظاہری ہی ہوتے ہیں، اصل کارساز تو اللہ ہے۔ وہی ماں کے دل میں بچے کی محبت ڈالتا ہے۔ وہی سارے اسباب پیدا فرماتا ہے، سو اصلی پرورش کرنے والا وہی ہے۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی فراست و بلاغت نقطۂ کمال تک پہنچی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ذو معنی لفظ بول کر دونوں کے احسانات کا تذکرہ کر دیا۔

تو یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ جن کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں میں ان کے حق میں کیسے خیانت کا ارتکاب کروں۔ عزیز مصر کے حق میں خیانت یوں کہ وہ اس کی بیوی تھی اور رب کے حق میں یوں کہ اس نے یہ فعل بد حرام کر رکھا ہے۔

ساتھ ہی وضاحت فرما دی کہ جو یوں کرتے ہیں وہ ظالم کہلاتے ہیں، ظلم کا معنی ہے، کسی بھی چیز کو ناموزوں جگہ پر رکھنا اور یہ بات طے ہے کہ ظالم لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

آیتِ مذکورہ میں لفظ رب سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی مراد لینا زیادہ معتبر تفسیر ہے قرینہ یہ ہے کہ پیچھے معاذ اللہ کے لفظ ہیں۔ یعنی 'اللہ سے پناہ' اس کے ساتھ ہی اگر یہ لفظ آتے ہیں: ﴿انه ربی احسن مثوای﴾ تو اس مقام پر سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں، ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اسی مفہوم کو قرین قیاس قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سے بچنے کے لیے انسان کو اللہ کی نعمتوں کی طرف متوجہ ہونے چاہیے۔ اللہ کے احسان کا ذکر بندے کو شکر اور صبر کا ملکہ سکھاتا ہے۔

❀❀❀

یوسف علیہ السلام کے دامنِ عصمت پر کوئی داغ نہیں

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۭ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْۗءَ وَالْفَحْشَاۗءَ ۭ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی۔ اسی طرح ہوا، تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا۔''

سیرت یوسف کے بیان میں یہ آیت بہت اہم ہے ''بالتحقیق اس عورت نے ارادہ کیا اور یوسف نے بھی ارادہ کر لیا۔'' کے الفاظ کو سمجھنے اور ان کی وضاحت کرنے میں علمائے تفسیر نے مختلف پہلو اختیار کیے ہیں۔ ایک معنی تو یہ کیا گیا ہے کہ اس عورت نے گناہ کا ارادہ کیا۔ یوسف علیہ السلام کو ورغلایا اور پھسلایا تو یوسف علیہ السلام کے ذہن میں بھی خیال آ گیا۔ انسان ہونے کے ناتے خیال آنا ممکن ہے، پھر خیال آنے سے گناہ لازم نہیں آتا۔ اس خیال کے مفسرین

اس تفسیر کے بعد وہ حدیث بھی بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو محض ارادے پر اللہ تعالیٰ ایک نیکی لکھوا دیتا ہے اور پھر جب انسان وہ نیکی کر لیتا ہے تو سات سو گنا تک اجر وثواب اس شخص کے لیے لکھوا دیا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس جب انسان گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتے کو روک دیتا ہے اور اگر وہ بندہ خیالِ گناہ سے باز آ جائے تو بھی ایک نیکی اس کے کھاتے میں لکھوا دی جاتی ہے لیکن اگر بدقسمتی سے انسان باز نہیں آتا تو نیکی کی طرح سے گناہ کی شدت وتعداد بڑھائی نہیں جاتی بلکہ جس قدر گناہ کیا ہے اتنا ہی لکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ خیال پر سرزنش نہیں کرتا۔ سو اس میں کچھ قباحت نہیں کہ انسان ہونے کے ناتے ایک لمحے کے لیے اس خیال کی پرچھائیں یوسف علیہ السلام کے دل پہ لہرائی مگر اگلے ہی لمحے انھوں نے اس خیال کو جھٹک دیا کہ نہیں میں یہ کام نہیں کروں گا۔

دوسری تفسیر اس آیت مبارکہ کی زیادہ معتبر اور زیادہ مفسرین کی اختیار کردہ ہے۔ سیاقِ کلام بھی جس کی تائید کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ''اس عورت نے بدکاری کا ارادہ باندھ لیا اور یوسف بھی باندھ لیتے اگر وہ اپنے رب کی 'نشانیاں' نہ دیکھ لیتے۔'' تو چونکہ رب کی برہان انھوں نے ملاحظہ فرمالی، سو وہ اس خیالِ گناہ سے بھی باز رہے۔

دراصل عام انسانوں اور ایک پیغمبر کی عصمت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ نبی کسی بھی صورت کبیرہ گناہ کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔ اس کی زندگی اس کی لائی ہوئی تعلیمات کا معیار مقرر کرتی ہے تو اگر پیغمبر کی زندگی کی سچائی اور پاکیزگی میں نعوذ باللہ جھول ہوتا تو لائی ہوئی شریعت بھی معتبر نہ رہتی۔ اس آیت میں اللہ رب العزت نے ایسے متعدد قرائن جمع کر دیے ہیں جو عصمتِ یوسف کے ثبوت کے لیے کافی ہیں، مثلاً:

- یہاں اللہ رب العزت نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی بہت زیادہ مدح بیان فرمائی ہے، ممکن نہیں کہ اللہ رب العزت ان کے ذکرِ گناہ کے بعد اس قدر مدح فرماتے۔
- اگر نبی کا دل خیالِ گناہ سے آلودہ ہو بھی جائے تو اس کے شیشۂ دل میں فوراً خیال توبہ

پیدا ہوتا ہے جو لبوں سے ظاہر ہونے میں دیر نہیں لگاتا اور اگر نبی نے توبہ کی تھی تو اتنا اہم واقعہ ممکن نہیں کہ قرآن بیان نہ کرے، یعنی خیالِ گناہ تو بیان کرے ذکرِ توبہ حذف کر جائے ایسا نہیں ہوتا تو دراصل یہ امر واقعی ہے ہی نہیں۔

❁ پھر قرآن مجید کا اسلوب بیان ملاحظہ کیجیے، فرمایا: ''ہم نے بے حیائی کو یوسف سے ہٹا دیا۔'' یہ نہیں فرمایا: ''یوسف کو برائی سے ہٹا دیا۔'' العیاذ باللہ، اگر سیدنا یوسف علیہ السلام نے ارادہ کیا تھا تو انھیں ہٹایا جانا تھا جبکہ ایسا نہیں ہوا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شیطان کے بہکاوے میں آئی ہوئی اس عورت نے جو اک گناہ کا طلسم طاری کر رکھا تھا، اللہ رب العزت نے اسے کاٹ کر یوسف کو اس کے سحر سے آزاد کر دیا۔

❁ آیت پر غور کیجیے: اللہ رب العزت نے اسی ایک آیت میں براءت یوسف کی گویا چار شہادتیں بیان کر دی ہیں:

۱۔ لفظ لینصرف پر غور کیجیے: ''البتہ ہم نے ضرور پھیر دیا۔'' عربی زبان سے آشنائی رکھنے والے جانتے ہیں کہ لینصرف لام کے بغیر ینصرف یعنی ''ہم نے پھیر دیا۔'' کافی تھا، مگر مزید زور، مزید تاکید اور معنی میں مزید مبالغہ پیدا کرنے کے لیے 'لام' لا کر ثابت کر دیا گیا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، ہم نے گناہ یا خیالِ گناہ کو یوسف کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔

۲۔ پھر دیکھیے بلاغت و فصاحت کا شاہکار اور اختصار کا عادی قرآن یہاں 'برائی' کے لیے ایک کی بجائے دو لفظ لایا ہے۔ ایک 'سوء' اور دوسرا 'فحشا' دراصل سو کے لفظی معنی برائی کے ہیں اور یہ صغیرہ گناہ ہے جبکہ 'فحشا' کے لفظی معنی بے حیائی کے ہیں اور اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے تو قرآن مجید نے ثابت کیا کہ آپ صغیرہ و کبیرہ یعنی ارادہ و عمل ہر دو گناہوں سے بری الذمہ ہیں۔

۳۔ پھر غور فرمایئے کہ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿انه من عبادنا﴾ یعنی وہ ہمارے بندوں میں سے تھا اور اللہ کے بندے کی یہ خصلت نہیں ہوتی بلکہ:

﴿ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ [الفرقان : ٦٣]

''اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو زمین پر نرمی سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے۔''

۴۔ پھر آیت کے آخری لفظ ''مخلصین'' پر توجہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو اپنا مخلص بندہ قرار دیا، اور مخلص بندے اس درجہ پر فائز ہوتے ہیں جہاں شیطان بھی اپنے جملہ ساز وسامان کے باوجود شکست کھا کر ہاتھ کھڑے کر دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔ قرآن مجید نے مخلص بندوں کے ضمن میں شیطان کا یہ اعتراف شکست نقل کیا ہے:

﴿ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ [ص : ۸۲، ۸۳]

''قسم ہے تیری عزت کی ! کہ ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کر دوں گا، سوائے ان بندوں کے جو خالص کیے ہوئے ہیں۔''

شیطان نے اعتراف کیا کہ اس کا داؤ اہل اخلاص پر نہیں چلتا اور ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یوسف علیہ السلام کو مخلص ہونے کا سرٹیفکیٹ خود رحمان نے دیا ہے، فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴾ اس ضمن میں کچھ دیگر دلائل بھی سامنے آتے ہیں لیکن طولِ کلام کے اندیشے سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

❀❀❀

عزیزِ مصر کے رو برو عورت کی عیاری

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۭ قَالَتْ مَا جَزَاۗءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْۗءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۲۵

''اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور اس عورت نے اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑ دی اور دونوں نے اس عورت کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، اس عورت

نے کہا کیا جزا (سزا) ہے اس کی جس نے تیری گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا، سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے، اور کوئی یا دردناک سزا ہو۔''

شدتِ شہوت اور ہوس ناکی کے ہاتھوں مغلوب عزیز مصر کی بیوی اپنی شیطانی خواہش کی تکمیل کے لیے ہر تدبیر اور ہر سازش بروئے کار لاتی ہے اور یوسف صدیق بچاؤ کی ہر ممکنہ تدبیر اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید بتا رہا ہے، اس نے دروازے بند کر لیے اور جانا کہ اب سیدنا یوسف علیہ السلام اس کے دام تزویر میں آ گیا ہے مگر سیدنا یوسف علیہ السلام کو آخر دم تک اس ظلم کدۂ گناہ سے بچنا تھا چنانچہ انھوں نے بند دروازوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ یہاں کیا شاندار سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو برائی کو دیکھتے ہی ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور پھر ندامت بھرے لہجے میں عذر لنگ تراشتے ہیں'' جی کیا کرتے کوئی چارہ ہی نہ تھا ہم تو سخت مجبور تھے۔'' نہیں بہانے نہیں، گناہ سے بچنے کی ٹھوس کوشش ہونی چاہیے، رب کریم کا ارشاد گرامی ہے:

﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ [التغابن : ١٦]

''سو اللہ سے ڈرو جتنی طاقت رکھو۔''

اور پھر جب حسب استطاعت انسان جان مارتا ہے تو رب بچنے اور محفوظ رہنے کے لیے ایک نہیں ہزار راستے مہیا فرما دیتا ہے۔ بچ نکلنے کی ہزاروں تدبیریں سجھا دیتا ہے۔ دیکھیے قرآن مجید نے اس کا وعدہ کیا ہے، ارشادِ ربانی ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ ﴾ [العنكبوت : ٦٩]

''اور جن لوگوں نے ہمارے بارے میں پوری کوشش کی ہم ضرور ہی انھیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔''

پھر یہ بھی دیکھیے کہ مومن نتائج اور کامیابی کا اسیر نہیں ہوتا۔ وہ بس رب کے احکامات پر عمل کرنے کا مکلّف ہے، نتائج اس کے حق میں نکلیں یا خلاف، اسے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، اس کے ذمے بس عمل ہے، وہ اسے پورا کرے نتائج رب قدیر کے ہاتھ میں ہیں۔

جس کا جو کام ہے اسے وہی کرنا چاہیے، چنانچہ دیکھیں کہ حسب استطاعت دوڑ دھوپ کی جائے تو اللہ تعالیٰ بند دروازے بھی کھول دیتا ہے۔

اس ظلمت کدۂ گناہ میں یوسف کے بس میں اتنا ہی تھا کہ وہ دروازے تک پہنچتے، دروازہ بند ہے تو کیا ہوا وہ وہاں تک تو جا سکتے تھے، سو گئے اور رب نے عزت وعصمت کے بچاؤ میں کوشاں اپنے بندے کی تکریم میں بند دروازے کھول دیے۔

یہاں عزیز مصر کی بیوی بھی ان کے پیچھے دوڑ اٹھتی ہے کہ اس کا بچھایا جال ناکارہ ثابت ہو رہا ہے۔ دیکھیے دونوں دوڑ رہے ہیں۔ دونوں کی سعی وکاوش جاری ہے مگر یہ بھی دیکھیے کتنا فرق ہے دونوں کے دوڑنے میں، ایک عزت بچانے کو دوڑتا ہے تو دوسرا عزت گنوانے کو، ایک رحمان کی رضا کے لیے راہِ فرار اختیار کرتا ہے تو دوسرا خوشنودیٔ شیطان کے لیے اس کا دامن پکڑتا ہے، یاد رکھنا چاہیے دوڑ دھوپ سبھی کرتے ہیں، مگر مبارک ہیں وہ لوگ جن کے شب وروز کی تمام ساعتیں رب کے دین کے قیام اور امت کے غلبہ وسیادت کے لیے وقف ہیں۔ یہ دونوں اسی ایک جہاں میں ایک سی کاوشیں کر رہے ہیں، مگر نیت اور ارادے کے فرق نے ایک کو آسمان کر دیا ہے اور دوسرے کو تحت الثریٰ میں اتار دیا ہے، یعنی.....؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

بہر حال دوڑتے دوڑتے یوسف علیہ السلام کا پاکیزہ دامن آلودہ جذبات زلیخا کے ہاتھوں میں آ گیا۔ اس نے جو پکڑ کے کھینچا تو دامن تار تار ہو گیا، صرف دامن، ہاں دامن عصمت اب بھی محفوظ تھا۔ جب دونوں محل کے بند دروازوں سے باہر نکلے تو نکلتے ہی آخری دروازے کے سامنے عزیز مصر کو موجود پایا۔ اب ذرا عورت اور بالخصوص غلط عورت کی نفسیات دیکھیے کہ وہ جو چند لمحے قبل یوسف سے ملوث ہونے میں ہر تدبیر آزما رہی تھی خاوند کو دیکھتے ہی فی الفور بیان بدل گئی۔

یوسف جو کامل طور پر معصوم اور مکمل بے گناہ ہے وہ تو مہر بلب ہے، مگر یہ جو سازشی خاتون ہے چھوٹتے ہی الزام یوسف پر دھر دیتی ہے۔ کیا یہاں سے یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ گناہ ظرف کو بھی کھا جاتا ہے۔ ایک گناہ سینکڑوں گناہوں کے دروازے کھول دیتا ہے، تو اس عورت نے فوراً یوسف کو قصوروار ٹھہرا دیا، نا صرف خطا کار ٹھہرا دیا بلکہ اپنے شوہر کی غیرت کو ابھارنے کی بھی کوشش کی۔ کہنے لگی: اس شخص کی سزا کیا ہوسکتی ہے جو تیری ''عفت مآب'' بیوی پر دست درازی کی کوشش کرے۔'' پھر ساتھ ہی منصف بن کے سزا بھی سنا دی کہ اس کے سوا اور کیا سزا ہوگی کہ یا تو اسے کال کوٹھڑی میں محبوس کر دیا جائے یا پھر کسی دیگر دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ ملاحظہ فرمایئے کہ یہ شریر سرشت لوگ بھی کیا نیچ ظرف ہوتے ہیں۔ گناہ خود کیا، سیدنا یوسف علیہ السلام اپنی پاکیزہ طبیعت اور رب کی لازوال رحمت کی بدولت بچ نکلا، تو اب یہ خود ہی منصف بن جاتی ہے اور مسندِ انصاف پہ براجمان کسی جج کی طرح سزا کے فیصلے صادر کرنے لگتی ہے اور سیدنا یوسف علیہ السلام کیونکر چپ رہتے۔ جب دامن پہ داغ اور عزت پر حرف آئے تو خاموشی بجائے خود جرم بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہاں وضاحت لازمی ٹھہرتی ہے اور اب سیدنا یوسف علیہ السلام کے لبِ وضاحت کھلنے لگتے ہیں۔

❀❀❀

حمایتِ یوسف علیہ السلام میں شہادت

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَن نَّفْسِي ۚ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿٢٦﴾ وَإِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَأَىٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ ۖ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾

''اس (یوسف) نے کہا اسی نے مجھے میرے نفس سے پھسلایا ہے اور اس عورت کے گھر والوں سے ایک گواہ نے گواہی دی اگر اس کی قمیص آگے سے پھاڑی گئی

ہو تو عورت نے سچ کہا اور یہ جھوٹوں سے ہے۔ اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھاڑی گئی ہو تو عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں سے ہے۔ تو جب اس نے اس کی قمیص دیکھی کہ پیچھے سے پھاڑی گئی ہے تو اس نے کہا یقیناً یہ تم عورتوں کے فریب سے ہے، بے شک تم عورتوں کا فریب بہت بڑا ہے۔''

یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اس عورت نے اپنی خواہش نفس سے مجبور ہو کر مجھے ورغلانے اور پھسلانے کی کوشش کی ہے۔ گو سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان مختصر الفاظ کے ساتھ حقیقت حال واضح فرما دی مگر وہ ایک غلام کی اتنی سی بات کہاں ماننے والے تھے، خیر ایک بیان ریکارڈ پر آ چکا تھا اور تحقیق اہل حل وعقد کے ذمہ تھی تاہم اگر وہ ذرا سا غور کرتے، جو انھوں نے کیا بھی، تو براءت یوسف کے کثیر دلائل واحوال واضح تھے۔ مثلاً:

- یوسف علیہ السلام باہر کو دوڑتے ہوئے تشریف لا رہے تھے اگر دل خواہش گناہ سے بوجھل ہو تو پھر باہر نہیں بھاگا جاتا۔
- یوسف علیہ السلام ایک غلام تھے اور ایک غلام کا گھر کی مالکہ کے ساتھ اس حد تک چلے جانا عقلاً محال ہے۔
- غور کیجیے زلیخا نے خاوند کو سامنے پا کر جو لفظ کہے: ''جو تیری اہلیہ کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے۔'' سو کے لفظ بے حیائی پر صراحت نہیں کرتے گویا اس نے مبہم طرز کلام اختیار کیا جبکہ یوسف کے جواب پر غور کیجیے کہ انھوں نے کس صاف انداز میں کھلی بات کر کے بے دھڑک انکار کیا ہے۔ یہ جرأت انکار صاف دل اور بے عیب لوگوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ گناہ گاروں کا ضمیر ان سے جرأت اظہار چھین لیتا ہے اور یہ بات عزیز مصر یعنی حکمرانِ وقت سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنا بیان بے گناہی دے دیا۔ حالات وقرائن بھی سب کے سامنے تھے، سیدنا یوسف علیہ السلام کے بس میں جو اور جتنا کچھ تھا وہ انھوں نے کیا مگر وہ جو رب نے کہا یوسف مخلص بندہ تھا وہ محسن تھا اور رب کا وعدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو نہ تو ضائع کرتا ہے اور

نہ ہی رسوا، چنانچہ جو یوسف کے بس میں تھا انھوں نے کیا، آگے رب کا کام شروع ہوتا ہے اور دیکھیے کہ پھر رب کی نصرت اور تائید کس طور پر نزول ہوتی ہے۔ اندازہ کیجیے رب کی رحمت کس طرح جوش میں آتی ہے اور پردۂ غیب سے کیا کچھ ظہور میں آتا ہے، فرمایا:

«وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا»: نہایت تعجب خیز مناظر بپا ہوتے ہیں عقلیں دنگ کرنے والے اور دماغ ہلا دینے والے دلائل ! فرمایا کہ پھر یوسف کے حق میں خود اس عورت کے اہل خانہ میں سے ایک نے گواہی دی، ظاہری حالات کچھ اور تھے یعنی یوسف تو غریب الدیار تھا اس کا کون تھا جو گواہی کے لیے آتا؟ مگر اندازہ کیجیے اللہ رب العزت اپنے بندے کی کس طرح مدد فرماتا ہے، اس بندے کی جو گناہوں سے بچنا چاہتا ہے۔ یوسف ایک پردیسی اور غلام آدمی ہے۔ جس کا کوئی اپنا نہیں، کوئی مونس، ہمدرد اور غم خوار نہیں اور الزام اتنا بڑا ہے کہ جان کے ضیاع کا خطرہ ہے مگر جب رب کا آسرا موجود ہو تو تمام دنیاوی سہاروں کی عدم موجودگی بھی چنداں نقصان دہ نہیں ہوسکتی، اگر زمین کے سارے در بند ہیں تو کیا ہوا عرش کی راہ تو بند نہیں ہوئی۔

ان آیات میں یہی سبق پنہاں ہے کہ حالات کی گردش کتنی ہی نارسا کیوں نہ ہو۔ دل کی سرزمین پر ناامیدی کے جھاڑ جھنکار نہیں اگنے چاہییں بلکہ مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں بھی وہاں امید کے دیے روشن ہوتے اور آرزو کے گلاب کھلتے رہنے چاہییں۔ مصیبت یا مسرت کی ہر گھڑی میں ذہن کے اندر ہمیشہ یہ یقین رہے کہ اللہ ہر حال میں بندے کا کارساز ہے۔

یوسف کا کوئی نہیں تو کیا ہوا آج زلیخا کے رشتے دار ہی یوسف کی گواہی دیں گے۔ سبحان اللہ ! فضیلت اور براءت ہو تو ایسی کہ خود دشمن کے قبیلے سے یوسف کی پاکبازی کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ وہ جو عرب کہتے ہیں: ”الفضل ما شهدت به الاعداء“

”فضیلت تو یہ ہے کہ خود دشمن بھی جس کے معترف ہوں۔“

پھر یہ گواہی بجائے خود ایک مضبوط دلیل تھی۔ یعنی گواہ کوئی عمر رسیدہ یا جہاں دیدہ شخص نہ تھا کہ جیسا عام طور پر دستور دنیا ہے بلکہ یہ تو وہ بچہ تھا جس نے ابھی نطق و گویائی کی وادیوں میں جھانکا ہی نہ تھا۔ جو بولنا جانتا ہی نہ تھا۔ اس نے گواہی دی۔ کچھ لوگ یہاں اس امکان کو مسترد کرتے ہیں کہ گواہی بچے نے نہ دی تھی مگر یہ امکان نہیں ایک حقیقت ہے۔ مسند احمد، تاریخ طبری اور تفسیر طبری وغیرہ میں حسن سند کے ساتھ یہی منقول ہے کہ یہ گواہی ایک بچے نے دی تھی۔ ملاحظہ فرمائیے:

«قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَكَلَّمَ أَرْبَعَةٌ وَهُمْ صِغَارٌ: هٰذَا، وَ شَاهِدُ يُوْسُفَ، وَ صَاحِبُ جُرَيْجٍ، وَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ» [مستدرك حاكم: ٦٩٦/٢، ح: ٣٨٣٥]

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار بچے چھوٹی عمر میں بولے ہیں، ایک یہ، دوسرا یوسف کا گواہ، تیسرا جریج کا گواہ اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام۔“

نیز تفسیر طبری میں ہے:

«تَكَلَّمَ أَرْبَعَةٌ وَهُمْ صِغَارٌ فَذَكَرَ فِيْهِمْ شَاهِدُ يُوْسُفَ»

”چار بچے چھوٹی عمر میں بولے ہیں اور انھوں نے اس میں یوسف کے گواہ کا تذکرہ بھی کیا ہے۔“

بعض علماء نے اس حدیث کے راویوں پر جو کلام کیا وہ مضر نہیں کیونکہ جن راویوں کے متعلق انھوں نے ترجمہ نہ ملنے کا لکھا، نا صرف ان کا ترجمہ موجود ہے بلکہ ائمہ جرح و تعدیل کے ہاں وہ ثقہ و صدوق قرار پاتے ہیں۔ سو کوئی وجہ نہیں کہ اس حقیقت کا انکار کیا جائے۔

یہاں اسلوب قرآن اور طرز شریعت کا ایک اور حسن ملاحظہ فرمائیے اور وہ ہے دلیل کا حسن، گو کسی ایسے بچے کا بول اٹھنا ہی بہت تھا کہ جس نے کلام کرنا سیکھا ہی نہیں مگر قرآن نے اس پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ قرآن بنیادی طور پر دلیل، تحقیق اور جستجو کو معیار ماننا اور منوانا

چاہتا ہے۔ وہ نری تقدیس پہ نہیں تحقیق پر بنیاد رکھتا ہے۔ چنانچہ بچے نے دلیل اور مشاہدہ کو بنیاد فیصلہ قرار دیا اور کہا کہ دیکھ لو۔

''اگر قمیص سامنے سے پھٹی ہے تو یوسف قصور وار ہے لیکن اگر یہ پیچھے سے پھٹی ہے تو زلیخا خطا کار ہے۔''

چنانچہ جب باقی دلائل وقرائن کے بعد اب اس آخری شہادت نے معاملہ مزید کھول دیا کہ قصور یوسف کا نہیں عزیز مصر کی بیوی کا ہے کہ اگر پیچھے سے قمیص پھٹی ہے تو اس کا مطلب ہے یوسف بچ کے نکل رہے تھے اور زلیخا نے پیچھے سے پکڑا، سو وہ قصور وار ہے اور اگر آگے سے پھٹی ہے تو ظاہر ہے اس میں یوسف علیہ السلام قصور وار ہوں گے۔ دلیل نہایت معقول تھی۔ پھر کہنے والا بھی اپنا ہی تھا سو جب قمیص ملاحظہ کی گئی تو وہ پیچھے سے پھٹی پائی گئی، یوں صاف عیاں ہو گیا کہ یہ عورت ہی جھوٹی ہے جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام سچے ہیں۔

یہاں ایک معاملہ بڑا تعجب خیز ہے کہ اس بیوی کا شوہر بالکل غیرت کا مظاہرہ نہیں کرتا، یوں معلوم ہوتا ہے اسے طیش آتا ہی نہ تھا۔ یا تو یہ کہ وہ بالکل بے حمیت تھا یا پھر یہ کہ اللہ رب العزت نے اسے خاص طور پر ٹھنڈا کیے رکھا کہ طیش میں آ کر وہ یوسف علیہ السلام کی عزت وحرمت پر وار کر سکتا تھا۔ سو رب نے یوسف علیہ السلام کو اس طرح سے محفوظ رکھا کہ وہ نہایت تحمل سے معاملے کو یوں ڈیل کرتا رہا گویا کسی اور کی بیوی کا معاملہ ہے۔ اب یہاں یہ بھی دیکھیے کہ صاف ظاہر ہو جانے کے باوجود براہِ راست بیوی کو قصور وار نہیں ٹھہراتا بلکہ بات کو ہلکا کرنے کے لیے سب عورتوں کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ یہ سب تم عورتوں کے مکر وفریب کا شاخسانہ ہے اور تمھارا مکر وفریب بہت بڑا ہے۔ یہاں بھی اس نے ایک مطلق اصول بیان کیا کہ تم سب عورتیں ایسی ہی ہوتی ہو، مکر وفریب والیاں اور چالباز، معلوم ہوتا ہے، عورت کا اس پر سخت دباؤ اور تسلط تھا۔ بہر حال یہاں عورتوں کی نفسیات پر جو ایک جارحانہ تبصرہ قرآن نے کیا ہے تو یہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا جامع ہے۔ اللہ رب العزت نے عورتوں کے مکر

کے لیے 'عظیم' کا لفظ کہا جبکہ شیطان کے مکر کے لیے ضعیف کا لفظ استعمال ہوا ہے، شیطان کے متعلق ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴾ [النساء : ٧٦]

''بے شک شیطان کی چال ہمیشہ نہایت کمزور رہی ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی اسی مفہوم میں ہے، اس میں عورتوں کے مکر کی شدت اور کھل کر سامنے آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

((مَا رَاَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ و دِيْنٍ اَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَا كُنَّ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ)) [بخاري، كتاب الزكاة، باب الزكاة على الأقارب : ١٤٦٢]

''(عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے نبی ﷺ نے فرمایا:) میں نے عقل و دین میں تم جیسا ناقص کوئی نہیں دیکھا کہ باوجود عقل و دین میں نقص کے تم میں سے کوئی ایک عورت نہایت دانش مند شخص کی عقل کو بھی ماؤف کر دیتی ہے۔''

بہر حال یہ عورتوں کی نفسیات پر ایک تبصرہ ہے یہاں یہ بھی واضح رہے کہ عورتوں کی انھی خامیوں کی بدولت رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو امورِ حکومت سونپنے والوں کو ناکامی کی وعید سنائی ہے۔

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لَنْ يُفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمُ امْرَأَةً)) [بخاري، كتاب المغازي، باب كتاب النبي ﷺ إلى كسرى و قيصر : ٤٤٢٥]

''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو سکتی جس نے اپنے امور کسی عورت کے سپرد کر دیے۔''

❀❀❀

عزیزِ مصر کی سیدنا یوسف علیہ السلام سے درخواست

﴿يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا ۚ وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ ۖ إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ﴾ ﴿٢٩﴾

"یوسف! اس معاملے سے درگزر کر اور (اے عورت!) تو اپنے گناہ کی معافی مانگ، یقیناً تو ہی خطا کاروں سے تھی۔"

جب معاملے کے تمام خفیہ گوشے اور اسرار کھل کر سامنے آ گئے تو صاف ظاہر ہو گیا کہ یوسف تو پاکباز اور سچے ہیں۔ گناہ اور خطا سب کی سب اسی 'خاتون اول' کی ہے۔ چنانچہ عزیز مصر نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے درخواست کی کہ جناب یوسف آپ اس واقعہ کو طاق نسیاں میں ڈال دیجیے۔ عزت اور غیرت کا مسئلہ ہے اس لیے کہیں اور اس کا تذکرہ نہ کیجیے۔ آپ کا یہ ہمارے ساتھ بہت بڑا تعاون ہوگا عزت و غیرت بے دین معاشروں میں بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ لوگ باخبر نہ ہو جائیں، گناہ کی شدت کا احساس نہیں ہوتا۔ آج بھی اونچے طبقوں میں بے حیائی کے پھیلانے میں مردوں کا بھی کردار ہوتا ہے۔ محض عورتیں ہی قصور وار نہیں۔ پھر اس خاتون سے مخاطب ہو کر کہا کہ تو اپنے اس جرم پر معافی طلب کر۔ یہ معافی اس نے کس سے طلب کرنا تھی؟ شاید اشارہ تھا کہ اپنے خاوند سے اس پر معذرت کر یا شاید یوسف علیہ السلام کی طرف بھی اشارہ ہو کہ اس بے گناہ شخص کو خواہ مخواہ تو نے اس معاملے میں الجھا کر بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے اسے اپنے معبود سے استغفار کرنے کا کہا گیا ہو، وہ توحید پرست تو خیر نہیں تھے اور اس کی دلیل یوسف علیہ السلام کے اس جملے میں موجود ہے جو بعد میں ایک موقع پر کہا گیا، فرمایا:

﴿أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ [یوسف: ۳۹]

"کیا الگ الگ رب بہتر ہیں، یا اللہ جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟"

سدنا یوسف علیہ السلام نا صرف گناہ سے بچ گئے بلکہ اس خاندان کے سامنے الزام گناہ سے

بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کروا دیا۔ یہ سب اللہ رب العزت کی نصرت اور تائید کے نظارے ہیں، جبکہ یہ نصرت ان لوگوں پر نزول کرتی ہے جو اخلاص کے ساتھ گناہ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

❀❀❀

شاہی بیگمات کے عجیب رویے اور تبصرے

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۭ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۰﴾

''اور شہر میں کچھ عورتوں نے کہا عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اس کے نفس سے پھسلاتی ہے، بلاشبہ وہ محبت کی رو سے اس کے دل کے اندر داخل ہو چکا ہے۔ بے شک ہم تو اسے صریح غلطی پر دیکھتی ہیں۔''

گو یوسف علیہ السلام سے گزارش کی گئی تھی کہ واقعہ کا تذکرہ نہ کریں اور انھوں نے ایسا کیا بھی مگر کسی نا کسی طرح بات پھیل گئی۔ اردو کہاوت یہ ہے کہ عشق اور محبت چھپے نہیں رہتے۔ ویسے بھی وہ معاشرہ پرہیز گاروں کا تو تھا نہیں، غیرت وحمیت وہاں نام کو نہ تھی۔ عیب چھپانے اور راز کی حفاظت کرنے کی بجائے اس کے بیان میں فخر محسوس کیا جاتا تھا۔ تو بہرحال مصر کے دارالحکومت میں اس واقعہ کا شور مچ گیا۔ شاہی بیگمات نے عزیز مصر کی بیوی کو طعنوں کی زد پہ رکھ لیا اور انھوں نے مزے لے لے کر یہ قصہ نقل کرنا شروع کر دیا۔

دراصل یہ بھی شیطان ہی کی اکساہٹ پر ایسا ہوتا ہے۔ پہلے وہ کان میں پھونکے گا کہ تو گناہ کر لے کون دیکھنے والا ہے۔ ذہن میں ایسے ہی خیالات پیدا کر کے وہ گناہ پر جرأت دلاتا ہے پھر جب انسان گناہ کر بیٹھتا ہے تو وہ ڈھنڈورہ پیٹنا شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہر مصر میں چرچے ہونے لگتے ہیں دیکھو جی! یہ عورت تو بالکل ہی گئی گزری ثابت ہوئی، اسے کوئی آزاد اور باوقار شخص نہیں ملا تھا کہ اپنے غلام پر فریفتہ ہوگئی۔ اس کے دل میں تو اپنے غلام کی

محبت بیٹھ گئی ہے، اسے اب اس کی محبت کے ماسوا کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سجھائی پڑتا ہے۔ خواتین مصر کہنے لگیں: ''ہم تو اسے کھلی گمراہی میں دیکھتی ہیں۔''

یہاں سے مصر کے اس معاشرے کی اک تصویر سامنے آتی ہے کہ وہ کس قدر حیا باختہ اور بے حمیت معاشرہ تھا۔ یہاں عزیز مصر کی بیوی کی غلطی یہ نہیں قرار دی جا رہی کہ وہ ارتکاب گناہ پر آمادہ ہوگئی تھی، نہیں بلکہ غلطی یہ گردانی جا رہی ہے کہ اس نے ایک غلام کا انتخاب کیوں کیا؟ طعن تشنیع ارتکاب زنا پر نہیں انتخاب غلام پر ہے۔ العیاذ باللہ۔

❀❀❀

پھلوں کی بجائے ہاتھ کٹنے لگے......!

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَيْهِنَّ وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّيْنًا وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَيْنَهٗٓ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ۭ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿٣١﴾

''تو جب اس عورت نے ان کے فریب کے بارے میں سنا تو ان کی طرف پیغام بھیجا اور ان کے لیے ایک تکیہ دار مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کو ایک چھری دے دی اور کہا ان کے سامنے نکل۔ پھر جب انھوں نے اسے دیکھا تو اسے بہت بڑا پایا اور انھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور کہا اللہ کی پناہ! یہ کوئی آدمی نہیں ہے، یہ نہیں ہے مگر کوئی نہایت معزز فرشتہ۔''

ظاہر ہے یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح پھیلی تو اس پر ہونے والے تبصرے اور تجزیے بھی عزیز مصر کی بیوی کو موصول ہونے لگے۔ اس نے یہ سارا پروپیگنڈا سنا اور جب دیکھا کہ زور اس بات پر ہے کہ وہ ایک غلام کی محبت میں کیوں گرفتار ہوگئی ہے تو اس نے اس کا جواب دینے کا فیصلہ کیا، اس کے لیے اس نے باقاعدہ منصوبہ بنایا اور ایک دعوت ترتیب دی۔ جس کا مقصد دراصل معتوب ٹھہرانے والی عورتوں کو یوسف علیہ السلام کے حسن بے مثال کی

ایک جھلک دکھانا تھی۔ آپ اس معاشرے کے اخلاقی زوال پر غور کیجیے کہ خاتونِ مصر دیگر بیگمات کی اپنے متعلق غلط فہمی دور کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے انتخاب کی برتری ثابت کرنے کے لیے اس دعوت کا اہتمام کرتی ہے۔

دعوت کا اس نے نہایت تزک و احتشام اور شان و شوکت سے انتظام کیا۔ مسند لگائی گئی اور اس پر تکیے جمائے گئے انواع و اقسام کے پھل تیز چھریوں سمیت سجا دیے گئے۔

یہاں ایک بات غور کرنے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ اس تفصیل سے کیوں بیان کر رہا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یوسف کی فضیلت کا اثبات اور اس کی استقامت کے احوال کا بیان ہے کہ باوجود اس کے کہ پورا معاشرہ ہی گندہ تھا۔ برائی معیوب اور بے حیائی معتوب نہ تھی اس کے باوجود یوسف علیہ السلام نے اپنا دامن عصمت بچایا تو وہ یقیناً تحسین کے لائق ہے۔ نیز ثابت ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے کردار کی حفاظت پر جم کر کھڑا ہو جائے تو پھر بگڑے سے بگڑا معاشرہ بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تو اسی غرض سے قرآن مصری کلچر کی ایک تصویر ہمارے سامنے لاتا ہے۔

مجلس قائم کر دی گئی۔ دسترخوان چن دیے گئے اور خواتین آ گئیں تو یوسف علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ باہر نکلو۔ سیدنا یوسف علیہ السلام اس خاتون کے فاسد خیالات سے بے خبر باہر نکلے۔ جونہی ان حیا باختہ خواتین کی نظر سیدنا یوسف علیہ السلام کے مقدس چہرے سے ٹکرائی۔ ان سب کی سٹی گم ہو گئی۔ انھوں نے یوسف علیہ السلام کو بہت برگزیدہ تصور کیا۔ اس قدر حسن و جمال اور اس پر پاکیزگی کے نور کا تقدیس بھرا ہالہ انھوں نے کب دیکھا ہو گا۔ سو دیکھتے ہی بے اختیار ہو گئیں۔ حواس گم ہو گئے اور ان کی عقل ماؤف ہو کے رہ گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس بات سے بے خبر ہی رہیں کہ پھلوں پہ چلنے والی چھری ان کے اپنے ہاتھوں پر چل چکی ہے اور یوں انھوں نے اپنے اپنے ہاتھ کاٹ لیے، یہ حیرت کا اتنا شدید جھٹکا تھا کہ بے اختیار ہو کر کہنے لگیں: ''یہ انسان تو ہرگز نہیں، یہ تو کوئی معزز فرشتہ ہے۔''

سوال یہ ہے کہ انھوں نے یوسف علیہ السلام کو فرشتہ کیوں قرار دیا۔ شاید اس لیے کہ جب کسی

کے ملکوتی حسن کو تشبیہ دینا ہو تو ہم اسے فرشتہ قرار دیتے ہیں اور جب کسی چیز کی انتہائی قباحت بیان کرنا مقصود ہو تو ہم اسے شیطان جیسا کہہ دیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یوسف نے اس قدر غلیظ معاشرے، ان عورتوں کی کھلی بے حیائی اور واضح دعوت کے باوجود اپنی نظریں جھکا کے رکھیں اور آپ کے مقدس رخ تاباں سے پاکیزگی کے سوا انھیں کچھ محسوس نہ ہوا تو وہ بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ انسان نہیں یہ تو کوئی فرشتہ ہے کہ ہوا و ہوس اور شہوتِ بے جا جسے چھو کر بھی نہیں گزری۔

غور کیجیے! یہاں اس معاشرے کا تذکرہ ہے، جہاں برائی عام تھی اور ماحول پراگندہ تھا۔ یہاں کوئی اصلاح کارنہ تھا۔ ایسے معاشرے میں ایک تنہا شخص نے نا صرف اپنی عصمت کو محفوظ رکھا، اپنے ایمان کی حفاظت کر کے دکھائی بلکہ پھر اپنے اسی پختہ، کردار کی وجہ سے پورے معاشرے کو بدل کے رکھ دیا۔ یہی عظمت کردار ہے جس کی بدولت اللہ رب العزت نے پھر اسی مصر کے تاج وتخت کا وارث بنا دیا کہ جس کے گلی کوچوں میں کبھی بطور غلام اس کی بولی لگی تھی۔ چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا کردار ہمارے لیے ایک زریں مثال اور کچھ کر گزرنے والوں کے لیے ایک بہترین راہ عمل ہے، یہاں سے یہ بھی آشکار ہوتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح وہی کر سکتا ہے خود جس کا اپنا دامن آلودہ نہ ہو اور خود جس کا اپنا کردار ہیرے کی طرح ٹھوس اور بے عیب ہو۔ کردار کی پاکیزگی ہی اس کی خوبصورتی ہے۔

❀❀❀

یوسف علیہ السلام کو جیل کی دھمکی

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ ۭ وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ۭ وَلَىِٕنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ؀۳۲

”عورت نے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم نے مجھے ملامت کی تھی اور بلاشبہ یقیناً میں نے اسے اس کے نفس سے پھسلایا، مگر یہ صاف بچ گیا اور

واقعی اگر اس نے وہ نہ کیا جو میں اسے حکم دیتی ہوں تو اسے ضرور ہی قید کیا جائے گا اور یہ ضرور ہی ذلیل ہونے والوں سے ہو گا۔“

اب جب عزیز مصر کی خاتون اول نے اپنا مقصود حاصل کر لیا۔ یعنی جس عار کی وہ مستحق گردانی گئی تھی اس کا اس نے ازالہ کر دیا۔ بتا دیا کہ گو گردشِ حالات نے اس نوجوان کو غلامی میں پھنسا دیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس جیسا خوبرو اور خوش شکل نوجوان سرزمین مصر کیا شاید پورے تختہ عالم پہ بھی نہ ملے گا۔ اس نے جب یہ منظر دیکھ لیا کہ ”ایک غلام پہ مرمٹی“ کہنے والیاں کٹی انگلیاں لیے خود اس کے سحر کا شکار ہوئی بیٹھی ہیں تو کھل کے اعلان کر دیا کہ دیکھ لو یہی ہے وہ کنعانی نوجوان جس کے باعث تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔ انسان جب کوئی کامیابی حاصل کر لیتا ہے تو اس کا اعتماد اور پختہ ہو جاتا ہے۔ شاید یہ وجہ تھی یا پھر یہ کہ وہ عورت تھی ہی اتنی بے باک کہ برسرعام کہنے لگی کہ ہاں میں نے اسے پھسلایا تھا۔ بڑی چالبازی سے منصوبہ بنایا تھا مگر یہ اس سے بچ نکلا مگر میں اسے چھوڑوں گی ہرگز نہیں۔ اگر اس نے میری خواہش پوری نہ کی تو پھر یہ میری محبت کی بجائے نفرت وعداوت کا مزا چکھے گا۔ میں اسے جیل میں پھینکوا دوں گی جہاں یہ اصل غلامی اور اسیری کے ذائقے محسوس کرے گا۔ سب اعزاز واکرام اور عیش وآرام اس سے چھن جائے گا۔ گویا اس مجلس دعوت سے اس نے اپنے تمام مطلوبہ مقاصد حاصل کر لیے۔ پروپیگنڈے کا توڑ کر لیا۔ شاہی بیگمات کو اپنا ہم نوا بنا لیا۔ بتا دیا کہ اگرچہ کنعانی نوجوان ایک غلام ہے مگر پھر بھی لاجواب ہے۔ علاوہ ازیں یوسف علیہ السلام پر بھی اپنا آئندہ لائحہ عمل واضح کر دیا۔ اب یوسف علیہ السلام دیکھتے ہیں کہ ان کے گرد گھیرا مزید تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

❀❀❀

عصمت گنوانا نہیں، جیل جانا قبول ہے

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ ۚ وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّيْ كَيْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَيْهِنَّ وَاَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٣﴾

''اس نے کہا اے میرے رب! مجھے قید خانہ اس سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ سب مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو مجھ سے ان کے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں سے ہو جاؤں گا۔''

جب یوسف علیہ السلام کے سامنے حالات اور زیادہ واضح ہو گئے۔ خاتونِ اول کا اپنے مذموم مقاصد پر انھوں نے راسخ عزم دیکھا اور دیکھا کہ زنانِ مصر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہیں اور اب حالات کٹھن سے کٹھن تر ہوتے جاتے ہیں۔ جب انھوں نے ملاحظہ کیا کہ خاتون اول کی ناراضگی کا صاف مطلب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی ہے۔اس سے بچاؤ کا جو ایک راستہ ہے وہ خاتون کی خوشنودی ہے مگر اس میں ایک حرام کام کا ارتکاب اور رب کائنات کی ناراضگی پنہاں ہے تو اس پریشانی کے عالم میں یوسف نے اپنے سوہنے رب سے فریاد کی کہ ''اے اللہ! اگر اب زنا یا قید میں سے کسی ایک کا انتخاب لازم ہی ہے تو پھر مجھے ارتکاب حرام کی نسبت جیل کی زندگی زیادہ محبوب اور زیادہ عزیز ہے۔'' دراصل یہ احساس کی شدت ہے۔ احساس کی وہ شدت جو غلط ماحول اور گندے معاشرے میں ایک نیک سرشت اور پاک طینت افراد میں پیدا ہوتی ہے۔سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل میں بس یہی آرزو بسی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس خاتون کے چنگل سے نکل جاؤں۔ آخر انسان ہوں اللہ کی توفیق شامل حال نہ ہوئی تو کہیں پھسل ہی نہ جاؤں، یہی سوچ اور پریشانی ہے جس کے باعث زبان سے یہ الفاظ نکل پڑتے ہیں کہ مجھے ان عورتوں کی تمنا کی تکمیل کی نسبت جیل زیادہ محبوب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اگر یوسف یہ کہتے کہ اے اللہ! مجھے عافیت دے تو اللہ انھیں عافیت دے دیتے لیکن شدید پریشانی میں ان کی زبان سے نکل گیا کہ ''مجھے قید زیادہ عزیز ہے۔'' سو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ تدبیر پیدا فرما دی۔

یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ عافیت ہی کا سوال کرنا چاہیے۔ انکساری دیکھیے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ اگر تو نے توفیق نہ دی، تو نے دفاع کی قوت نہ بخشی اور تیرا کرم شامل

حال نہ رہا تو میں بچ نہیں پاؤں گا۔ یہ عاجزی اور کمزوری کا اظہار ہے اور ایک مومن کو رب کے حضور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی دعائیں دیکھیے ان میں سے ہمیشہ عاجزی جھلکتی نظر آئے گی۔ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی ہیبت وسطوت اور فضیلت وشان دیکھتے ہیں اور دعائیں ملاحظہ کرتے ہیں تو آنکھیں اشکبار ہونے لگتی ہیں، مثلاً غزوہ احد کے موقع پر صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے پیچھے صفیں بنائے کھڑے تھے اور آپ ﷺ اپنے رب کے حضور یوں دعائیں فرما رہے تھے:

اے اللہ! ساری تعریفیں تیرے لیے۔

اے اللہ! تو جس کے لیے فراخی پیدا کر دے اس فراخی کو کوئی سکیڑ نہیں سکتا۔

اے اللہ! جس شخص کے لیے تو تنگی پیدا کر دے اس تنگی کو کوئی دور نہیں کر سکتا۔

اے اللہ! جسے تو گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

اے اللہ! جسے تو ہدایت سے نواز دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا۔

اے اللہ! جس شخص سے تو کوئی نعمت روک لے اسے کوئی عطا نہیں کر سکتا۔

اے اللہ! جس کو تو عطا کر دے اسے کوئی روک نہیں سکتا۔

اے اللہ! جس کو تو اپنے سے دور کر دے اسے کوئی تیرے قریب نہیں کر سکتا۔

اے اللہ! جس کو تو قریب کر لے اسے کوئی تیرے سے دور نہیں کر سکتا۔

اے اللہ! ہم پر اپنی برکتیں پھیلا دے۔

اے اللہ! اپنی رحمتیں سایہ فگن کر دے۔

اے اللہ! اپنے فضل کا سائبان بنا دے۔

اے اللہ! اپنے رزق کی کشائش کر دے۔

اے اللہ! تجھ سے ایسی نعمت کا سوالی ہوں جو سدا برقرار رہے، نہ ہٹنے کا نام لے اور نہ ٹلنے پائے۔

اے اللہ! کوئی فقیری کا دن آجائے تو مدد کا سوالی ہوں۔

اے اللہ! کوئی خوف کا دن آجائے تو امن کا بھکاری ہوں۔

اے اللہ! تو نے جو کچھ ہمیں دیا ہے اس کے نقصان سے میں تیری حفاظت مانگتا ہوں۔

اے اللہ! جو ہمیں عطا نہیں فرمایا اس کے شر سے بھی آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اے اللہ! ایمان کو ہمارا محبوب بنا دے۔

اے اللہ! اسے ہمارے دلوں کا حسن بنا دے۔

اے اللہ! ناشکری سے ہمیں نفرت دلا دے۔

اے اللہ! حق سے ہٹنے اور نافرمانی کرنے کو ناپسند بنا دے۔

اے اللہ! ہدایت والے لوگوں میں ہمیں شامل فرما دے۔

اے اللہ! ہم مریں تو مسلمان ہو کر۔

اے اللہ! اگر زندہ رہیں تو فرماں بردار ہو کر۔

اے اللہ! اخروی ملاقات کریں تو نیکو کاروں سے۔

اے اللہ! نہ ہم رسوائیوں میں پڑیں اور نہ فتنوں سے دوچار ہوں۔

اے اللہ! کافروں کو ہلاک کر، جو تیرے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں۔

اے اللہ! انھیں برباد کر کہ جو تیرے راستے سے روکتے ہیں۔

اے اللہ! ان کو دھمکا اور ان پر اپنا عذاب مسلط فرما۔

اے اللہ! اے معبود برحق! ان کافروں کو بھی تباہ و برباد کر جن کو تو نے کتاب دی ہے۔

[مسند أحمد : ٤٢٤/٣ ح : ١٥٤٩٨ و إسناده صحيح]

انسان کے لائق عاجزی ہی ہے دراصل اللہ تعالیٰ ہی تمام تر قوتوں کا مالک ہے سو بڑائی، کبریائی اور تکبر اسی کو روا ہے۔ انسان جب تکبر اختیار کرتا ہے تو صرف اپنی رسوائی ہی میں اضافہ کرتا ہے۔ دیکھیے صحابہ کے مبارک عہد میں، عین میدانِ قتال میں اک ذرا سا تصور اس چیز کا آیا تھا تو منظر کچھ کا کچھ ہو گیا تھا۔ قرآن مجید یکھیے :

﴿ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا

رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ﴾ [التوبة : ٢٥]

''حنین کے دن بھی، جب تمھاری کثرت نے تمھیں خود پسند بنا دیا، پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور تم پر زمین تنگ ہوگئی، باوجود اس کے کہ وہ فراخ تھی، پھر تم پیٹھ پھیرتے ہوئے لوٹ گئے۔''

سو ہمیں بکثرت پڑھتے رہنا چاہیے:

« لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ »

''نہیں ہے کوئی طاقت، برائی سے بچنے کی اور نہ کوئی قوت نیکی کرنے کی مگر عظیم اللہ کی توفیق کے ساتھ۔''

یہ بھی اللہ رب العزت کے حضور اپنی عاجزی اور ناتوانی کا ایک عمدہ اظہار ہے۔ اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کا یہی وتیرہ ہوا کرتا ہے سو یوسف علیہ السلام اسی اسلوب اور اسی پیرائے میں رب سے فریاد کرتے ہیں کہ اگر تیری نظر خاص نہ ہوئی تو میں باوجود علم کے جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔

❀❀❀

دعا قبول ہوئی اور جیل کا دروازہ کھل گیا

فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٤﴾

''تو اس کے رب نے اس کی دعا قبول کر لی، پس اس سے ان (عورتوں) کا فریب ہٹا دیا۔ بے شک وہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اللہ رب العزت نے یوسف کی دعا قبول فرما لی۔ انھوں نے خاتون کی گفتگو سنی تھی کہ یا تو یہ میری مانے گا یا جیل جائے گا۔ یوسف علیہ السلام نے شدید پریشانی میں یہی جانا کہ وہ جیل چلے جائیں یہ بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے دامن عصمت کو تار تار کر لیں۔ سو انھوں نے رب کے حضور دست سوال دراز کر دیے کہ اے رب کائنات! اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو

پھر مجھے جیل عزیز ہے۔ اللہ رب العزت نے دعا قبول فرما لی۔ ان چالباز، مکار اور بدکار عورتوں سے یوسف کو خلاصی دے دی۔ یوسف علیہ السلام گناہ سے بچ گئے۔ مگر اب اپنی ہی دعا کی قبولیت کے باعث قیدی کی حیثیت اختیار کر گئے۔

«اِنَّهٗ هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ» : یہاں یہ بات بہت سمجھنے کی ہے کہ ایک نبی بھی اگر کسی مشکل میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے ہاتھ اسی رب کے حضور اٹھتے ہیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ ہمارے لیے یقیناً اس میں نمونہ ہے۔ یہی توحید کا اصل ہے کہ مصیبت ہو یا خوشی نگاہیں اسی رب کے عرش کے طواف کو اٹھیں۔ سوچیں اسی محور کے گرد گردش کریں۔ اس لیے کہ وہی سننے والا اور تمھارے حالات جاننے والا ہے۔ چنانچہ اس سمیع و علیم نے یوسف کی دعا قبول فرمالی۔

❀❀❀

جرم بے گناہی کی سزا، اک مدت تک قید و بند

ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا رَاَوُا الْاٰيٰتِ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿۳۵﴾

”پھر اس کے بعد کہ وہ کئی نشانیاں دیکھ چکے، ان کے سامنے یہ بات آئی کہ اسے ایک وقت تک ضرور ہی قید کر دیں۔“

عزیز مصر کو یہ خوب معلوم ہو گیا تھا کہ یوسف ہرگز قصور وار نہیں، سارا قصور اس کی اپنی زوجہ کا ہے۔ یوسف کی معصومیت اور پاکباز زندگی، جھکی نظریں اور حیا بھری آنکھیں، سیدنا یوسف علیہ السلام کے حق میں چھوٹے بچے کی انوکھی گواہی اور پھر قمیص کا پیچھے سے پھٹا ہونا یہ سارے دلائل عزیز مصر کو سمجھا رہے تھے کہ یوسف نہیں اس کی بیوی قصور وار ہے۔

تاہم اس سب کے باوجود اس نے یہی فیصلہ کیا کہ یوسف کو جیل بھیج دیا جائے۔ اس کے پیچھے خود اس کی بیوی کا بھی اصرار ہو سکتا ہے کیوں کہ یوسف علیہ السلام کی تقریب رونمائی میں وہ اپنی اس مذموم خواہش کا اظہار کر چکی تھی کہ اگر اس نے میری خواہش کا احترام نہ کیا تو

جیل بھجوا کر دم لوں گی۔ معلوم ہوتا ہے اسی نے عزیز مصر کے کان بھرے کہ بات تو کو بہ کو پھیل چکی ہے اور آنے والا ہر لمحہ ہماری رسوائی میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اگر یوسف یونہی آزاد پھرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ قصوروار تمھاری بیوی ہے لہٰذا اسے جیل بھیج دو تاکہ لوگوں کے منہ بند ہو جائیں اور معلوم ہو کہ قصوروار یوسف ہی تھا۔

یہ بات عزیز مصر کے دل کو لگی اور اس نے یہی مناسب جانا کہ ایک طویل مدت یوسف علیہ السلام کو جیل بھیج دیا جائے تاکہ یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کو جیل بھیج دیا گیا، کتنا عرصہ؟ مفسرین نے خیال آرائی کی ہے بعض نے بارہ سال کا عرصہ بتایا ہے لیکن فی الاصل صحیح مدت قرآن میں کہیں مذکور نہیں۔

اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضروری نہیں مجرم اور خطا کار ہی جیل جائیں۔ کبھی بے گناہ اور معصوم لوگ بھی جیل چلے جاتے ہیں۔ محض جیل جانے سے کسی کا گناہ گار ہونا ثابت نہیں ہوتا اور یہ بھی سبق ملا کہ اگر کہیں ایسا معاملہ درپیش ہو تو واویلا نہیں کرنا چاہیے اور جزع فزع نہیں کرنی چاہیے۔ تحمل سے یہ وار بھی سہہ لینے چاہییں۔ یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ اس میں بھی رب کی کوئی مصلحت پنہاں ہے۔ ممکن ہے جیل جانا ہی ہمارے حق میں بہتر ہو۔ باہر رہ جائیں تو کوئی غلط کام کر بیٹھیں ممکن ہے اسی سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں دور کر دیا ہو اور ہمارا ایمان بچا لیا ہو، ایسے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی یہ دعا لب و دہن پر رہنی چاہیے:

((قَدَّرَ اللّٰهُ مَا شَاءَ فَعَلَ))

[مسلم، كتاب القدر، باب الإيمان بالقدر ...... الخ : ٢٦٦٤]

”کہ جو اللہ نے میرے مقدر میں کیا تھا وہی ہوا ہے۔“

بہر حال قصہ یوسف اس مرحلے میں آ پہنچا کہ یوسف علیہ السلام کے جیل جانے کے انتظامات گویا مکمل ہو گئے۔

❀❀❀

قیدی خواب دیکھتے ہیں

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَ قَالَ الۡاٰخَرُ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡکُلُ الطَّیۡرُ مِنۡهُ ؕ نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِیۡلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىکَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۳۶﴾

''اور قید خانے میں اس کے ساتھ دو جوان داخل ہوئے، دونوں سے ایک نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ کچھ شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا بے شک میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر کچھ روٹی اٹھائے ہوئے ہوں، جس سے پرندے کھا رہے ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتا۔ بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے نا کردہ گناہ کی پاداش میں اور عزیز مصر کی عزت کی بھینٹ چڑھ کر جیل چلے گئے، جیسا کہ قرآن مجید بتا رہا ہے ان کے ساتھ دو اور نوجوان بھی جیل داخل ہوئے۔ یہ دونوں بادشاہ کے خاص مصاحب تھے۔ ان میں سے ایک تو بادشاہ کا ساقی تھا یعنی اسے شراب نچوڑ نچوڑ کر پلایا کرتا تھا جبکہ دوسرا بادشاہ کا باورچی تھا۔ یہ دونوں بھی یوسف علیہ السلام کی معیت میں تھے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا کہ یہ دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے اور مقدمہ ابھی زیر تحقیق تھا سو جیل بھیجے گئے۔

جانے کتنا عرصہ بیت گیا ہو گا جب ایک دن دونوں نے خواب دیکھے۔ اب انھوں نے یوسف علیہ السلام سے گزارش کی کہ ان کے خواب کی تعبیر کر دی جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کیونکر معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تعبیر بتا دینے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ شاید انھوں نے یوسف علیہ السلام کی حلیمی بزرگی اور فراست وعلم کا مشاہدہ کیا ہو گا کیونکہ ساتھ رہ کر جیل میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی عبادت اور اللہ سے تعلق اور اخلاق کو دیکھا ہو گا اللہ سے تعلق رکھنے والا ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے، لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ خود یوسف علیہ السلام نے انھیں پریشان

دیکھا تو دریافت کر لیا ہو گا۔ بہرحال انھیں کسی طرح آپ کی یہ صفت معلوم ہو گئی تو انھوں نے خواب کی تعبیر بتانے کی درخواست کی۔ ایک نے بتایا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب نچوڑ نچوڑ کر پلا رہا ہوں، دوسرا کہنے لگا، میں نے خواب میں دیکھا کہ سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے نوچ نوچ کر روٹیاں کھا رہے ہیں۔ براہِ کرم آپ ہمیں اس اس کی تعبیر بیان کر دیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بڑے احسان کرنے والے اور نیک شخص ہیں، اس تناظر میں آپ سے درخواست کر رہے ہیں اس امید پر کہ آپ ضرور ہماری یہ پریشانی دور فرمائیں گے۔

❀❀❀

خواب کی تعبیر اور توحید کا وعظ

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

”اس نے کہا تمھارے پاس وہ کھانا نہیں آئے گا جو تمھیں دیا جاتا ہے، مگر میں تمھیں اس کی تعبیر اس سے پہلے بتا دوں گا کہ وہ تمھارے پاس آئے۔ یہ اس میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا۔ بے شک میں نے اس قوم کا دین چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے ساتھ بھی کفر کرنے والے ہیں۔“

یہاں آپ دیکھیں گے کہ یوسف علیہ السلام نے فی الفور تعبیر بیان کرنا شروع نہیں فرما دی بلکہ اولاً کچھ دوسری گفتگو کی، کیوں؟ اس کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سب سے پہلے ایک پیغمبر تھے، یعنی دین کے داعی! دعوت جن کے نزدیک ہر امر اور ہر کام سے مقدم ہوتی ہے۔ پیغمبر جو لوگوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہوتا ہے اس کے ہاں لوگوں کی عاقبت کی بہتری اور آخرت کی نجات ہمیشہ دنیاوی اصلاح سے مقدم ہوتی ہے۔ سو

اب چونکہ وہ دونوں اپنی غرض سے آپ کے حضور سماعت کے لیے تیار بیٹھے تھے سو لازم تھا کہ انھیں حرفِ حق سے بھی روشناس کروا دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ خواب کی تعبیر سے جان چکے تھے کہ ان میں سے ایک ضرور موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ظاہر ہے یہ کوئی اچھی خبر نہ تھی کہ اسے فی الفور سنا دیا جاتا، سو آپ نے پہلے دیگر مگر مفید ترین باتیں کیں اور ہلکے ترین پیرائے میں اس خوفناک خبر کو اس تک منتقل کیا۔ ممکن ہے یہ بھی آپ کے پیش نظر ہو کہ اس نے مرنا تو ہے ہی کیوں نہ دعوت توحید دی جائے تو کیا عجب کہ ساری زندگی کفر کرنے والا وقت آخر اسلام پر جان دے کر جنت کا مہمان ہو جائے۔ پھر اس میں مزید پیغمبرانہ شفقت دیکھیے کہ گو آپ صاف جانتے تھے کہ مرنا کس نے ہے اور چھوٹنا کس نے ہے مگر اس بات کو مبہم رکھا، یہ حکیمانہ انداز ہے تا کہ دونوں دعوت کو غور سے سمجھیں۔

اولاً آپ علم وحی کی برتری اور اس کے قطعی ہونے کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ علم مجھے اللہ رب العزت نے عطا فرمایا ہے اور دنیا جہاں کے علم جھٹلائے جا سکتے ہیں مگر وحی کا علم نہیں۔ دنیا بھر کے علم راہِ صواب سے ہٹ سکتے ہیں مگر وحی کا علم کسی صورت نہیں۔

اب جب سننے والوں کا جذبہ سماعت اشتیاق وشوق میں ڈھل گیا۔ گفتگو کے قلیل ہونے کی یقین دہانی کروا دی گئی اور انھیں ان کے مدعا کے بدرجہ اتم پورا ہونے کا بھی یقین ہو گیا تو ایک داعی اپنے ازلی مشن پر گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ عقیدہ کی اصلاح کی طرف دھیان دیتا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

«تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ»: ساتھیو! دیکھو، یہاں جو عقیدہ رائج ہے، جو دین لوگوں میں چل رہا ہے، سن لو کہ میں اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ میں اس عقیدہ اور اس کے تمام تر نظریات کو چھوڑ چکا ہوں۔ پوچھنے والے بھی ظاہر ہے اسی ملت و دین سے تعلق رکھتے تھے گویا انھیں باور کروایا کہ دیکھو اگر تم مجھ سے مکمل فائدہ چاہتے ہو تو وہ تبھی ہو گا جب

تم بھی مجھ جیسا عقیدہ اختیار کر لو گے۔ دیکھو مجھے یہ علم میرے رب نے دیا ہے میں اس کی روشنی میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ رب کے منکر ہونے اور آخرت پر ایمان نہ لانے کے سارے عقیدے باطل ہیں، سو میں اس دنیائے جہاں کو چھوڑ چکا اور ایسے تمام باطل عقائد سے منہ موڑ چکا ہوں۔

اپنی اور اپنی دعوت کی پہچان پر مشتمل اس مختصر مگر جامع تمہید کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام ان لوگوں کے سینے توحید کے نور سے منور کرتے ہیں۔

❁❁❁

داعی توحید کا جیل میں اعلانِ حق

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

”اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی ہے، ہمارے لیے ممکن ہی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ ہم پر اور لوگوں پر اللہ کے فضل سے ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

اب ایک توحید و تشکر بھرا خطبہ شروع ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! قربان جائیے نبوت کے مقدس اخلاص پر کہ یوسف علیہ السلام خود ناکردہ جرم کی سزا جھیلتے پسِ دیوارِ زنداں پڑے ہیں۔ جیل کے تاریک شب و روز ہیں۔ سامنے دو قیدی بیٹھے ہیں۔ کیا منظر اور کیا پس منظر ہے۔ مگر آفریں ہے کارِ نبوت کے اخلاص پر کہ اسے جہاں موقع ملتا ہے، وعظ، نصیحت اور توحید کا اعلان نہایت درد سے شروع کر دیا جاتا ہے۔

یہ پہلا موقع ہے جب یوسف علیہ السلام نے باقاعدہ اعلان کیا کہ ان کا تعلق اس ملت کفر سے نہیں بلکہ وہ تو خاندانِ نبوت کی تقدس مآب لڑی کے اک دمکتے موتی ہیں۔ گویا انھوں نے

بتایا کہ میرے اس حکمت بھرے وعظ کو کہیں کسی دیوانے کی بات نہ سمجھ لینا۔ اس میں کہانت کے چکر اور نجومیوں کے مکر بھی نہیں ہیں، بلکہ اس علم کا منبع و ماخذ وحی الٰہی کا صاف شفاف چشمہ ہے۔ بتایا کہ میں اپنے آباؤ اجداد سیدنا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی ملت توحید پر کاربند شخص ہوں۔ آباؤ اجداد سے ہم نے وراثت میں رب کی توحید پر ایمان اور اس کی یکتائی کا بیان پایا ہے۔ یہ بات ذہنوں میں نقش کر لو کہ میرا تعلق نورِ توحید کے علمبرداروں سے ہے، وہ جو رب کو جانتے بھی تھے اور مانتے بھی تھے۔ وہ آخرت پر ایمان رکھ کر حیاتِ دنیوی کے شب و روز بسر کرنے والے لوگ تھے۔ خاندانِ نبوت پر مشتمل یہ ہے میرا قبیلہ! تو پھر یہ تو ہمارے لائق ہی نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ شرک کریں۔ یہ توحید کے داعی کا ایک شیریں بیان ہے۔

یہاں سے اسلوب دعوت بھی سیکھنا چاہیے۔ وہ جو چھوٹتے ہی مخاطب کو جہنم میں دھکا دے دیتے ہیں دیکھیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان مشرک قیدیوں کو یہ نہیں کہا کہ تم کافر و مشرک ہو، تم بدعتی ہو، اہل دعوت جان لیں کہ اگر وہ یوں کریں گے تو دعوت کوئی نہ مانے گا، سو یوسف علیہ السلام کہتے ہیں یہ تو ہمارے شایان شان ہی نہیں کہ شرک کی نجاست سے آلودہ ہوتے پھریں۔ توحید تو نور ہے پھر نور کی اہمیت جاننے والا کیونکر شرک کے اندھیاروں میں بھٹکنا گوارا کرے گا۔ سو ہم ذرہ بھر شرک نہیں کرتے ﴿مِنْ شَيْءٍ﴾ کے الفاظ سے صراحت فرما دی کہ شرک کے بہت سے انداز اور بہت سے پہلو ہیں۔ کوئی آگ کا پجاری ہے تو کوئی بتوں کا پرستار ہے۔ بہر حال ہر طرح کے شرک سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔

«ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ»: مزید فرمایا کہ اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں، یہ خالص اللہ کا فضل ہے۔ اس کی عنایت اور مہربانی ہے۔ اگر ہم لوگ شرک سے محفوظ ہیں تو یہ مالک کی توفیق ہے وہ جسے نواز دے۔ ہدایت تو وہ بیش بہا خزانہ ہے جس کی کنجیاں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہی دست مبارک میں رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دنیا تو بہت غلط اور نہایت کم ظرفوں کو بھی

دے دیتا ہے مگر ہدایت بہت خاص اور صرف اپنے محبوب لوگوں ہی کو دیتا ہے لیکن لوگ اس دولتِ خداوندی اور نعمتِ الٰہی کا شکر نہیں کرتے۔ بہت سے کم فہم تو وہ ہیں جو اس کو نعمت ہی نہیں سمجھتے، وہ بس دولت، گاڑی، گھر اور دنیاوی مقاصد کو للچائی نگاہ سے دیکھتے رہیں گے۔ ساری دوڑ دھوپ صرف حصولِ دنیا کے لیے کرتے رہیں گے۔ دین اور توحید ان کے نزدیک نا قابل ذکر چیز ہے۔ انھیں اس کی اہمیت وفضیلت کی خبر ہی نہیں، دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو خود کو دانشور کہتے ہیں مگر بصیرت انھیں چھو کر بھی نہیں گزری۔

اگر اللہ تعالیٰ نے دین دے رکھا ہے۔ نماز روزے اور صوم وصلوٰۃ کی توفیق دے رکھی ہے تو اس پر رب کا بہت شکر ادا کرنا چاہیے۔ دوستو، یاد رکھو! کائنات میں اس سے قیمتی کوئی دوسری چیز نہیں جو رب تمھیں عطا کرتا، رہی دنیا تو اس کی وقعت رب کے ہاں ایک مچھر کے پر جتنی بھی نہیں، وہ اسے کافروں کو زیادہ دیتا ہے تا کہ یہ چند روزہ زندگی میں اس کے عادی ہو جائیں اور پھر آخرت میں اس کی محروی کے عذاب چکھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کچھ نعمتیں نہیں بھی دی ہیں تو اطمینان رکھو کہ رب تمھیں یہ آخرت کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی میں دے گا۔ توحید، وہ جو حیاتِ اخروی کی دائمی نعمتوں کی کنجی ہے، اللہ نے تمھیں ابھی دے دی ہے تو چہرے شاداب رکھو اور لب پہ کلمہ شکر لاؤ۔ افسوس اکثر لوگ شکر سے غافل رہتے ہیں اور وہ دوسری طرف نعمت کی حفاظت اور اس میں اضافے کی سوچوں میں غرق رہتے ہیں۔ اس کا سب سے آسان اور تیر بہدف نسخہ کیا ہے؟ کہ شکر کرتے رہو، رب کا وعدہ ہے:

﴿ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ﴾ [ابراهيم : ١٤]

”بے شک تم شکر کرو گے تو میں ضرور تمھیں زیادہ دوں گا۔“

لیکن لوگ کم ہی ایسا کرتے ہیں اور قرآن بجا طور پر فرماتا ہے:

﴿ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴾ [البقرة : ٢٤٢]

”اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔“

❀❀❀

ایک اللہ بہتر ہے یا کئی الٰہ؟

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٣٩﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٠﴾

”اے قید خانے کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت زبردست ہے؟ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

سیدنا یوسف علیہ السلام کا خطابِ توحید جاری ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام مخاطبین کو اپنے قریب اور مانوس کرنے کے لیے ایسے حوالے سے مخاطب فرما رہے ہیں جو دونوں کے مابین مشترک ہے۔ دلائل دیے جا رہے ہیں، سوچ بیدار کی جا رہی ہے اور دراصل داعی کے لیے یہی کرنے کا کام ہے۔

دراصل لوگوں کے ذہن جامد کر دیے جاتے ہیں وہ سوچنا اور تدبر کرنا نہیں چاہتے۔ بعض متعصب کم علم مولویوں نے اندھی تقلید کے نام پر ان کی عقل پر پٹی باندھ رکھی ہوتی ہے۔ تحقیق اور سوچ بچار سے باقاعدہ ڈرایا جاتا ہے۔ تو ایک داعی کے کرنے کا یہی کام ہے کہ وہ لوگوں کو تحقیق پر آمادہ کرے۔ کھرا اور کھوٹا پرکھنے کی طرف راغب کرے۔ یقین کریں جب کوئی بھٹکا ہوا راہی میدانِ تحقیق میں داخل ہو جاتا ہے تو اکثر ہی منزل پا لیتا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں، جیل کے ساتھیو! ذرا سوچو تو سہی کہ بالفرض اگر تمھارے

بقول زیادہ رب موجود بھی ہیں تو پھر کیا ایک رب بہتر ہے یا خداؤں کا پورا کنبہ بہتر ہے؟ الگ الگ امور کے الگ الگ الٰہ، یہ پانی دیتا ہے، یہ رزق اور یہ اولاد، یہ گرمی کا رب ہے اور یہ سردی کا، یہ سفر کا خدا ہے اور یہ حضر کا، یہ دولت کی دیوی ہے اور یہ موت کی، کیا ہزار در کا غلام ہونا اچھا ہے یا ایک ہی در کا ہو جانا بہتر ہے؟

قرآن مجید کے اولیں مخاطبین اہل مکہ بھی اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ ان کا ہر امر کا الگ الٰہ تھا، سفر میں جاتے تو اونٹوں کی دموں سے ان کے الٰہ لٹک رہے ہوتے، یہ سفر کے الٰہ تھے جو دورانِ سفر اونٹ کے پیشاب میں غسل کرتے رہتے اور وقت عبادت سامنے دھر لیے جاتے۔ یہ منظر تو پرانے تھے آج کے لیے آپ پڑوسی ملک بھارت کو دیکھ لیں۔ جونہی آپ بھارت داخل ہوتے ہیں آپ کو بڑے فخر سے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو تین کروڑ دیوی دیوتاؤں کی سرزمین پر خوش آمدید!

اور ان تین کروڑ دیوتاؤں میں کیڑے مکوڑے، بندر اور یہاں تک کہ انسانی شرمگاہ تک کو خدا کہا گیا ہے۔ ان سب کی پوجا ہو رہی اور اس پہ فخر بھی جاری ہے۔ اللہ معاف فرمائے توحید سے کٹ کر انسان کس قدر ذلیل ہو جاتا ہے۔ پھر مزید ستم یہ کہ اس سے احساس تک چھن جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے جیل کے ساتھیوں کو اسی غلاظتِ شرک سے نکالنے کے لیے یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ذرا سوچو تو سہی، ایک الٰہ بہتر ہے یا ہر کام کے لیے الگ الگ خدا؟ کیا ایک کارساز اور قوت و جبروت والا رب بہتر ہے یا ہزاروں بے بس مٹی کے مادھو؟ ایک اللہ بہتر ہے جو ہر چیز پر قادر ہے، غالب ہے اور جو اکیلا نظام ہستی چلا رہا ہے یا یہ تمھارے اپنے ہاتھوں سے بنائے مٹی کے بے جان پتلے۔

وہ جو وجود میں آنے کے لیے بھی تمھارے محتاج ہیں، تم جیسے چاہو انھیں ڈھال لیتے ہو جو چاہتے ہو ان کے نام رکھ لیتے ہو۔ کبھی تو سوچو، کبھی تو پرکھو کہ یہ جو تمھارے باپ دادا سے چلے آ رہے ہیں ان کرنی والوں کی کوئی حقیقت بھی ہے یا بس نام ہی نام ہیں۔ اگر درست بات اور حقیقت سننا چاہتے ہو تو دل پر پتھر رکھ کر ہی سہی زبان نبوت سے سن لو کہ صدیوں

سے تمھاری پیشانی میں مچلتے سجدوں کو وصول کرنے والی یہ ہستیاں سوائے ناموں کے کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

نام! جنھیں تم نے ہستیاں قرار دیا اور پھر ان کو خدا سمجھنا شروع کر دیا، مگر کوئی دلیل تو ہو تمھارے پاس؟ کیا اللہ نے کہیں اس کی کوئی دلیل اتاری ہے؟ نہیں شرک کسی بھی دور کا ہو وہ بے اصل، بے جڑ اور بے بنیاد ہوتا ہے، ہر طرح سے بے دلیل، اللہ نے اس کی کوئی دلیل نہیں اتاری بلکہ وہ تو کچھ اور فرماتا ہے:

﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ ﴾

''مطلب یہ کہ قوت واختیار اور طاقت وحکم صرف اللہ کا ہے، اسی نے پیدا کیا، اس کا حکم چلتا ہے۔ سو اسی کی عبادت کرو۔''

یہاں یہ جان لیجیے کہ حکم کی دو قسمیں ہیں اور سورۂ یوسف میں دونوں ہی قسمیں بیان ہوئی ہیں:

- حکم تکوینی۔
- حکم تشریعی۔

حکم تکوینی کیا ہے؟

حکم تکوینی جن میں اللہ تعالیٰ نے سارا اختیار اور اقتدار اپنے پاس رکھا ہے۔ بندوں کو اس میں سے ذرا بھر اختیار نہیں دیا۔ جیسے کسی کو پیدا کرنا بیماری یا شفا دینا کسی کا سیاہ رنگ کا یا سفید رنگ کا ہونا، لوگوں کی شکلوں کا مختلف ہونا وغیرہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی دراز قد ہے تو کوئی پست قامت، کوئی ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوتا ہے اور کوئی لنگڑا، یہ وہ چیزیں ہیں جن میں انسان کو کوئی اختیار نہیں، ان سب کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ اسے حکم تکوینی کہتے ہیں، یعنی وہ امور جن میں اللہ رب العزت نے انسان کو اختیار نہیں دیا۔ حکم تکوینی میں انسان مکلف نہیں ہوتا، ہو ہی نہیں سکتا کہ یہ معاملات اس کے اختیار میں ہی نہیں ہوتے۔ ان امور میں بندوں کا امتحان نہیں ہوگا۔

حکم تشریعی کی وضاحت:

یہ وہ حکم ہے جس میں انسان کو رب واحد نے اطاعت کا اختیار دیا ہے، اللہ نے شریعت پہنچانے اور سمجھانے کے لیے رسول بھیجے ہیں، ان پر کتابیں نازل فرمائی ہیں، احکام نازل فرمائے ہیں، پھر انسان کو عقل سلیم سے نوازا ہے۔ درست اور نا درست کی خوب وضاحت فرما دی ہے۔ انسان کو اس کا برا بھلا سمجھا دیا ہے۔ جنت اور جہنم ہر دو کی راہیں واضح فرما دی ہیں اور پھر اس کے بعد انسان کو انتخاب کا اختیار دے دیا ہے، یعنی:

﴿ مَنۡ شَآءَ فَالۡیُؤۡمِنۡ وَ مَنۡ شَاءَ فَالۡیَکۡفُرۡ﴾

''جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کر دے۔''

آپ دیکھتے ہیں کہ یہ وہ معاملات ہیں، جن میں بندے کو اختیار حاصل ہے، مگر شریعت سازی کا اختیار اللہ نے کسی کو نہیں دیا، ہاں چلنے نہ چلنے کا اختیار دیا ہے اور اسی میں امتحان ہے۔ اگر تمام معاملات میں اللہ حکم تکوینی جاری فرما دیتا اور انسان کے پاس اختیار ہی نہ ہوتا تو پھر اس کا امتحان تو نہ ہوتا، مگر ایسا نہیں، کیوں کہ اسے اختیار دیا ہے اور امتحان صرف ان چیزوں میں ہے جن میں اختیار حاصل ہے اور اسی حکم تشریعی پر ہماری عاقبت و آخرت کا اچھا برا ہونا موقوف ہے۔ اس آیت میں حکم تشریعی مراد ہے گویا کہ شریعت بنانے کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ کوئی نبی بھی شریعت اپنی طرف سے نہیں بتاتا، اللہ وحی کے ذریعے نبی کو جو بتاتا ہے نبی اسی کو آگے پہنچاتا ہے۔ اسی لیے نبی کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ یہ ایک ضروری وضاحت تھی، جس میں اکثر لوگ دھوکا کھاتے ہیں۔

بہر حال یوسف علیہ السلام بیان فرما رہے ہیں کہ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے۔ اسی کا جس نے تمھیں پیدا کیا جس نے تمھارے لیے کائنات مسخر فرمائی۔ ﴿ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ﴾ تو حکم بھی اسی کا چلے گا اور فرمایا: ﴿ ذٰلِکَ الدِّیۡنُ الۡقَیِّمُ ﴾ یہی سیدھا اور سچا دین ہے۔ توحید ہی اصل دین ہے مگر لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے غافل رہتی ہے۔ وہ رب واحد کی معرفت سے نا بلد ہو کر صنم کدے آباد کرتی ہے۔ کوئی مٹی کے بت خانے بناتا ہے تو کوئی من کے مندر میں

خواہش کے صنم کدے آباد کرتا ہے اور یہ سارے دین قیم سے دور رہتے ہیں مگر اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ بھی دین دار ہیں۔

'اکثریت' کی وقعت کیا ہے؟

آپ قرآن مجید میں ایک عجیب چیز پائیں گے، جہاں آپ کو اکثریت کی بات ملے گی، اکثر قرآن اس کا ذکر منفی پیرائے میں کرتا نظر آئے گا۔ مثلاً ایک نظر دیکھیے :

﴿ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ﴾ [البقرة : ٢٤٢]

''اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

﴿ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ﴾ [الأنعام : ١١٦]

''اکثر کا کہنا مانے جو زمین میں ہیں تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔''

﴿ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ [الأعراف : ١٨٧]

''مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

﴿ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ﴾ [هود : ١٧]

''اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔''

﴿ وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴾ [يوسف : ١٠٣]

''اور اکثر لوگ، خواہ تو حرص کرے، ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

اس کے علاوہ بھی متعدد آیات ہیں، جہاں اکثریت کی روش معیار نہیں بلکہ غلط کردار کے طور پر بیان کی گئی ہے، جبکہ اہلِ حق کے متعلق بتایا گیا کہ وہ تھوڑے اور قلیل ہوتے ہیں، مثلاً :

﴿ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ﴾ [هود : ٤٠]

''اور اس کے ہمراہ تھوڑے سے لوگوں کے سوا کوئی ایمان نہیں لایا۔''

﴿ مَا فَعَلُوهُ إِلَّا قَلِيلٌ مِنْهُمْ ﴾ [النساء : ٦٦]

''تو وہ ایسا نہ کرتے مگر ان میں سے تھوڑے۔''

﴿ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ﴾ [الکھف : ۲۲]

''کہہ دے میرا رب ان کی تعداد سے زیادہ واقف ہے انھیں بہت تھوڑے لوگوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

﴿ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ﴾ [سبا : ۱۳]

''اور بہت تھوڑے میرے بندوں میں سے شکر گزار ہیں۔''

قرآن مجید کے اس اسلوب پر غور کیا جائے تو حکمت کے کئی در کھلتے ہیں۔ایک تو یہ کہ اکثریت میں ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس پر فخر کا اظہار کیا جائے۔اکثریت میں ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ طبقہ حق پر اور درست ہے۔ ہمارے یہ معیار انتہائی نا درست ہیں۔ ہمارے ہاں اکثریت کو اکثر دلیل بنا لیا جاتا ہے کہ جی سارے لوگ یہ کر رہے ہیں۔ بھئی اکثر لوگوں کا ایک کام کرنا کوئی دلیل تو نہیں، ہاں دلیل وہی ہے جو قرآن یا حدیث سے میسر آئے۔

اب آپ ذرا جمہوریت کو دیکھ لیجیے۔ یہاں اکثریت کی جو قدر ہے وہ کہیں اور نہیں اور یہ جمہوریت ایسی اندھی لاٹھی ہے جہاں معیار نہیں مقدار کی حکمرانی ہے۔مثلاً کسی معاملے پر دس اہل عقل و دانش اپنی خداداد بصیرت و حکمت کی بدولت کسی بات سے انکار کرتے ہیں مگر سو (۱۰۰) جاہل اس کا اقرار کر رہے ہیں تو مانی ان بے بصیرت جاہلوں ہی کی جائے گی۔ پھر یہاں اکثریت جو چاہے خلاف عقل و دین فیصلے کرتی جائے،کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ انتہائی غلط چیز ہے اور قرآن اس کی نفی کرتا ہے۔اقبال نے اس نام نہاد اور بے اصل جمہوریت پر کیا عمدہ تبصرہ کیا ہے.....؎

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

❀❀❀

قیدیوں کا انجام کیا ہوا؟

يَٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُۥ خَمْرًا ۖ وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِۦ ۚ قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ ﴿٤١﴾

"اے قید خانے کے دو ساتھیو! تم میں سے جو ایک ہے سو وہ اپنے مالک کو شراب پلائے گا اور جو دوسرا ہے سو اسے سولی دی جائے گی، پس پرندے اس کے سر میں سے کھائیں گے۔ اس کام کا فیصلہ کر دیا گیا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو۔"

اب جب سیدنا یوسف علیہ السلام دعوتِ توحید کا فریضہ بحسن وخوبی ادا کر چکے تو حسب وعدہ قیدیوں کو تعبیر بتاتے ہیں۔ ذرا اسلوبِ بیاں دیکھیے اس میں کس قدر ہمدردی اور اخلاص جھلک رہا ہے۔ کس قدر نرمی اور شیرینی ہے گفتگو میں، کیا پیارا اور دل کش انداز تخاطب ہے۔ "اے میرے قید خانے کے ساتھیو!"

جب لہجے میں اس قدر مٹھاس ہو تو لفظ کانوں میں نہیں دماغوں میں جا اترتے ہیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اے میرے قید کے رفیقو! تم نے میری گفتگو سکون و اطمینان سے سنی، اب اپنے خوابوں کی تعبیر بھی سن لو۔ وہ جو خود کو اپنے مالک کو شراب نچوڑ کے پلاتے ہوئے پاتا ہے وہ تو الزام سے بری ہو گا، نجات پا کر قید سے چھوٹے گا اور اپنے سابقہ عہدے پر بحال ہو جائے گا جبکہ دوسرا شخص کہ جس نے خود کو سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے دیکھا اور دیکھا کہ پرندے روٹیاں نوچ نوچ کھاتے تھے، اسے پھانسی پہ لٹکا دیا جائے گا۔ یہ ہے تعبیر تمھارے خوابوں کی، جو میں نے اس علم کے مطابق کی ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیا ہے۔ بعض مفسرین نے لکھا کہ یہ خوفناک تعبیر سنتے ہی ایک کہنے لگا نہیں میں نے یہ خواب نہیں دیکھا تب سیدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا:

«قُضِيَ الْأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ»: نہیں جو تم نے دریافت کیا، اس کا فیصلہ ہو چکا یہاں سیدنا یوسف علیہ السلام قیدی کو سمجھا رہے ہیں کہ اگر ان کار کر کے تم کوئی تدبیر کرنا چاہو تو

اللہ کی تقدیر ہر چیز پر غالب ہوتی ہے۔ پورا بیان عقیدے کی زبردست دعوت ہے۔

❀❀❀

قیدی سیدنا یوسف علیہ السلام کو فراموش کر بیٹھا

وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ ﴿٤٢﴾

''اور اس نے اس سے کہا جس کے متعلق اس نے سمجھا تھا کہ بے شک وہ دونوں میں سے رہا ہونے والا ہے کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا۔ تو شیطان نے اسے اس کے مالک سے ذکر کرنا بھلا دیا تو وہ کئی سال قید خانے میں رہا۔''

تعبیر بتانے کے بعد یوسف علیہ السلام نے اس شخص سے، کہ جس کے متعلق خیال تھا وہ رہا ہو جائے گا اور اپنے سابقہ عہدے پر بحال ہو جائے گا۔ فرمایا تو بادشاہ کے قریب رہے گا تو کسی دن مناسب موقع دیکھ کر بادشاہ کے ہاں میرا یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام کا بھی تذکرہ کرنا، اسے بتانا کہ جس طرح میں بے گناہ پھنسا تھا ایک اور شخص بھی جرمِ بے گناہی کی سزا کاٹ رہا ہے، سو اس کے متعلق بھی کچھ غور کرو۔

یوسف علیہ السلام نے اسے یہ تلقین کر دی مگر وہ شخص رہا ہو کے جو گیا تو پھر اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہوا کہ اس بات کا تذکرہ ہی بھول گیا۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ شیطان نے اسے بھلا دیا۔ یہ ایک عمدہ ادب ہے جو یہاں سکھایا جاتا ہے کہ جب بری چیز کی نسبت کرنا ہو تو اپنی طرف یا شیطان کی طرف کرو، رحمان کی طرف نہیں، ہاں جب اچھی چیز کی نسبت مقصود ہو تو اسے رب رحمان کی طرف کرنا چاہیے، اس لیے کہ سب اچھائیاں اللہ ہی کی عطا ہیں اور تمام برائیاں ہماری اپنی شامت اعمال کا نتیجہ ہیں۔ قرآن مجید نے یوسف علیہ السلام کے پردادا سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کیا ہے، دیکھیے اس میں یہ ادب کس عمدگی سے نظر آتا ہے ایک موقع پر ابراہیم علیہ السلام رب کا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وہ ذات کہ جس نے مجھے پیدا کیا اور ہدایت بخشی، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔''

ان عمدہ چیزوں کی نسبت اللہ کی طرف کرتے کرتے جونہی بیماری کا ذکر آیا تو فوراً یہ کہا:

﴿ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ ﴾ [الشعراء : ۸۰]

''جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفا دیتا ہے۔''

یعنی پیدا کرنے، ہدایت بخشنے اور کھانے پلانے کو اللہ کی طرف منسوب کیا مگر بیماری کی نسبت اپنی طرف کی ہے، تو اس معاملے میں ہمیں بھی خیال کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو سلیقوں اور آداب سے آراستہ کرنا چاہیے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق ارزاں کرے۔

بہر حال شیطان نے اس شخص کو یوسف کے ذکر سے غافل کر دیا، نتیجتاً یوسف علیہ السلام کا عرصۂ جیل مزید دراز ہو گیا۔ قرآن مجید نے: ﴿ بِضْعَ ﴾ کا لفظ بولا ہے۔

عربی زبان میں اس لفظ کا اطلاق تین سے نو تک کے اعداد پر ہوتا ہے۔ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو سات سال تک جیل رہنا پڑا تھا اور ظاہر ہے یہ بڑی آزمائش کے دن تھے اور بالخصوص اس صورت میں کہ گناہ اور جرم بھی کوئی نہ تھا مگر سیدنا یوسف علیہ السلام نے کمال صبر اور بے انتہا برداشت سے یہ دن جھیلے۔ اس خوش اسلوبی سے کہ وعظ وتبلیغ کا بھی جہاں موقع ملا داعیانہ رنگ میں اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔ ظاہر ہے آپ ایک نبی تھے اور اصحابِ نبوت کے حوصلے ایسے ہی بلند ہوتے ہیں کہ وہ جہاں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں صبر وشکر ہی ان کا قرینہ ہوتا ہے۔

ایسے معاشرے جہاں اللہ کا حکم قائم نہ ہو۔ بے دین مفاد پرست لوگ حکمران ہوں وہاں داعیانِ حق کو اکثر ہی جیلوں میں جانا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں اللہ کے مخلص بندوں کو دعوت کا مشن اپنانا چاہیے۔ جیل کے ساتھیوں پر دعوت اثر بھی زیادہ کرتی ہے۔ اس وقت یورپ کی جیلوں میں لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگوں کا اصل مشن دعوت دین ہے جو ہر حال میں اسے جاری رکھنا چاہیے۔

❀❀❀

شاہِ مصر کا حیرت انگیز خواب

وَ قَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْٓ اَرٰى سَبْعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعَ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ؕ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ﴿۴۳﴾

''اور بادشاہ نے کہا بے شک میں سات موٹی گائیں دیکھتا ہوں، جنھیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے اور کچھ دوسرے خشک (دیکھتا ہوں)، اے سردارو! مجھے میرے خواب کے بارے بتاؤ، اگر تم خواب کی تعبیر کیا کرتے ہو۔''

اب یہاں سے سیرتِ یوسف علیہ السلام ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے اور یہ رخ ہے ابتلا و آزمائش پر صبر کی جزا کا رخ، اور یہ رخ ہے جیل کی سلاخوں سے نکل کر مصر کے تخت پر براجمان ہونے کا رخ۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ایام ابتلا ختم کرنے کا ارادہ فرمایا تھا، چنانچہ سبیل اس کی یہ ہوئی کہ مصر کے بادشاہ نے ایک خواب دیکھا۔ بادشاہ کے لیے یہ خواب بڑا عجب اور نہایت پریشان کن تھا۔ اس نے خواب میں چودہ گائیاں دیکھیں۔ ان میں سے سات نہایت تندرست، صحت مند اور فربہ تھیں جبکہ دیگر سات لاغر، کمزور اور نحیف و نزار تھیں۔ ان گائیوں کے متعلق بادشاہ بڑا تعجب خیز منظر دیکھتا ہے کہ جو سات کمزور اور لاغر گائیاں تھیں وہ یکایک موٹی اور فربہ گائیوں پہ پل پڑیں اور دیکھتے ہی دیکھتے انھوں نے ان موٹی تازی گائیوں کا صفایا کر دیا۔ پھر بادشاہ نے خواب میں اک دوسرا منظر دیکھا۔ اس منظر میں بادشاہ کو سات سرسبز و شاداب بالیاں اور سات خشک بالیاں دکھائی دیں۔

صبح اٹھ کے بادشاہ نے اپنے سب مصاحب اور درباری اکٹھے کیے، تعبیر بتانے والے اور نجومی و کاہن بھی بلا لیے گئے۔ بادشاہ نے انھیں اپنا خواب سنایا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ اگر تم تعبیر جاننے کا دعویٰ کرتے ہو تو اس خواب کی تعبیر بیان کرو۔

❀❀❀

خواب کی تعبیر سے درباریوں کی بے بسی

قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ ۚ وَ مَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

''انھوں نے کہا یہ خوابوں کی پریشان باتیں ہیں اور ہم ایسے خوابوں کی تعبیر بالکل جاننے والے نہیں۔''

خواب کی تعبیر میں فراست، فہم اور بات کی تہہ تک پہنچنے اور گہرائی میں اترنے کی صلاحیت ہی بنیادی چیز ہوتی ہے۔ یہ نجومیوں اور کاہنوں کے بس کی بات نہیں۔ وہ ظن وتخمین اور اٹکل پچو کے عادی ہوتے ہیں اور اوٹ پٹانگ زائچے کھینچ کے شیطان کی طرف سے موصول ہونے والے پیغام میں دہ دردہ باتیں شامل کر کے آگے پہنچانے والے ناکارہ لوگ، سو بادشاہ کے سارے درباری، وزراء اور مشیر اس خواب کے سامنے عاجز آ گئے۔ بے چاروں نے لاکھ جتن کیے ہوں گے اور بہت زور مارا ہوگا مگر درست تو کیا وہ کوئی غلط تعبیر بھی نہ کر سکے۔ حیرت اس امر کی ہے کہ یہ لوگ پہلے کون سا 'حق سچ' کے علاوہ کچھ نہیں کہتے ہوں گے جواب بادشاہ کے خواب کی کوئی الٹی سیدھی تعبیر بھی نہ کر سکے، کچھ تو کہہ ہی سکتے تھے آخر! مگر یہ کیا کہ وہ تو سیدھا بادشاہ ہی کو کوسنے لگے کہ ''بھلا ایسے ہوتے ہیں وہ خواب جن کی تعبیریں ہوتی ہیں؟ نہیں صاحب! یہ خواب نہیں بس الجھے خیالات اور وہ پیچیدہ و پراگندہ بے مقصد مناظر ہیں جو حضور نے دیکھ لیے ہیں۔ ان کا نہ کوئی مطلب ہے، نہ مقصد اور نہ تعبیر۔'' ان کاہنوں، جوتشیوں اور تعبیر کرنے والوں کے کسی بھی قسم کی غلط صحیح تعبیر سے صاف انکار کرنے میں یوں محسوس ہوتا ہے دراصل اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام کی آزادی کی راہیں ہموار کرنا چاہتا تھا۔ وہ دربار میں موجود اس سابقہ قیدی کو سیدنا یوسف علیہ السلام کی یاد دلانا چاہتا تھا۔ جسے شیطان نے فراموش کرا دیا تھا۔ بہر حال تعبیر کے سب ماہرین نے ہاتھ کھڑے کر دیے اور صاف کہہ دیا کہ یہ تو پراگندہ اور بے مقصد خیالات ہیں۔ ایسے خوابوں کی تعبیر ہمیں آتی ہی نہیں۔

خواب تو خیر بہت با معنی تھا بلکہ نہایت اہم کہ مصر کے آئندہ حالات اس میں دکھائے گئے تھے۔ معبرین کی یہ بات تو خیر غلط تھی مگر ان کا یہ کہنا بہر حال درست تھا کہ ''ہم اس خواب کی تعبیر نہیں جانتے۔''

❀❀❀

جب قیدی کو یوسف علیہ السلام یاد آئے

وَقَالَ الَّذِيْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِيْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿٤٥﴾

''اور ان دونوں میں سے جو رہا ہوا تھا اور اسے ایک مدت کے بعد یاد آیا، اس نے کہا میں تمھیں اس کی تعبیر بتاتا ہوں، سو مجھے بھیجو۔''

اب جب سارے درباری اور تعبیر کے ماہر مات ہوئے اور خواب کی بات بہت پھیلنے لگی تو اچانک اس شخص کو یوسف کے متعلق یاد آیا جو یوسف علیہ السلام کی ہمراہی میں جیل کاٹ چکا تھا۔ اسے نا صرف یوسف علیہ السلام کے خوابوں کی بے مثال تعبیر بتانے کی صلاحیت یاد آئی بلکہ وہ قصہ بھی یاد آیا جب یوسف علیہ السلام نے اس کے ذمہ لگایا تھا کہ بادشاہ کے ہاں میری بے گناہ قید و بند کا تذکرہ کرنا، چنانچہ اب یکایک سب کچھ اس کے ذہن میں تازہ ہوتا گیا تو وہ بے اختیار بادشاہ سے کہنے لگا:

''جناب عالی! یہ خواب اتنا بھی پراگندہ خیالات پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ اس کی تعبیر آپ کو بتائی جاسکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ جیل میں محبوس فلاں شخص تک مجھے رسائی دے دی جائے، مجھے اس تک پہنچنے اور روانہ ہونے کی اجازت دے دی جائے تو میں اس سے پوچھ آتا ہوں وہ شخص بڑا سمجھ دار، زیرک اور خوابوں کی تعبیر کا کے متعلق بڑا ہی صاحب علم ہے۔''

قرآن مجید نے اس کا اتنا ہی قول نقل کیا ہے، مگر لازم ہے کہ اس شخص نے اپنا خواب اور پھر پیش آمدہ حالات کے سیدنا یوسف علیہ السلام کی تعبیر کے مطابق ڈھلنے کا تذکرہ بھی کیا ہوگا اور بتایا ہوگا کہ خود میں بھی اس کی سچائی اور نادر علم تعبیر کا تجربہ کر چکا ہوں۔ یہ سب بتا کے اس

نے جانے کی اجازت طلب کی جو یقیناً اسے دے دی گئی کیونکہ اگلی ہی آیت میں اس کی یوسف سے ملاقات کا حال رقم ہوتا ہے۔

❀❀❀

سابقہ قیدی، سیدنا یوسف علیہ السلام کے حضور

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ یٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّیْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

''یوسف! اے نہایت سچے! ہمیں سات موٹی گائیوں کی تعبیر بتا، جنھیں سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشوں اور دوسرے خشک خوشوں کی بھی، تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جاؤں، تاکہ وہ جان لیں۔''

اجازت لے کر یہ شخص روانہ ہوا اور اب سات سال کے عرصہ کے بعد جیل میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے روبرو بیٹھا ہے۔ اللہ کی شان پہ قربان جایئے وہ کتنا بے پروا اور کتنا قادر ہے آج کیا منظر ہے جو مصر کے در و دیوار دیکھ رہے ہیں، بادشاہ کا ایک مصاحبِ خاص بلکہ بادشاہ سمیت پورا دربار شاہی آج جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے اک غیر معروف شخص کا محتاج ہو گیا ہے۔ آنے والا نہایت عزت و احترام کے ساتھ اور آداب ملحوظ رکھتے ہوئے یوسف علیہ السلام کو مخاطب کرتا ہے۔

دیکھیے یوسف علیہ السلام کے کردار کی عظمت کا جو نقش سات سال قبل اس شخص کے دل پر بیٹھا تھا آج بھی ویسی ہی آب و تاب دے رہا ہے۔ اس کے دل میں یوسف علیہ السلام کی عظمت اس طور جاگزیں ہے کہ صرف نام لے کر مخاطب نہیں کرتا بلکہ دلی احترام کے اظہار کے لیے نام کے ساتھ عظمت و تقدیس کا لاحقہ استعمال کرتا ہے۔ یعنی ''اے سچے یوسف!''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے ہاں ایک داعی کا کردار کیا اہمیت رکھتا ہے۔ لوگ ایک داعی سے سچائی کی کس قدر توقع رکھتے ہیں۔ خوب جان لینا چاہیے کہ جس نے دین کی

دعوت کا کام کرنا ہو اسے لوگوں کا پختہ اعتماد حاصل ہونا چاہیے۔ اسے ایسا عمدہ کردار لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے کہ جو ان کے دل پر اثر کرے۔ جب وہ اس سے متاثر ہوں گے تو پھر اس کی بات بھی ان کے دل میں اترتی چلی جائے گی۔ کسی بھی داعی کی یہی بڑی خوبی اور یہی عمدہ کمال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ شخص یوسف کی سچائی کا گواہ بنا بیٹھا ہے۔

دراصل وہ آپ کی صداقت کا چشم دید گواہ ہے۔ یوسف علیہ السلام کی بزرگی، پارسائی اور زہد وتقویٰ کو بچشم خود ملاحظہ کر چکا ہے سو نہایت نرم اور عاجزانہ لہجے میں ملتجی ہوتا ہے۔ اے سچے یوسف! ہماری رہنمائی کیجیے کہ ہمارا بادشاہ ایک خواب دیکھتا ہے اور اس خواب میں وہ سات دبلی پتلی اور لاغر گائیوں کو سات فربہ وتندرست گائیاں کھاتے دیکھتا ہے۔ پھر سات سرسبز و شاداب اور شاندار بالیاں دیکھتا ہے اور پھر سات ہی خشک بالیاں دیکھتا ہے۔

بتاتا ہوگا کہ سب درباری مات ہوئے اور سب تعبیر بتانے والے ناکام رہے۔ معلوم ہوتا ہے باوجود سیدنا یوسف علیہ السلام پر کامل یقین کے اس کے ذہن کے کسی گوشے میں وسوسہ ہو گا کہ کہیں یوسف علیہ السلام بھی تعبیر بتانے سے عاجز ہی نہ آ جائیں۔

یہ چیز اس کے لفظوں سے عیاں ہوتی ہے "شاید کہ میں (حقیقت حال کے ساتھ) پلٹوں اور وہ لوگ اسے جان لیں۔" یہاں "لَعَلِّیۤ" کے معنی 'شاید' یا 'امید ہے' سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں کچھ ہی سہی شک موجود ضرور تھا۔ ہو بھی سکتا ہے کہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے علم کی بدولت یوسف علیہ السلام کا محض ایک معتقد ہی تو تھا، پیروکار تو نہ تھا۔

خیر امید بھرے لہجے میں وہ یوسف علیہ السلام سے درخواست کرتا ہے۔ ساتھ کیفیت بھی بتلاتا جاتا ہے کہ میں تعبیر کے ساتھ پلٹ کے جانا چاہتا ہوں۔ لوگ منتظر ہیں۔ بادشاہ بڑی بے چینی میں ہے۔ سب درباری اور مشیر و وزراء انتظار میں ہیں کہ میں کیا تعبیر لے کے جاتا ہوں، سو آپ ہم سب پر یہ احسان فرمائیے اور اس خواب کی تعبیر بتا دیجیے۔

❀❀❀

شاہِ مصر کے خواب کی تعبیر

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ﴿۴۷﴾

”اس نے کہا تم سات سال پے درپے کاشت کرو گے تو جو کاٹو اسے اس کے خوشے میں رہنے دو، مگر تھوڑا سا وہ جو تم کھالو۔“

سیدنا یوسف علیہ السلام نے خواب سماعت فرمایا اور بغیر کسی تمہید کے اس کی تعبیر بتانا شروع کر دی۔ قربان جایئے پیغمبر کے تحمل، اس کی برداشت اور اس کی وسعتِ ظرف پر کہ برسوں کے بعد آج وہ شخص ملا ہے جس کی گردن پہلے ہی یوسف علیہ السلام کے بوجھِ احسان سے لدی ہوئی ہے۔ وہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ شاہِ مصر کے ہاں اس قیدی کی بے گناہی کی بات کرے گا مگر نہیں کی اور بالکل فراموش کیے بیٹھا رہا۔ آج اپنا کام ہے تو پھر حاضرِ خدمت ہے، مگر یوسف علیہ السلام کا کمال ظرف دیکھیے کہ کوئی شکوہ کا لفظ نہیں، کوئی حرفِ شکایت نہیں، کوئی بے وفائی اور محسن کشی کا طعنہ نہیں، کوئی شرط نہیں کہ جاؤ اور پہلے میرا معاملہ طے کر کے آؤ تو میں تمھاری درخواست پر غور کروں گا، نہیں پیغمبر تو ایک درخت کی گھنی چھاؤں کی طرح ہوتا ہے جو اپنے پرائے اور دوست دشمن سب پر اپنی راحت بخش چھاؤں نچھاور کرتا ہے۔ پیغمبر تو ان بادلوں کی طرح ہوتا ہے جو نشیب و فراز کی پروا کیے بغیر ہر طرح کی زمین پر برابر برستا ہے۔ پیغمبر تو تیر کھا کے مسکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ وہ زخم لے کے پھول دینے کا ظرف رکھتا ہے۔ آج یہ مغرب ہے جو اپنے ہی انبیائے کرام علیہم السلام کے حالات پر فحش اور ناروا فلمیں بنا رہا ہے۔ یہ وہی ناہنجار مغرب ہے جس نے عفت و عصمت کے پیکر ان انبیاء کے خلاف اپنی مقدس مذہبی کتابوں تک میں نعوذ باللہ حیا باختگی کے الزام لگائے۔ اللہ ہمیں حرمتِ رسل اور تقدیس انبیائے کرام علیہم السلام سے آگہی و آشنائی دے۔ آمین!

بہرحال یوسف علیہ السلام بتاتے ہیں کہ سات سال کا ایک دورانیہ تم پر ایسا آئے گا کہ کھیتیاں خوب پھلیں پھولیں گی۔ زمین سیراب اور شاداب رہے گی، ہریالی اور خوشحالی کا دور دورہ ہو گا۔ پھل اور اناج کی بہتات ہو گی۔ بارشیں برسیں گی اور کھیتیاں لہلہائیں گی، لیکن اس عرصہ خوشحالی میں فصلوں کی کاشت اور اناج کی برداشت میں بڑے تدبر اور حکمت کی ضرورت ہے۔ یہاں دور اندیشی سے کام لینا ہو گا۔ ضرورت سے زائد ہر چیز کو محفوظ رکھنا اور ضائع ہونے سے بچانا ہو گا۔ سات سال کی پیہم پیداوار کو بہت محتاط انداز سے کھانا اور جو باقی بچتا ہے اسے بالیوں اور سٹوں میں رہنے دینا ہی تمھارے لیے زیادہ موزوں ہو گا۔ ہاں جو استعمال کرنا اور کھانا ہے وہ نکال لو مگر باقی سب بالیوں ہی میں پڑا رہنے دو۔

یہ ایک نہایت پر حکمت نصیحت تھی جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے انھیں فرمائی، کیونکہ آج بھی کسان جانتے ہیں کہ اناج بالیوں میں زیادہ محفوظ رہتا ہے اور زیادہ عرصہ تک چلتا ہے۔

❀❀❀

خوشحالی کے بعد خستہ حالی کا دور

ثُمَّ يَأْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾

”پھر اس کے بعد بہت سخت سات برس آئیں گے، جو کھا جائیں گے جو کچھ تم نے ان کے لیے پہلے رکھا ہو گا مگر تھوڑا سا وہ جو تم محفوظ رکھو گے۔“

فرمایا کہ ان خوشحالی کے سالوں کے بعد سات بڑے سخت حالی کے سال آئیں گے۔ یہ قحط سالی کا دور ہو گا اور نہایت شدید ہو گا۔ ان سالوں میں تمھیں اناج ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا ہاں وہی کام آئے گا جو پچھلے سالوں میں بچا کے رکھا ہو گا۔ یہاں قرآن مجید نے استعارے اور کنایے سے کام لیا ہے یعنی یہ جو کہا کہ سال کھا جائیں گے تو ظاہر ہے سال تو نہیں کھاتے مطلب ہے تم لوگ کھا جاؤ گے۔

قصے کے اس حصہ میں ہمیں بچت کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو شب و روز کو بدلتا رہتا ہے۔ دھوپ چھاؤں اور نشیب و فراز کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔ تو خوشحالی کے دنوں میں بدحالی کے دنوں کا خیال ذہن میں رکھنا ایک عمدہ حکمت عملی ہے۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ انھیں نوازتا ہے تو بڑے اتراتے اور اٹھلاتے پھرتے ہیں۔ ایک گھر فرانس میں بن رہا ہے تو دوسرا سوئٹزر لینڈ میں، دنیا بھر کی سیریں ہوتی ہیں اور دنیا بھر کی اشیاء گھر میں جمع کر لی جاتی ہیں۔ تب تو پانی تک اپنے ملک کا حلق سے نہیں اترتا، پانی کی جگہ پیپسی اور جوس چلتے ہیں مگر جونہی آزمائش شروع ہوئی، کاروبار میں گھاٹا پڑا تو دنیا ہی نہیں دین سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ تو ایسے لوگوں کو اعتدال و توازن سیکھنا چاہیے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام یہی تدبیر یہاں اہل مصر بتلا رہے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان بھی اسی طرف ہماری رہنمائی فرماتا ہے:

« خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا »

”بہترین حکمت عملی میانہ روی ہے۔“

❀❀❀

آسانی کا اک اور دور

﴿ ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ ﴾

”پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر بارش ہوگی اور وہ اس میں نچوڑیں گے۔“

جیسا کہ قرآن مجید نے وضاحت کی، اللہ رب العزت کا یہی دستور ہے:

﴿ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الم نشرح : ۵]

”بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔“

سیدنا یوسف علیہ السلام نے تعبیر کے ضمن میں مزید فرمایا کہ پھر ان سختی کے سالوں کے بعد ایک

خوشحالی کا سال آئے گا، جو پچھلے تمام دلدر دور کر دے گا۔ اس سال دوبارہ ہریالی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوگا۔ بارشیں ٹوٹ کر برسیں گی، جل تھل ایک ہو جائے گا۔ برسوں کی پیاسی زمین کا سینہ پانی سے بھر لے تو وہ پھر اپنے دامن کو فصلوں اور اناجوں سے بھر دے گی۔ فراوانی اور بہتات اس قدر ہوگی کہ کہیں تم پھلوں کے رس نکالو گے، کہیں رسیلے شہد نچوڑو گے، کہیں سیر ہوئے جانوروں سے فراواں دودھ نکالو گے، غرض یہ نہایت فراوانی اور کثرت کا دور ہوگا۔ اتنا کہ سابقہ قحط سالیاں تمھارے ذہنوں سے نکل جائیں گی۔

اس انداز سے سیدنا یوسف علیہ السلام نے نا صرف خواب کی نہایت وضاحت سے تعبیر بیان کر دی بلکہ اس پر نہایت پر حکمت اضافے بھی فرما دیے۔ حکمت و دانائی سے بھرپور مشوروں سے بھی نواز دیا اور حد تو یہ ہے کہ اپنی طرف کسی ایک کلمے سے بھی اشارہ نہیں فرمایا اور نہ تعبیر کے لیے آنے والے کو گزشتہ فراموشی کے رویے پر عار ہی دلائی۔ جو اس نے پوچھا بتا دیا اور بس!

❁❁❁

تحقیق پہلے، آزادی بعد میں

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ ۝۵۰

''اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ، تو جب قاصد اس کے پاس آیا تو اس نے کہا اپنے مالک کے پاس واپس جا، پھر اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، یقیناً میرا رب ان کے فریب کو خوب جاننے والا ہے۔''

جب یوسف علیہ السلام کی بیان کردہ خواب کی تعبیر بادشاہ نے سنی تو وہ تو مبہوت رہ گیا ہوگا۔ اس قدر خردمندانہ اور بصیرت افروز گفتگو، اس خواب کی تعبیر کے طور پر سننا، جسے اس کے سب

حواری متفقہ طور پر «اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ» پراگندہ خیالات قرار دے چکے ہوں! یعنی بادشاہ کا دنگ رہ جانا یقینی طور پر سمجھ میں آتا ہے۔ بادشاہ سوچتا ہوگا کہ وہ بھی کیا عجب شخص ہے کہ جس نے اپنے اردگرد بے کار لوگوں کا ہجوم جمع کر رکھا ہے اور عقل و دانش میں بہترین لوگ اس کی جیل میں پڑے ہیں۔ سو اس نے حکم دیا کہ فی الفور اس شخص کو میرے پاس لاؤ۔

یہاں سے علم کی قدر اور وقعت و اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رب کا عطا کردہ علم ہی تھا جس کے اثر سے خود بادشاہ یوسف علیہ السلام کو پیغام بھیجنے پر مجبور ہوا، اور یہ علم ہی ہے جو ہمیشہ ہی انسانوں کو دنیاوی مشقت سے نجات دلانے کا باعث ثابت ہوا ہے۔

بہر حال ایلچی دوڑا دوڑا سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا۔ نہایت خوش اور بہت پر مسرت کہ اے یوسف علیہ السلام! جلدی نکلو، بادشاہ تمھاری فہم وفراست اور حکمت و تدبر سے بے انتہا متاثر ہوا ہے، وہ تمھیں فوراً بلا رہا ہے، سو دیر نہ کرو جلدی اس کے پاس پہنچو، تاکہ وہ تمھاری قدر افزائی کرے اور تمھیں موتیوں سے تول دے۔ دیکھو تم نے بڑے صبر و برداشت سے سات سال کا عرصہ بے گناہی کے جرم میں کاٹا ہے مگر اب یہ قصہ تمام ہوا، سو جلدی نکلو اور اپنے حقیقی مقام کی طرف چلو۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کی صدائے آزادی پر خوشی خوشی لبیک کہنے اور سنتے ہی اٹھ کر دوڑنے کی بجائے سیدنا یوسف علیہ السلام نہایت تحمل اور صبر سے کھڑے وہ کہہ رہے ہیں جس کا اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں ہرگز نہیں پہلے تم اپنے بادشاہ کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ میرے دامن پہ جو داغ لگایا گیا ہے اور کردار پہ جو حرف لانے کی مصری خواتین نے کوشش کی ہے تو پہلے وہ اس کی تحقیقات کروائے۔ جب تک یہ معاملہ واضح نہیں ہوتا اور میرا کردار صاف نہیں ہو جاتا میں جیل سے نکلنے کو تیار نہیں ہوں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس عزیمت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خراجِ تحسین پیش کیا ہے، فرمایا:

«وَ لَوْ لَبِثْتُ فِي السِّجْنِ طُولَ مَا لَبِثَ يُوسُفُ لَأَجَبْتُ الدَّاعِيَ»

[صحیح بخاری، کتاب الأحادیث الأنبیاء : ۳۳۷۲]

"اگر میں نے اتنا عرصہ قید کاٹی ہوتی، جتنا عرصہ یوسف قید میں رہا تو میں بلانے والے کے ساتھ نکل کھڑا ہوتا۔"

سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں عظمت کردار اور یہاں ایک اور لطیف نکتہ دیکھیے کہ سازش کے مرکزی کردار زلیخا کا نام لینے کی بجائے مطلق طور پر مصری عورتوں کا تذکرہ فرما دیا اور یوں اس عورت کی رسوائی سے پھر بھی صرف نظر کر لیا جس کی سازشوں اور چالوں نے حیاتِ یوسف کے سات بہترین سال کھا لیے تھے۔ یقیناً یوسف علیہ السلام نے ایسا اسی لیے کیا کہ حتی الامکان کم سے کم اس کی رسوائی ہو کہ اس گھر کے یوسف پر بہر حال احسانات تھے اور امت کا نگہبان محسن ناشناس نہیں ہوتا۔ چنانچہ کمال حکمت سے اس کا دامن عصمت بھی مزید رسوا ہونے سے بچا لیا کہ جس کی دست درازیاں خود یوسف کے دامن تک آ پہنچی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دامن کو بے داغ ثابت کروانے کا سامان بھی کروا لیا۔

چنانچہ یوسف علیہ السلام نے ایلچی سے کہہ دیا کہ پہلے ان مصری خواتین کے معاملہ کی تحقیق کی جائے، جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے کہ اصل معاملہ کیا تھا۔ ظاہر ہے اس اندازِ تحقیق میں یوسف کا کردار بھی واضح ہو جاتا اور مصری خواتین کا مکر بھی معلوم ہو جاتا۔

«اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ» "بے شک میرا رب ان کے مکر وفریب کو جانتا ہے۔"

مومن کی بھی کیا عجب شان ہے، کس قدر بھروسا اور کتنا اعتماد ہوتا ہے اسے اپنے رب پر!! اور یہ اعتماد ہی اس کا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے، پھر اسی سہارے پر اعتماد کرتے ہوئے وہ بڑی سے بڑی اذیتیں اور تکالیف سہہ جاتا ہے۔ یہی توکل، محبت، اعتماد اور تعلق ہی تو ہے جس کی بدولت انسان:

- کبھی آسمان کو چھوتے شعلوں کی حامل آگ میں بلا تامل چھلانگ لگا دیتا ہے۔
- کبھی طائف کے بازاروں میں پتھر کھا کر بھی دشمنوں کے لیے رحمت مانگتا ہے۔
- کبھی گہرے سمندروں کی اتھاہ تاریکیوں میں مقیم کسی جہازی سائز مچھلی کے پیٹ میں پڑ جائے "تو پاک ہے میں ہی ظلم کر بیٹھا ہوں۔" کا ورد کرتا نظر آتا ہے۔

❀ کبھی احد و بدر سجائے، موتیوں سے قیمتی دانت تڑوائے ''میں نبی ہوں اور جھوٹ نہیں کہتا۔'' کی صدائیں بلند کرتا دکھائی پڑتا ہے۔

بہر حال مومن یہ سب صدمے سہہ جاتا ہے۔ سب اذیتیں برداشت کر لیتا ہے۔ محض اس اعتماد پر کہ میرا رب تو مجھے دیکھتا ہے نا، وہ رب کہ جسے مجھ سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت ہے وہ تو میرے حالات سے، میرے صدمات سے واقف ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے تو پھر ڈر کاہے کا؟ پھر تامل کیسا اور پھر دھڑکا کس چیز کا؟ واقعی جب خالق کی حمایت حاصل ہو تو پھر ڈر کیسا؟

سو ایک مومن راہِ خدا میں کچھ بچا کے اور ذرہ بھر بھی چھپا کے نہیں رکھتا، یہاں تک کہ وہ مال و اسباب اور وقت و عمر کے بعد اپنی رگ رگ سے لہو نچوڑ کر اور مسام مسام سے جاں کشید کر کے رب کے حضور پیش کر دیتا ہے، اس حال اور کیفیت میں کہ چہرے پر کوئی احساسِ تفاخر اور لب پہ کوئی کلمہ بڑائی نہیں ہوتا، بلکہ انگ انگ سے ایک ہی رنگ پھوٹتا دکھائی دیتا ہے......؎

جاں دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

دیکھیے یوسف علیہ السلام کی یہاں یہی کیفیت نظر آتی ہے، یعنی بادشاہ سے کہو تحقیقات کروائے اگر وہ بھی ایسا نہیں کرتا اور حالات سدھارنے پہ آمادۂ عمل نہیں ہوتا تو جان لے کہ وہ میرا آخری سہارا ہرگز نہیں بلکہ میرے توکل و اعتماد کا محور و مرکز تو کوئی اور ذاتِ بابرکات ہے اور وہ سب جانتا ہے، سب دیکھتا ہے۔ ان کے مکر و فریب کو بھی اور تمھارے احوال و اعمال کو بھی۔

«اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ»: دیکھیے یہ ہے مقصد قرآن مجید کا اس قصے کو بیان کرنے کا کہ اللہ تعالیٰ یوسف علیہ السلام کا ستھرا کردار ہمارے لیے بطورِ عمل پیش کر رہا ہے کہ حالات و واقعات کچھ بھی ہو جائیں، ماحول کس قدر بھی زہرناک ہو جائے ایک سچا مومن

کبھی ہار نہیں مانتا اور ایک پکے ایمان دار کو کبھی شکست سے دو چار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبق ہے اس سورۂ مبارکہ کا، اللہ تعالیٰ بچائے ان قصہ گو لوگوں سے، انھوں نے عبرت و اسباق سے بھری اس سورۂ مبارکہ کو عشق و عاشقی کا ایک باب بنا کے رکھ دیا ہے۔ پھر اس پر وہ وہ حاشیے چڑھائے ہیں کہ الاماں والحفیظ! پھر پنجابی شاعروں نے تو گویا سورۂ یوسف سے کوئی ازلی انتقام لیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک پیغمبر کی عصمت و ناموس کا خیال کیے بنا ان سے وہ وہ مکالمے کہلوا دیے ہیں کہ سنتے ہوئے بھی کان کی لویں سرخ ہو جاتی ہیں۔

ادھر آپ یوسف علیہ السلام کا لمحہ لمحہ حیا و عصمت میں بسر ہوتا دیکھیے کہ وہ آزادی پر بھی اپنی ناموس کے تحفظ کو ترجیح دیتے ہیں اور ادھر ان واعظین بے لگام اور ان قصہ گو لوگوں کو دیکھیے کہ زور تخیل سے کیا کیا گل کھلاتے نظر آتے ہیں۔

کوئی بتلائے ایسے مکالمے پیغمبر سے منسوب کرنا کیا گستاخی نہیں؟ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے صحیح دعوت کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا ہے اور لوگوں کو قصے کہانیوں میں الجھا رکھا ہے۔ داستانیں ہی داستانیں ہیں جو دین کے نام پر پھیلا دی گئی ہیں اور لوگ اب حق کی بجائے صرف داستانیں سننے کے عادی کر دیے گئے ہیں۔ یہ سارا قصور ان لوگوں کا ہے جنھیں ہماری جہالت نے 'علماء' بنا رکھا ہے۔ لاہور میں میرا ایک مسجد میں جانا ہوا، معلوم ہوا یہاں جو مولوی صاحب تھے وہ خطبہ جمعہ میں ہیر رانجھا کی کتاب پڑھ دیا کرتے تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ حال ہے آج ہماری دعوت کا، اللہ تعالیٰ ہمیں راہِ صواب نصیب فرمائے۔ آمین۔

❀❀❀

جب دربارِ شاہی، عدالت بن گیا

قَالَ مَا خَطْبُكُنَّ اِذْ رَاوَدْتُّنَّ يُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۵۱

''اس نے کہا تمھارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلایا؟ انھوں نے کہا اللہ کی پناہ! ہم نے اس پر کوئی برائی معلوم نہیں کی۔ عزیز کی بیوی نے کہا اب حق خوب ظاہر ہوگیا، میں نے ہی اسے اس کے نفس سے پھسلایا تھا اور بلاشبہ وہ یقیناً سچوں سے ہے۔''

بادشاہ نے تحقیقات شروع کر دیں۔ ہاتھ کاٹنے سے متعلق تمام خواتین کو طلب کر لیا گیا اور پوچھ کچھ ہونے لگی۔ سبحان اللہ! یہ بھی کیا شان والا قیدی ہے جس کے لیے آج دربارِ شاہی عدالت کا روپ دھار چکا ہے۔ بادشاہ خود مسندِ قضا پر براجمان، پورے انہماک اور تمام تر توجہ سے تحقیق کر رہا ہے۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سچ کو کچھ عرصے کے لیے چھپایا تو جا سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے دفن نہیں کیا جا سکتا، سو آج وقت آ گیا تھا کہ حق عیاں ہوتا اور برسوں سے پنہاں حقیقتیں اچھال کے سامنے لائی جاتیں۔ جب پورے اہتمام اور تمام تر حدود و قیود سے بادشاہ نے ان بیگمات سے دریافت کیا:

''تمھارا کیا معاملہ تھا جب تم نے یوسف کو اس کے نفس سے پھسلایا؟''

تو ایک بھی نہ تھی جس نے یوسف کے ذمے ادنیٰ یا کوئی معمولی سے معمولی لغزش بھی لگائی ہو۔ سب بے اختیار ہو کر یکبارگی پکار اٹھیں:

''اللہ کی پناہ! ہم نے اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔''

اب مزید تحقیق کی کیا ضرورت تھی جب خود مدعی نے حریف پر لگائے گئے الزامات کو بے اصل قرار دے دیا تھا، سو اب سب عیاں ہو چکا تھا۔ جھوٹ، سازش اور مکر و فریب اپنی

موت آپ مر چکے تھے۔ سچ کا جادو سب کے سر چڑھ کر بول رہا تھا اور یہ کوئی ایسا ہی سچ کا لمحہ تھا کہ اس سازش کی سرغنہ، عزیز مصر کی بیوی بھی بے خود ہو کر کہنے لگی:

''اب جب حق ظاہر ہو ہی گیا تو چھپانے سے کیا حاصل؟ سچ بات یہی ہے کہ میں نے ہی اسے ورغلایا تھا، قصور میرا ہی ہے، جہاں تک یوسف کی بات ہے تو یقیناً وہ سچوں میں سے ہے۔''

اب تو تمام معاملہ بالکل ہی کھل گیا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کے شاہی در و دیوار تک گواہ ہو چکے تھے۔ جھوٹ اور مکر کے الزام کی وہ کالک جو کل سیدنا یوسف علیہ السلام کے چہرے پر مل دینا چاہی تھی۔ آج خود مدعی اپنے ہاتھوں اپنے چہرے پہ مل چکا تھا۔ یوسف تو ہمیشہ سے سچا ہی تھا مگر آج اس کی سچائی کا اعتراف کر لیا گیا تھا۔

❀❀❀

خود نمائی نہیں، صرف دامن کی صفائی

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾

''یہ اس لیے کہ وہ جان لے کہ بے شک میں نے عدم موجودگی میں اس کی خیانت نہیں کی اور یہ کہ بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو کامیاب نہیں کرتا۔''

الفاظ قرآن مجید پر تدبر سے آشکار ہوتا ہے کہ مجلس تحقیق میں یوسف علیہ السلام موجود نہ تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ خود فرما چکے تھے کہ جب تک میرے معاملے کا فیصلہ نہیں ہو جاتا میں جیل سے باہر نہیں آؤں گا۔ دوسرے ''یعلم'' کے لفظ پر غور کیجیے اس کا مطلب ہے ''وہ بادشاہ جان لے کہ'' اب یہاں غائب کے لفظ بتاتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام بدستور جیل میں تھے، ان کی غیر موجودگی میں تحقیق و تفتیش ہوئی۔ قاصد نے جیل ہی میں آ کر انھیں یہ خوشخبری سنائی تو یہاں انھوں نے یہ لفظ بولے کہ میرا تحقیق کروانے کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ جان لے کہ میں خائن

نہیں ہوں۔ اگر یوسف علیہ السلام مجلس میں ہوتے تو پھر "لیعلم" کے بجائے 'لتعلم' یعنی "وہ جان لے" کی بجائے "آپ جان لیں" کے الفاظ ہونے تھے۔

بہر حال یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ میرا مقصد تحقیق یہ تھا کہ پتا چل جائے یوسف خیانت کرنے والا نہیں، یہ بہت اہم بات ہے اور اس کا اظہار یوسف علیہ السلام کے لیے کئی وجوہ سے ضروری تھا۔ آپ عزیز مصر کا دل بھی صاف رکھنا چاہتے تھے کیونکہ وہ آپ کا بہر حال ایک محسن تھا۔ اس نے ایک غلام کو نہایت بیش قیمت پر خریدا، گھر لائے بیٹوں جیسا آرام اور محبت دی، ہر طرح سے خیال رکھا تو اسے بھی یہ بتانا ضروری تھا کہ تمھاری ان محبتوں اور عنایتوں کے جواب میں سیدنا یوسف علیہ السلام نے کوئی خیانت نہیں کی۔ اپنے کردار کو صاف رکھنا ایک داعی کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے اس کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَسْجِدِ وَ عِنْدَهُ أَزْوَاجُهُ فَرُحْنَ، فَقَالَ لِصَفِيَّةَ بِنْتِ حُيَيٍّ لَا تَعْجَلِي حَتّٰى أَنْصَرِفَ مَعَكِ، وَ كَانَ بَيْتُهَا فِي دَارِ أُسَامَةَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهَا فَلَقِيَهُ رَجُلَانِ مِنَ الْأَنْصَارِ فَنَظَرَا إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ أَجَازَا، فَقَالَ لَهُمَا النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : تَعَالَيَا، إِنَّهَا صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ، فَقَالَا : سُبْحَانَ اللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ : إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِيْ مِنَ الْإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ، وَ إِنِّيْ خَشِيْتُ أَنْ يُّلْقِيَ فِيْ أَنْفُسِكُمَا شَيْئًا»

[بخاري، كتاب الاعتكاف، باب زيارة المرأة زوجها في اعتكافه : ۲۰۳۸]

"رسول اللہ ﷺ مسجد میں معتکف تھے اور آپ کے پاس آپ کی زوجہ محترمہ تشریف لائی ہوئی تھیں، آپ نے اپنی زوجہ محترمہ یعنی صفیہ بنت حیی سے فرمایا، جلدی نہ کرو میں تمھیں چھوڑ آؤں گا۔ ان کا گھر دارِ اسامہ میں واقع تھا چنانچہ

آپ ان کے ساتھ نکلے راستے میں دو انصاری صحابی ملے انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا اور چل دیے، رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو واپس بلایا اور کہا یہ خاتون (میری بیوی) صفیہ بنت حیی ہے انھوں نے تعجب سے کہا: سبحان اللہ! اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے متعلق بھی کوئی ایسا گمان کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: شیطان انسان میں مانند خون گردش کرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں تمھارے دلوں میں بھی غلط بات نہ ڈال دے۔''

دیکھیے رسول اللہ ﷺ کی ذات کے متعلق ایک صحابی ایسا تصور بھی نہیں کر سکتا مگر اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے یہاں وضاحت ضروری سمجھی۔ جب رسولِ رحمت ﷺ کا انداز یہ ہے تو پھر ہم جیسے دعوت کے ذمہ داروں کو شکوک وشبہات سے بچنا اور ایسے معاملات میں جہاں سے شیطان کو غلط فہمی پھیلانے کا موقع ملے، اجتناب کرنا بہت ہی لازم ٹھہرتا ہے۔ یہ دعوت کا بہت بنیادی نکتہ ہے جو اسے فراموش کر دے اس کی دعوت کبھی برگ بار نہیں لا سکتی۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ کبھی پاکباز افراد پہ غلط الزام بھی لگ جاتا ہے، جیسے ہم قصۂ یوسف میں ملاحظہ کرتے ہیں، مگر صبر وتحمل سے ایسے وار کو سہہ کر رب سے دعا کرنا چاہیے، بہت جلد اللہ تعالیٰ کی مدد اترتی ہے اور معاملے کی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔ پھر یہاں اک عجیب پہلو یہ ہے کہ جو لوگ ایسی سازش کسی شخص کو بدنام کرنے کے لیے کرتے ہیں ان کو یوں منہ کی کھانا پڑتی ہے کہ حقیقت سامنے آنے کے بعد مظلوم شخص لوگوں کی اور زیادہ محبت و چاہت کا مستحق بن جاتا ہے۔ حاسدین جو عزت اور وقار ایسے شخص کا چھیننا چاہتے ہیں وہ تو خیر باقی رہتا ہی ہے مگر یہ سازش اور یہ الزام اس کی عزت کو مزید چار چاند لگا جاتے ہیں۔ سو ایسے مراحل میں جبر اور اشتعال کی بجائے صبر اور دعا سے کام لینا چاہیے۔

«اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ» : یہ بہت سمجھنے کی بات ہے عام مسلمانوں کے لیے بھی اور بالخصوص جماعت سے منسلک ذمہ داران کے لیے بھی۔

میرے بھائی! اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اصلاح ہو، ہم فوز و فلاح سے ہم رکاب ہوں، ہماری دعوت اقصائے عالم تک پہنچے اور وہ لوگوں کے دلوں میں اترتی جائے، ہمارے مراکز پھلیں پھولیں اور ہماری مساجد آباد ہوں، تو ہمیں ہر قسم کی خیانت سے اپنے آپ کو بچانا ہو گا۔ جو شخص اپنے آپ کو زبان کی خیانت، آنکھ کی خیانت اور دیگر تمام خیانتوں سے بچاتا ہے تو اللہ اس کی دعوت میں مثل سحر اثر ڈال دیتا ہے۔

ایسے کردار کے حامل لوگ ہی وہ افراد ہوتے ہیں جو معاشروں میں یکہ و تنہا بھی ہوں تو اللہ لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر ان کے گرد لا کھڑے کرتا ہے۔ یہ کسی معاملے میں پھنس جائیں تو رب خود دشمنوں کے قبیلوں سے ان کے حق میں گواہیاں فراہم کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ کی طرف سے رہنمائیاں نزول کرتی ہیں۔ عزتوں اور سیادتوں کے یہی لوگ حق دار ہوتے ہیں۔ جو بچتا نہیں، اس کے لیے عزت و نعمت میں سے کچھ بھی نہیں، وہ یہاں بھی بدنام اور آخرت میں بھی سیاہ نام۔ کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ''ہاتھ کی صفائی'' دکھا جاتے ہیں اور پھر جب کہیں پھنس جائیں تو زبان کی تیزی بروئے کار لاتے ہیں۔ مگر ایسے بھائیوں کو سمجھنا چاہیے یہ لوگ بچ نہیں سکتے، بالآخر دھر لیے جاتے ہیں کسی کردہ جرم میں ماخوذ نہ ہو سکیں تو مکافاتِ عمل کا شکار ہو کر کسی نا کردہ گناہ میں دھر لیے جاتے ہیں۔ آیت مقدسہ پکار پکار کے کہتی ہے کہ رب خائنوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کے لیے بچنے اور نکلنے کے کوئی راستے نہیں۔ رب تو اسے بچاتا ہے جو پاک ہوتا ہے۔ ہاں اگر ایسے جرائم کے مرتکب لوگ بچنا چاہتے ہیں تو سچی توبہ کر کے پاک ہوں تو پھر ان کے لیے بھی رب راستے بنا دے گا، خیانت کیسی بھی ہو بہت بری چیز ہے۔

تو ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ خیانت سے پاک کردار ہی دراصل وہ کنجی ہے جس سے سیادت و عظمت کے محل کے دروازے کھلتے ہیں اور بدکرداری ہی وہ عمل ہے جس سے عزتوں کے کھلے دروازے بھی مقفل ہو جاتے ہیں۔

❀❀❀

مومن کے شایان، ہر حال میں حمد کا بیان

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ اِنَّ رَبِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۳﴾

''اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے۔ بے شک میرا رب بے حد بخشنے والا، نہایت رحم والا ہے۔''

یہاں سیدنا یوسف علیہ السلام نفس کی سرکشی اور اس کی نفسیات کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ دراصل ایک دانا شخص ہمیشہ اپنی گفتگو کے عواقب و نتائج اور مضمرات پر نظر رکھتا ہے۔ وہ ہر لفظ سوچ کر اور تول کر بولتا ہے۔ زبان کی حفاظت نہایت ضروری ہے، یہ منہ سے نکلنے والے وہ الفاظ ہی ہیں جن کو کبھی انسان بہت کم اہمیت دیتا ہے مگر وہ اس کے جنتی یا جہنمی ہونے میں حرفِ مفصل ثابت ہوتے ہیں:

((إِنَّ الْعَبْدَ يَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا، يَرْفَعُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَاتٌ، إِنَّ الْعَبْدَ يَتَكَلَّمُ بِالْكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللّٰهِ لَا يُلْقِيْ لَهَا بَالًا، يَهْوِيْ بِهَا فِيْ جَهَنَّمَ)) [بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان : ٦٤٧٨ـ مسلم : ٧٦٧٣]

''بے شک انسان اللہ کی رضامندی کا کوئی کلمہ کہتا ہے، مگر اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، تاہم اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے اس کے درجات بلند فرما دیتا ہے اور اسی طرح انسان اللہ کی ناراضگی پر مبنی کوئی کلمہ کہتا ہے اور اسے اس کی پروا نہیں ہوتی مگر اللہ تعالیٰ اسے اس کلمے کی وجہ سے جہنم میں پھینک دیتا ہے۔''

تو یوسف علیہ السلام نے چونکہ پچھلی آیت میں یہ فرمایا تھا:

''میں نے تحقیقات کا یہ معاملہ اس لیے کیا تا کہ وہ جان لے کہ میں خائن نہیں ہوں۔''

گو یہ ایک امر حقیقت بات تھی مگر پھر بھی اس میں نفس کی قدرے بڑائی کا پہلو ثابت ہو سکتا ہے، اور اپنے آپ کی بڑائی یا پاکیزگی بیان کرنا اہل علم اور اہل مراتب کا شیوہ نہیں ہوتا۔ انبیائے کرام علیہم السلام کو تو تمام انسانوں سے بڑھ کر منشائے الٰہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں منشائے الٰہی کیا ہے؟ قرآن مجید سے دو آیات دیکھیے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ﴾ [النساء : ٤٩]

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو پاک کہتے ہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے پاک کرتا ہے۔''

نیز سورۂ نجم میں ارشاد فرمایا:

﴿ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴾ [النجم : ٣٢]

''سو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو، وہ زیادہ جاننے والا ہے کہ کون بچا۔''

پچھلی گفتگو کے منفی اثرات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے فوراً پیغمبر نے انکسار اور عاجزی کا پیرایہ انتخاب فرما لیا۔ کہنے لگے کہ اگر رب قدیر نے مجھے ان بہت نازک حالات اور سنگین واقعات سے مکھن میں سے بال کی طرح نکال لیا ہے تو اس میں میرا کچھ کمال نہیں۔ یہ تو اللہ کا خاص فضل و کرم ہے ورنہ نفس تو میرا بھی برائی پہ آمادہ کرنے والا اور معصیت پر ابھارنے والا ہے۔ یہ کہنے میں کچھ کسر شان بھی نہیں ہوتی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان اس کی تائید کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا وَ قَدْ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيْنُهٗ مِنَ الْجِنِّ))

''تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ اس کے ساتھ جنوں میں سے ایک ساتھی مقرر ہے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نہایت تعجب سے استفسار فرمایا:

((وَ اِيَّاكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ !))

''اے اللہ کے رسول! کیا آپ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہے؟''

آپ نے فرمایا:

《 وَ اِیَّایَ اِلَّا اَنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیْ عَلَیْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا یَأْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ 》

[مسلم، کتاب صفات المنافقین، باب تحریش الشیطان...... الخ : ۲۸۱٤]

''ہاں میرے ساتھ بھی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اس پر میری مدد فرمائی ہے، چنانچہ وہ مطیع ہو گیا ہے، سو وہ مجھے بھلائی کے علاوہ کچھ نہیں کہتا۔''

تو یہی بات یہاں یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں کہ اگر میں بچ گیا ہوں تو یہ نا تو میری کوئی خوبی اور بڑائی ہے اور نہ کوئی فضیلت بس، یہ اللہ ہی کا احسان و کرم ہے ورنہ انسان کی بساط ہی کیا؟ یہ بہت بڑی تربیت اور دعوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نیکی کی ہمت دے دے یا گناہ سے بچنے کی توفیق عنایت فرما دے تو انسان اتراتا نہ پھرے، اپنے نفس کی عظمت و تقدیس کے گن نہ گاتا پھرے بلکہ تشکر و امتنان سے رب کے حضور پیشانی جھکا دے کہ یا اللہ یہ سب تیرا ہی فضل ہے۔

یہاں نفس انسانی کو برائی پر ابھارنے والا کہا گیا ہے یعنی ''نفس امارہ بالسوء۔''

نفس کی قسمیں:

قرآن مجید کے دوسرے دو مقامات پر اسی نفس انسانی کے دو اور نام اور کام بھی ملتے ہیں، بلکہ سورۂ قیامہ میں تو اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس کی قسم کھائی ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

《 وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ 》 [القیامۃ : ۲]

''اور نہیں، میں بہت ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں!''

سورۃ الفجر میں اس نفس کو نفس مطمئنہ کہہ کر جنت کی بشارت سنائی گئی، ملاحظہ فرمایئے:

《 یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً 》 [الفجر : ۲۷، ۲۸]

''اے اطمینان والی جان! اپنے رب کے پاس واپس آ، اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے، وہ تجھ سے راضی۔''

تو یہ تضاد کیوں ہے؟ دراصل یہ تضاد نہیں، بنیادی طور پر نفس انسانی برائی کی طرف آمادہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کی سرشت اور فطرت میں برائی کی رغبت رکھ دی گئی ہے مگر انسان ایمان اور عقیدہ کی پختگی اور عمل صالح کے ساتھ جب نفس کے اس سرکش گھوڑے کو لگام ڈال لیتا ہے تو پھر یہ نفس لوامہ بن جاتا ہے یعنی تب یہ انسان کے برائی کرنے پر اسے ملامت کرتا ہے، اسے آپ ضمیر بھی کہہ سکتے ہیں اور پھر جب خواہش نفس کے خلاف محنت اور مسلسل عمل صالح کی پختگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب یہ نفس نیکی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا نفس، نفس مطمئنہ ہو جاتا ہے۔

تو یہ انسانی نفسوں کی قسمیں ہیں، سیدنا یوسف علیہ السلام نفس کی کمزوری کی بات کرتے ہیں کہ وہ تو برائی پر ابھارنے والا ہی ہے۔

«مَا رَحِمَ رَبِّیْ» ہاں ان لوگوں کو نفس فریب نہیں دے سکتا جن پر اللہ تعالیٰ رحم کرتے ہوئے انھیں بچا لے۔

عصر حاضر کا ماحول اور نفس امارہ:

آج ہمارا ماحول بھی بہت آلودہ ہو چکا ہے۔ فحاشی اور عریانی کا ایک منہ زور طوفان ہے جو ہر اخلاقی حد توڑتا چلا جا رہا ہے۔ حیا باختگی کے اس سمندر میں گویا طغیانی آئی ہوئی ہے۔ آپ گھر میں ہیں تب بھی محفوظ نہیں، بازار میں نکل آئیں تب بھی مامون نہیں۔ گھر میں ہوں تو ٹی وی جیسی خرافات موجود ہیں۔ ناچ گانا، رقص وسرود اور موسیقی کا چلن عام ہے۔ اب کمپیوٹر اور نیٹ کی مصیبت بھی گھروں میں گھس آئی ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ سے تو شرفا بہر حال کنی کتراتے تھے مگر اب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے بڑی بڑی پگڑیوں اور برقعوں میں بھی نقب لگا لیا ہے۔ یہ گھروں کے اندر کی حالت ہے۔ آپ بازاروں کو دیکھ لیں وہاں عریاں بورڈز اور جانے کیا کیا خرافات دل و نگاہ کے لیے سامانِ گناہ مہیا کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ صابن کی ٹکیہ اور ماچس کی ڈبیا تک آج عورت کی تصویر کے بغیر نہیں

ملتی۔ عورت جو کبھی ماں بہن، بیٹی یا بیوی کے روپ میں تقدیس اور حرمت کی حامل تھی آج ان آزادیٔ نسواں کے جعلسازوں کے ہاتھوں چڑھ کر منڈی کا مال اور ایک کاروباری اشتہار بن کے رہ گئی ہے۔ یہ ماحول ہے آج جو ہمیں میسر ہے یعنی برائی کے لیے ساز گار اور نیکی سے دور لے جانے والا اور ادھر آپ نے دیکھ لیا خود نفس بھی برائی پر آمادہ کرنے والا ہے تو ایسے میں بچنا بہت مشکل اور محال ہو جاتا ہے۔ حالات بڑے کٹھن ہیں۔ اس معاونِ گناہ ماحول اور نفس امارہ کے زور پر آج برائی ننگا ناچ ناچ رہی ہے اور نیکی گویا منہ چھپائے پھرتی ہے تو ان حالات میں بچنے کا طریقہ کیا ہے؟

بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے شعور بیدار کیا جائے، حقیقی آگہی کو زندہ کیا جائے، بندے میں نیکی اور برائی سمجھنے کا احساس تو ہونا چاہیے، روشنی اور اندھیرے میں تمیز تو ہو، جب نیکی کو نیکی اور برائی کو برائی کہنے کا تصور موجود ہو تو پھر برائی پر ملال اور نیکی پر مسرت ہوتی ہے اور دراصل یہی ایمان کی علامت ہے۔ یہی ضمیر کی زندگی کی نشانی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہماری رہنمائی کرتا ہے، فرمایا:

«إِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَ سَاءَ تْكَ سَيِّئَتُكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ»

”جب تیری نیکی تجھے خوش کر دے اور تیرا گناہ تجھے پریشان کر دے تو تو مومن ہے۔“

[مستدرك حاكم : ۱/ ۵۸، ح : ۳۳۔ مسند أحمد : ۵/ ۲۵۱، ح : ۲۲۲۱۳]

تو پہلے تو یہ احساس بیدار ہونا چاہیے۔ انسان اگر نیکی ہوتے دیکھے یا خود کرے تو اسے خوشی محسوس ہو اور اگر برائی کرے، یا ہوتے دیکھے تو اسے پریشانی اور دکھ ہونا چاہیے، مگر دکھ کی بات ہے کہ آج بہت سے لوگ اس سے بھی گزر گئے ہیں، حالانکہ یہ ایمان کی ادنیٰ علامت ہے، ارشادِ نبوی ہے:

« مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَ ذٰلِكَ أَضْعَفُ الْإِيْمَانِ»

[مسلم، كتاب الإيمان، باب بيان كون النهي عن المنكر من الإيمان : ٤٩]

"تم میں سے جو کوئی برا کام ہوتے ہوئے دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ (کی طاقت) سے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اسے ختم کرنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ایسا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو تو پھر دل سے اس کو برا سمجھے...... اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ نجی زندگی میں مداخلت ہے، جو کچھ بھی کوئی کرتا ہے اسے کرنے دو۔ نہیں یہ ایمانی نہیں ملحدانہ سوچ ہے۔ بہر حال احساس پیدا کرنا گناہ سے بچنے کی پہلی سیڑھی ہے، آزما کے دیکھ لیں اس سے بھی بہت فرق پڑتا ہے، پھر دوسرے نمبر پر اللہ کے ذکر کو بکثرت کیجیے یہ ذکر بہت کارآمد ہے۔ یہ بہت بڑا ہتھیار ہے مومن کا، مومن اس کے ساتھ بڑی بڑی برائیوں کو ٹال دیتا ہے اور بڑے کٹھن حالات سے سرخرو ہو کے نکل آتا ہے۔ نماز کو اللہ تعالیٰ نے ذکر قرار دیا ہے اور اس کے فائدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بندہ برائی اور بے حیائی سے بچتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ﴾ [العنکبوت : ٤٥]

"بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑا ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لکل شیء صقالۃ))

دراصل ذکر ہی ہمارے لیے برائی سے ڈھال بنتا ہے۔ انسان جونہی ذکر سے غافل ہوتا ہے شیطان دل پہ غلبہ وتسلط جمانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھیے قرآن مقدس یہی ارشاد کر رہا ہے:

﴿ وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ﴾ [الزخرف : ٣٦]

"اور جو شخص رحمٰن کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں پھر وہ اس کے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے۔"

تو یہ ذکر الٰہی ہے جس سے انسان کا ایمان مضبوط ہوتا ہے اور ایمانی قوت میں بڑھوتری عمل میں آتی ہے۔ پھر انسان ایمانی حصار میں رہتا ہے اور یوں وہ برائیوں سے بچ جاتا ہے۔

بہر حال یوسف علیہ السلام ایک پیغمبر ہیں اور پیغمبر کا نفس نفس مطمئنہ ہوتا ہے مگر یہ رب کے حضور ان کی انکساری کا اظہار ہے۔ دراصل یہ امت کے لیے تربیت ہے کہ جب اچھا کام ہو تو نسبت رب کی طرف کرو مگر برائی کی نسبت اپنی طرف ہونی چاہیے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام ساتھ ہی رب کی رحمت کو بھی آواز دیتے ہیں کہ اگر کہیں بشری تقاضے کے تحت کوئی غلطی ہو بھی جائے تو رب بڑا رحم کرنے والا اور بخشش دینے والا ہے۔ تمام تر کوشش کے بعد اگر کہیں کوتاہی ہو بھی جائے تو پھر رب معاف کرنے والا ہے، ہم اس کی رحمت کے طلبگار اور اس کی مغفرت کے امیدوار ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو عزیز مصر کی بیوی کا بیان قرار دیا ہے لیکن جب اس آیت کو اس کے سیاق میں دیکھیں تو یہ بات قرین قیاس دکھائی نہیں دیتی زیادہ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے کلامِ سیدنا یوسف علیہ السلام ہی قرار دیا جائے۔ واللہ اعلم بالصواب

❀❀❀

یوسف، صاحبِ اختیار اور امانتدار!

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ﴿٥٤﴾

”اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے لیے خاص کر لوں، پھر جب اس نے اس سے بات کی تو کہا بلاشبہ تو آج ہمارے ہاں صاحبِ اقتدار، امانتدار ہے۔“

بادشاہ اب پوری طرح سیدنا یوسف علیہ السلام سے متاثر ہو چکا تھا کیونکہ وہ آپ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف اوراقِ بے مثال ملاحظہ کر چکا تھا۔ مثلاً:

- وہ یوسف علیہ السلام کے بے مثال علم کا قائل ہو چکا تھا کیونکہ جب سب درباری اہل علم وفن نے اس کے خواب کی تعبیر کرنے سے ہار مان لی اور اس خواب کو پراگندہ خیالات قرار دیا تو یہ صرف یوسف علیہ السلام ہی تھے جنھوں نے نہایت بصیرت افروز تعبیر فرمائی اور یہ بات یوسف کی بے پناہ عقل اور وسیع علم پر دلالت کرتی تھی۔
- بادشاہ ملاحظہ کر چکا تھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کمال صبر و استقامت سے اپنی زندگی کے سات بہترین سال جیل کی کوٹھڑی کی نذر کر دیے مگر جب نجات اور خلاصی کا اذن ملا تو نہایت تحمل اور بردباری سے پہلے تہمتوں کے ازالے کے لیے تحقیقات کا مطالبہ کیا اور زیرک بادشاہ کو علم تھا کہ ایسا مطالبہ کوئی غیر معمولی شخص ہی کر سکتا ہے کم از کم وہ جسے اپنی براءت کا پورا یقین ہو اور جو اپنی عزت وحمیت کو اتنی اہمیت دیتا ہو۔
- پھر بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کے حسنِ ادب کے عجب قرینے ملاحظہ کیے تھے کہ جب اس نے اپنے محسن کی بیوی کی بجائے مصری خواتین کا کہہ کر گویا احسان مندی اور ظرف کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کی۔
- بادشاہ کا ساقیٔ خاص سیدنا یوسف علیہ السلام کی معیت میں رہ چکا تھا۔ ضرور بادشاہ اس سے بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کی فطری سادگی، طبعی معصومیت، احسان کرنے کی عادت اور اچھی طبیعت کے قصے سن چکا ہوگا۔
- سات سال جیل کاٹنا بجائے خود اک عزیمت کا کام تھا۔ یہ ساری خوبیاں اگر کسی ایک شخص میں جمع ہو جاتی ہیں تو دیکھنے والی آنکھ یقیناً محسوس کر لیتی ہے کہ یہ انسان معمولی نہیں، یہ ہر اعتبار سے ایک تراشیدہ ہیرا اور مجموعۂ کمالات شخص ہے۔

چنانچہ یہی وہ اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ تھے جن کی بدولت بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کے متعلق نہایت اہم فیصلہ کر لیا کہ انھیں اپنی بادشاہت میں کوئی نہایت اعلیٰ منصب عطا کریں گے۔

چنانچہ اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے پاس لایا جائے وہ انھیں اپنا مشیر خاص بنانا چاہتا ہے۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کو بلایا گیا۔ اب شاہِ مصر نے یوسف علیہ السلام سے

گفتگو کی۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس نے اپنے خواب کی دوبارہ تعبیر سنانے کی فرمائش کی جو یوسف علیہ السلام نے سنا دی۔ ممکن ہے یہ بھی ہوا ہو بہر حال شاہِ مصر پہلے ہی فراستِ یوسف کا قائل تھا گفتگو سے مزید متاثر ہوا ہو گا۔ جب گفتگو کر کے اسے سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق کامل یقین ہو گیا تو اب اس نے کھل کے اور صاف صاف یوسف علیہ السلام کو بتا دیا:

«اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ» ''آج کے بعد آپ ہمارے ہاں نہایت قابل احترام اور امانت دار ہیں۔''

ظاہر ہے کسی بادشاہ کا اتنا کہہ دینا کسی بھی شخص کی اس کے ہاں قدر و منزلت اور شرف و کرم پر دلالت کرتا ہے۔ جناب یوسف علیہ السلام نے محسوس کر لیا کہ وہ اب آپ کو حکومت میں کوئی اہم عہدہ دینے والا ہے۔ یہ بڑی قدر و منزلت کی بات تھی۔ یہ وہ اجر ہے جو رب اپنے محسن اور مخلص بندوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ وہ منصب ہے جو قربانیاں دینے والے لوگوں کا رب کے ہاں انعام ہوتا ہے۔ بہر حال آج یوسف علیہ السلام ایک قیدی یا عام فرد کی حیثیت والے نہ تھے۔ سبحان اللہ تیری بھی کیا شان ہے مولا، کل بازارِ مصر میں غلام کی صورت بکنے والا نوجوان آج شاہِ مصر کے ہاں سب سے زیادہ معتمد، سب سے زیادہ معتبر، سب سے اہم شخصیت اور دستِ راست ہے۔ سچ فرمایا قرآن مقدس نے:

﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾

❀❀❀

وزارتِ خوراک تک رسائی

قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ ﴿٥٥﴾

''اس نے کہا مجھے اس زمین کے خزانوں پر مقرر کر دے، بے شک میں پوری طرح حفاظت کرنے والا، خوب جاننے والا ہوں۔''

جب یوسف علیہ السلام کی شاہِ مصر سے بات چیت ہو گئی اور مفسرین نے یہاں قدرے تفصیل

بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں بادشاہ ستر زبانیں جانتا تھا اور یوسف علیہ السلام نے تمام زبانوں میں اس سے گفتگو کی۔ بہر حال گفتگو میں بادشاہ نے واضح کر دیا کہ آپ ہمارے ہاں صاحب منزلت ہیں، مکین ہیں، یعنی ملکی امور چلانے میں اہم ذمہ دار ہوں گے نیز جو ہمارے پاس ہے وہ آپ کا ہے یعنی آپ اس کے امین ہیں جب یہ بات طے ہو چکی کہ بادشاہ نے منصب دینا ہے اور وہ آپ سے کام لینا چاہتا ہے تو آپ نے اپنے حسبِ قابلیت ولیاقت اس کے سامنے یہ تجویز پیش کر دی کہ اگر آپ ایسا طے ہی کر چکے تو پھر مجھے وزارت خزانہ پہ مامور کر دیجیے کیونکہ اس کے لیے مطلوبہ اہلیت یعنی اس کے جملہ امور کی حفاظت اور اس کے متعلق تمام معاملات کا میں علم رکھتا ہوں۔ دراصل 'حفیظ' اور 'علیم' بڑے جامع لفظ ہیں جو وزارتِ خوراک یا خزانہ کے مطلوبہ معیار کے تمام تقاضوں کا احاطہ کرتے ہیں۔

یہاں ایک مسئلہ بہت سمجھ لینے کا ہے کہ یوسف علیہ السلام خود عہدہ نہیں مانگ رہے بلکہ شاہِ مصر کے فیصلہ کر لینے کے بعد محض تجویز پیش کر رہے ہیں۔ عہدہ دینے کا تو وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا اور اپنے اس ارادے سے یوسف علیہ السلام کو آگاہ بھی کر چکا ہے۔ دیکھیے قرآن مجید کے سیاق اور اسلوب پر غور کیجیے۔ پچھلی آیت سے اس کا تعلق ہے اسی کے پس منظر میں صحیح معنی سمجھا جا سکتا ہے۔ دیکھیے قرآن مجید نے صراحت فرما دی ہے کہ:

«فَلَمَّا كَلَّمَهُ»

جب بادشاہ نے اس سے بات کر لی تو تب آپ نے یہ کہا «اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ» یہ کہنا کہ آپ نے عہدہ مانگا اور اس یوسف کے بارے میں کہنا کہ جس کا تحمل اور عہدہ مانگنا تو شریعت میں جائز ہی نہیں۔ بلکہ اس سے تو جمہوری نظام کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ جو مانگے اسلام تو اسے عہدہ دیتا ہی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّا لَنْ نَسْتَعْمِلَ عَلَى عَمَلِنَا مَنْ أَرَادَهُ»

[مسلم، كتاب الإمارة، باب النهي عن طلب الإمارة والحرص عليها : ١٥/٧٣٣، ١٦٥٢ ـ نسائي : ٤ ـ مستدرك حاكم : ٤/١٠٠]

''ہم عہدہ کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو خود اس کا طالب ہو۔''

عہدے تو اسلام میں ہوتے ہی نہیں اور جو خود مانگے اسے ملتے ہی نہیں اسلام میں تو ذمہ داریاں ہیں بھاری اور ڈرا دینے والی ذمہ داریاں ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس آدمی کو دس بندوں کا امیر بنا دیا گیا، قیامت کے روز وہ جکڑ کے رب کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اگر وہ عادل تھا تو اس کا عدل اسے آزادی اور رہائی دلا دے گا اور ظالم تھا تو یونہی جکڑا رہے گا اس کے لیے کوئی نجات نہ ہوگی۔ ایک موقع پر فرمایا:

''جو امیر بنا دیا گیا وہ تو گویا کند چھری سے ذبح کر دیا گیا۔''

[مستدرك حاكم : ٧٠١٨]

نیز سیدنا عبدالرحمٰن بن سمرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

((يَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ ! لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ، فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا، عَنْ مَسْأَلَةٍ، وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَ إِنْ أُعْطِيتَهَا، عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ، أُعِنْتَ عَلَيْهَا))

[مسلم : كتاب المغازي، باب النهي عن طلب الإمارة...... الخ : ١٦٥٢]

''کبھی کوئی امارت مت مانگو، کیونکہ خود سوال کر کے عہدۂ امارت حاصل بھی کر لو گے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی تائید نہیں ہوگی کہ جس کے ذریعے تم لغزشوں اور خطاؤں سے محفوظ رہ سکو اور اگر بغیر درخواست اور طلب کے تمھیں کوئی عہدہ مل گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و اعانت ہوگی۔ جس کے باعث تم اس کے حقوق ادا کر سکو گے۔''

تو یہ بنیادی اختلاف ہے جمہوریت سے اسلام کا ...... اسلام تو مانگنے والوں کو عہدہ دیتا ہی نہیں وہ تو جسے لائق اور ذمہ دار سمجھتا ہے اس کے سپرد کرتا ہے اور ذمہ دار اس سے بچتے پھرتے ہیں مگر جمہوریت میں تو امیدوار کھل کے میدان میں آتا ہے۔ بھرپور طریقے سے مانگتا ہے بلکہ لوگوں کو بتاتا ہے کہ میرے علاوہ کوئی اور اس کے لائق ہی نہیں، تمھارے ووٹ اور اس عہدے کا مجھ سے زیادہ حق دار ہے ہی کوئی نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک دعوے کیے

جاتے ہیں۔ باقاعدہ جنگ وجدل کا میدان لگتا ہے۔مخالفین کی کردار کشی کی جاتی ہے۔توہین و رسوائی، وہ طوفانِ بدتمیزی اٹھتا ہے کہ اللہ بچائے، دراصل یہ سارا نظام ہی غلط اور باطل ہے۔

اسلامی نظام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ بندوں کا انتخاب کر لیتا ہے پھر لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے یا اللہ جماعتوں اور قوموں کا انتخاب فرما کے ان کو غلبہ عطا کر کے سیادت سونپ دیتا ہے۔سب کے دلوں میں مہر و محبت ڈال دیتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کو ملتا ہے جو محنت اور قربانی کو شعار بناتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کسی ایک کو بلند کر دیتا ہے۔ ساری قوم کے دل جس کے حضور مطیع ہو جاتے ہیں۔ اب یہاں یوسف علیہ السلام کو دیکھیے، انھوں نے کون سے الیکشن لڑے ہیں، جیل بیٹھے ہوئے تھے کہ رب نے ان کا انتخاب فرما لیا، پھر تمام رکاوٹیں ان کے لیے نرم ہوتی گئیں تمام معاملے سہل ہوتے گئے اور آج ان کے ہاتھ میں وزارتِ خزانہ کا قلمدان ہے۔

تو یہ ایک خالص اور فطری نظام ہے، جہاں الیکشن لڑنے پڑتے ہیں اور نہ کسی دوڑ میں مقابلے کرنے پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو سیاست کو بہت گندہ کر دیا گیا ہے بلکہ ایک گالی بنا کے رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ سیاست بری نہیں اچھی ہے۔ لوگوں کے مسائل حل کرنا اور معاشرے چلانا ہی تو سیاست ہے مگر پاکستان کی سیاست میں جو اوپر بیٹھا ہے وہ نیچے والوں کا بیڑا غرق کرتا جاتا اور اسے سیاست کہتے ہیں، یہ کوئی سیاست نہیں، سیاست تو ہمدردی اور اخلاص و محبت سے جنم لیتی ہے۔ اس میں تو قربانی دینے کی خو ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَانَتْ بَنُوْا إِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ))

[مسلم، كتاب الإمارة، باب وجوب الوفاء ببيعة...... الخ : ١٨٤٢]

”بنی اسرائیل کی سیاست ان کے انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پا جاتا تو دوسرا اس کی جگہ لے لیتا۔“

سیدنا یوسف علیہ السلام بھی تو بنی اسرائیل میں سے تھے اللہ تعالیٰ نے انھیں وزارتِ خزانہ عطا کر دی اور بعد ازاں پورا ملک ان کے زیر نگیں کر دیا۔ بہر حال یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے عہدہ مانگا نہ تھا بلکہ عطا ہونے پر اپنی صلاحیتوں کے موافق و مناسب امر پر بادشاہ کی رہنمائی کی تھی اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔

❁❁❁

اسیری سے آن، بان اور شوکت و شان تک

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٦﴾

”اور اسی طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسف کو اقتدار عطا فرمایا، اس میں سے جہاں چاہتا جگہ پکڑتا تھا۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں پہنچا دیتے ہیں اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔“

یہاں اللہ رب العزت نے ایک اور بہت اہم مسئلے کی وضاحت فرما دی ہے اور وہ یہ ہے کہ تمام معاملات میں مؤثر حقیقی رب قدیر ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ ظاہری وسائل اور نظر آنے والے اسباب بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھیں اختیار کرنے کا شریعت مطہرہ نے باقاعدہ حکم دے رکھا ہے۔ اسباب اختیار کر کے طاقت کے مطابق محنت کرنی چاہیے۔ مگر اس سب کے باوجود اعتماد اور بھروسا اللہ تعالیٰ کی ذات پر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یعنی اسباب اختیار تو کرنے ہیں مگر توکل اور اعتماد صرف ذات الٰہی پر ہی ہونا چاہیے۔ یعنی اگر کسان فصل اگانا چاہتا ہے تو وہ سازگار موسم کا انتظار کرے گا، زمین ہموار کرے گا، ہل چلائے گا، پانی لگائے گا اور مناسب موقع پر بیج زمین کی کوکھ میں ڈال دے گا۔ یہ سب ذرائع اس نے اختیار کر لیے ہیں مگر اب وہ اس محنت پر اعتماد نہیں کرے گا۔ سب امور انجام دے کر اپنی جھولی رب کے سامنے پھیلائے گا کہ یا اللہ! مجھے بہتر پیداوار دے۔

اس آیت مبارکہ میں اللہ رب العزت نے انسانوں کے عقیدہ کی اصلاح کا اہتمام فرمایا ہے۔ دیکھیے ! سب اسباب و ذرائع بظاہر بروئے کار آئے ہیں۔ یوسف علیہ السلام گناہ سے بچنے کی خاطر جیل جھیلتے رہے، پھر قیدیوں کو خواب کی تعبیر بتائی، نجات پانے والے سے بادشاہ کے ہاں تذکرہ کرنے کا کہا، وہ فراموش کر بیٹھا، یہاں تک کہ خود بادشاہ نے خواب دیکھا...... سب درباری جس کی تعبیر کرنے سے عاجز آ گئے۔ یوسف علیہ السلام نے ایسی شاندار تعبیر کی کہ بادشاہ آپ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ مزید احوال جان کر اتنا متاثر ہوا کہ اپنی مملکت کا اہم ترین عہدہ آپ کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ پورا منظر نامہ اسباب و ذرائع کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ سارے منظر نامے کی گردش کے پیچھے ایک ذات ہے۔ وہی اصل قوت محرکہ ہے۔ یہ سارا کچھ اس کے حسبِ خواہش انجام پا رہا ہے۔ سارے راستے اسی نے بنائے ہیں۔ ساری رکاوٹیں اسی نے دور کی ہیں چنانچہ اللہ رب العزت یہاں بیان فرماتے ہیں کہ بظاہر تو شاہِ مصر نے آپ کو وزارت بخشی اور بعد ازاں پورے مصر کی حکومت آپ کے حوالے کر دی مگر حقیقی بات یہ ہے کہ یہ سارا کچھ ہم نے کیا۔ شاہِ مصر کی ذہن سازی اللہ تعالیٰ نے کی، اسے اس طرح سوچنے اور درست نتیجہ نکالنے کی توفیق کس نے دی؟ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے !

کبھی اللہ ایسا نہیں بھی کرتا جب اس کے علم کے مطابق ہماری وہ بھولی بھالی سی خواہش ہمارے لیے نقصان دہ ہوتی ہے مگر بہت سے لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے، رب پر اعتراض کرنے لگتے ہیں۔ اپنی عقل سے حالات سمجھنا چاہتے ہیں۔ کئی بار ہم بھی سنتے ہیں: ''مجھے تو سمجھ ہی نہیں آیا کہ یہ ہو کیسے گیا؟'' ارے اللہ کے بندے، سمجھ میں آئے، یا نہ آئے، بندے کا کام ماننا اور سر جھکانا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اللہ اس بات کا پابند ہے کہ پہلے تمھیں سمجھائے اور اس کے بعد اپنے معاملات مکمل کرے نہیں رب پر حسن ظن ہی ہونا چاہیے، یہ بہت ضروری بلکہ ایمان کا حصہ ہے۔

مشرکین مکہ جناب رسالت مآب کی رسالت پر اعتراض کرتے تھے کہ یہ مکہ کے ایک یتیم شخص کو نبوت کیوں ملی اور بستی کے بڑے بڑے سردار محروم رہ گئے؟ اللہ تعالیٰ نے کتنا خوبصورت جواب دیا:

﴿ أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴾

[الزخرف : ۳۲]

''کیا وہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے خود ان کے درمیان ان کی معیشت دنیا میں تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض سے درجوں میں بلند رکھا ہے، تاکہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنا لیں اور تیرے رب کی رحمت ان چیزوں سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

کیا خوبصورت جواب ہے کہ لوگو! رحمت الٰہی، جو قرآنی اصطلاح میں بالعموم نبوت کے لیے بولی جاتی ہے، کے سلسلے میں رب تم سے مشورہ کرے، تم ناقص علم و عقل والوں کی خواہشات کا احترام کرے؟ حالانکہ حال یہ ہے کہ ''معیشت'' جس کا نبوت سے موازنہ بھی درست نہیں تو یہ معمولی چیز تم میں رب اپنی مرضی سے تقسیم کرے اور نبوت جیسی اہم چیز تمھاری مرضی سے؟ نہیں اور ہرگز نہیں، چنانچہ یہاں بھی رب کریم یہی بتا رہے ہیں۔

«نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ» یعنی ہم پہنچاتے ہیں اپنی رحمت جسے چاہتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ پر کوئی حق نہیں جتلا سکتا کہ جی مجھے کیوں نہیں دیا گیا بس اس کی مرضی ہمارا طرز عمل تو بس یہ ہونا چاہیے کہ جو مل جائے اس پر شکر کریں اور نہ ملے تو صبر کریں ہر حال میں اللہ پر راضی رہیں۔

«وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ» ''ہم محسن بندوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔''

آیت کے اس حصے میں پھر اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے بے انتہا محبت، عدل اور اس کے کرم کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ یہ درست کہ رحمت اللہ اسے دیتا ہے جسے چاہتا ہے

مگر ایسا نہیں کہ وہ عمل کرنے والوں کا، اجر ضائع کر دے نہیں وہ محسنین، مخلصین اور پاکباز محنت و عمل کرنے والوں کی محنت رائگاں ضائع نہیں جانے دیتا وہ انھیں بھی نوازتا ہے مگر کسی اور طریقے سے اللہ رب العزت ہی نے بادشاہ کے دل میں یوسف علیہ السلام کی بے کراں محبت اور بے اندازہ تعظیم ڈال دی جس کی بدولت یہ سارا کچھ رونما ہوا۔ دراصل اللہ جس سے محبت کرے پھر ساری دنیا سے رب اس کی عزت کرواتا ہے۔ یہ اس کا طریقہ اور سنت ہے۔ دیکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اس سلسلے کو نہایت حسن و خوبی سے بیان کرتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ إِذَا أَحَبَّ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ : إِنِّيْ أُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبَّهُ، قَالَ : فَيُحِبُّهُ جِبْرَئِيلُ، ثُمَّ يُنَادِيْ فِي السَّمَاءِ فَيَقُوْلُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوْهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ قَالَ: ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ، وَ إِذَا أَبْغَضَ اللّٰهُ عَبْدًا دَعَا جِبْرَئِيلَ فَيَقُوْلُ : إِنِّيْ أُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضْهُ، قَالَ: فَيُبْغِضُهُ جِبْرَئِيلُ، ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ أَهْلِ السَّمَاءِ إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضُوْهُ، قَالَ: فَيُبْغِضُوْنَهُ، ثُمَّ تُوْضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِي الْأَرْضِ»

[مسلم، كتاب البر والصلة، باب إذا أحب الله عبدًا......الخ : ٢٦٣٧]

”جب اللہ تبارک و تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو جبرئیل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں: ”میں اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں لہٰذا تم بھی اس سے محبت کرو، تب جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں اور تمام آسمان میں منادی کرتے ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت فرماتے ہیں اس لیے تم لوگ بھی اس سے محبت کرو“ آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں، پھر اس کو زمین والوں میں مقبول بنا دیا جاتا ہے۔“ یعنی مومن بندے سے لوگ دل سے

محبت کرنے لگتے ہیں جس کے دل میں جتنا ایمان ہوگا وہ اتنا ہی اس سے محبت کرے گا۔" اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی بندے کو ناپسند فرماتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو بلاتے اور ان سے کہتے ہیں: "میں فلاں سے نفرت کرتا ہوں اس لیے تم بھی اس سے نفرت کرو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تو جبرئیل علیہ السلام اس سے نفرت کرتے ہیں پھر آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں۔" بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فلاں بندے سے نفرت کرتے ہیں اس لیے تم لوگ بھی اس سے نفرت کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہل آسمان اس سے نفرت کرتے ہیں۔" پھر اس کو زمین والوں میں ناپسندیدہ بنا دیا جاتا ہے۔"

تو اللہ رب العزت فرماتے ہیں اس انداز سے ہم نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو حکومت و سلطنت عطا فرما دی۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی حکومتیں عطا کر دیتا ہے۔ آپ اسلام کی چودہ صدیوں تک پھیلی تاریخ ملاحظہ کر لیجیے۔ اسلامی حکومتیں جہاں جہاں قائم ہوئیں ان میں سے اکثر جہاد کی مرہون منت ہیں۔ ایک لشکر لا الہ الا اللہ کے پرچم تلے اٹھتا ہے اور کفر کے ایوانوں کو خس وخاشاک کی طرح بہاتا چلا جاتا ہے۔ علاقے فتح ہوتے ہیں، کفر ٹوٹتا بکھرتا ہے اور اللہ کا کلمہ بلند ہونے لگتا ہے۔ پھر جتنے علاقے مجاہدین فتح کرتے جاتے ہیں وہاں اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اللہ لوگوں کے دلوں میں مجاہدین کی محبت ڈال دیتا ہے وہ اطاعت کرتے ہیں اور یوں اسلامی سلطنت وجود میں آ جاتی ہے کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخصیت کا انتخاب کرتا ہے اسے دعوتِ توحید پھیلانے کا موقع دیتا ہے اور پھر اس شخص کو اتنا نمایاں اور اتنا اجاگر کر دیتا ہے کہ لوگ خود اس سے عنانِ حکومت سنبھالنے کی استدعا کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم یہاں بھی یہی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کنعان کے کنویں سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اٹھایا اور اتنا نمایاں کیا کہ مصر کا تاج خود جناب کے پاؤں میں آ گرا۔ اقتدار بھی ایسا جامع اور مکمل کہ خود قرآن نے جس کی مضبوطی کا اظہار کیا: "یعنی ایسا مکمل اور اختیار کا حامل اقتدار کہ یوسف زمین کے جس حصے پر چاہتا تصرف کرتا۔"

«نُصِیبُ بِرَحۡمَتِنَا مَن نَّشَآءُ» : یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ محنتیں اور ریاضتیں کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اقتدار دیتا ہے مگر آیت کے اس حصے میں یہ وضاحت بھی فرما دی کہ اللہ سبھی کو اقتدار نہیں دیتا، اس کو دیتا ہے جو خود کو اس کا اہل ثابت کرتا ہے اور جو اس کے قابل نظر آتا ہے۔

ہمیں یہ ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اللہ ہم پر ستر ماؤں سے بڑھ کر مہربان ہے وہ ہمارے فائدے کو خود ہم سے بڑھ کر جانتا ہے۔

❀❀❀

متقیوں کی راہ گزر، عجلت نہیں صبر

وَلَأَجۡرُ ٱلۡأٓخِرَةِ خَيۡرٞ لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَكَانُواْ يَتَّقُونَ ۝٥٧

"اور یقیناً آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے کہیں بہتر ہے جو ایمان لائے اور ڈرتے رہے۔"

پچھلے ہی تناظر میں گفتگو جاری ہے۔ پہلے یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اقتدار و غلبہ عطا فرماتا ہے پھر فرمایا کہ جنھیں نہ ملے وہ بھی مایوس مت ہوں اجر ان کا بھی محفوظ رہتا ہے۔ ظلم ان پر بھی نہ ہو گا۔ بلکہ ہر عمل کرنے والے کو اس کے عمل کے مطابق اجر ہر صورت عطا کیا جائے گا۔ جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ فَمَن يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرٗا يَرَهُۥ ۝٧ وَمَن يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٖ شَرّٗا يَرَهُۥ ﴾

[زلزال : ۷، ۸]

"تو جو شخص ایک ذرہ بھر نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔ اور جو شخص ایک ذرہ بھر برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔"

بلکہ اللہ تعالیٰ کا تو یہ بھی اعلان ہے کہ وہ ایک نیکی کرنے والے کو اس کی نیت و اخلاص دیکھتے ہوئے ستر گنا یا اس سے بھی زیادہ عطا فرمائے گا۔ تو اب یہاں مزید سمجھایا جا رہا ہے

کہ سچی بات تو یہ ہے کہ اہل ایمان اور اللہ کے محرمات سے بچنے والوں کے لیے آخرت دنیا کی نسبت بہت بہتر ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ اور کلیہ ہے کہ وہ بندوں کی محنت ضائع نہیں کرتا بلکہ جن سے زیادہ پیار ہو انھیں دنیا میں کم کم دیتا ہے اور ان کے لیے سارا اجر آخرت کے لیے ذخیرہ کرتا جاتا ہے۔ ایک مومن کا ایمان ہونا چاہیے کہ دنیا کی نسبت آخرت کہیں زیادہ بہتر ہے۔ قرآن مجید بھی یہی بتاتا ہے اور ساتھ افسوس بھی کرتا ہے کہ تم اس حقیقت کو یا تو سمجھتے نہیں ہو یا پھر قبول نہیں کرتے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿١٦﴾ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [اعلیٰ : ١٦، ١٧]

”بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور زیادہ باقی رہنے والی ہے۔“

زیر تفسیر آیت میں اللہ نے اپنے بندوں کو بڑی تسلی دی ہے کہ آخرت کا اجر کبھی ضائع نہیں ہوتا۔

اے قربانیاں دینے والو! شہادتیں پیش کرنے والو! اور دعوت کے میدانوں میں تکالیف اٹھانے والو! سن لو کہ اللہ تمھیں تسلی دے رہا ہے کہ اگر دنیا میں کسی کو نہ مل سکا تو اس دنیا کی عمر ہی کیا ہے اور اس کی بساط ہی کیا ہے؟ اللہ تمھیں ضمانت دیتا ہے کہ وہ تمھیں آخرت میں ضرور دے گا۔ اللہ کہتا ہے دنیا میں مل جائے تو بہت اچھی بات ہے نہ ملے تب بھی بری بات نہیں...... جو تمھیں آخرت میں ملے گا بہت بہتر ہے تو ہمیں اس اعتبار سے محنت کرنی چاہیے۔ تگ و دو اور کوشش و کاوش کو اپنا نظریہ بنانا چاہیے۔

کشمیر میں کیا ملا؟

کئی لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں کشمیر میں جہاد کرتے پندرہ سولہ سال بیت گئے تو کیا کشمیر حاصل کر لیا؟ وہ کہتے ہیں اتنے لوگ شہید کروا دیے اور کتنے مروا دُ گے؟ وہ

کہتے ہیں اتنی دیر ہو گئی ہے تمھیں کچھ نہیں ملا، ایسے احباب سن لیں پہلی بات تو یہ کہ ہمارا مطمح نظر محض دنیا تک محدود نہیں اگر دنیا میں کامیابی نہیں ملتی تو کیا یہ قربانیاں، یہ محنتیں اور یہ ریاضتیں رائگاں چلی جائیں گی؟ نہیں بلکہ آخرت میں اصل فیصلے ہوں گے اور رب کہتا ہے وہاں کا اجر بہتر ہے۔ بہت سے بھائی تو خلعتِ شہادت زیب تن کر کے سرخرو ہو چکے ہیں۔ کچھ انتظار میں ہیں۔ ادھر دنیا میں بھی رب نے جہاد کی قبولیت کے انوکھے منظر بپا کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دعوت کے وہ دروازے کھولے ہیں کہ جو کبھی تصور میں بھی نہ تھے۔ آج جتنے لوگ ہماری بات سنتے ہیں جب جہاد نہیں تھا تو کب اتنے لوگ سنتے تھے؟ آج لوگ لاکھوں روپے کا فنڈ لا کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں، مائیں دودھ پیتے بچے سروں سے اونچے کر کے جہاد کے لیے وقف کرنے کا اعلان کر رہی ہیں۔ نوجوان اور ہمارے اسی عہد کے نوجوان شہادت پر دیوانہ وار جوانیاں لٹا رہے ہیں، بوڑھے ایک کے بعد اپنا دوسرا بیٹا میدان مقتل روانہ کر رہے ہیں۔ تو کیا یہ جہاد کے اثرات اور مثبت نتائج نہیں ہیں؟ اللہ کا دین پھیل رہا ہے جہاد کھڑا ہو رہا ہے، لوگوں کی زندگیاں بدل رہی ہیں اور رب کی زمین کا رنگ بدل رہا ہے۔ قربانیاں دینے والوں کو رب بہت کچھ دیتا ہے۔ ہاں لیکن دو شرطوں کے ساتھ یعنی وہ اہل ایمان ہوں اور تقویٰ شعار ہوں۔

«لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْنَ»: جن کا عقیدہ درست نہیں اور جو تقویٰ سے خالی ہیں قرآن مجید کا یہ وعدہ اور ضمانت ان لوگوں کے لیے بہر حال نہیں ہے۔ بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص آخرت کے اجر کو دنیا کے اجر پر ترجیح دیتا ہے وہ ہمیشہ درست چلتا ہے۔ جو دنیا کے اجر یعنی جہاد کے حکومت وغیرہ کے حصول کو ترجیح دیتا ہے وہ اکثر غلط روش اختیار کر لیتا ہے۔ نتیجے میں اللہ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو حکومت دے دی۔ ایسے ہی محنتیں قبول کر کے اللہ اگر بندوں کو دنیا میں حکومت دے دے تو یہ اللہ کا انعام ہے۔ ایسے میں شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کا حکم قائم کیجیے اور اگر نہ ملے تو جہاد کو جاری رکھیے اللہ قربانیوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ تم

نہیں اگلی نسل یا اس سے اگلی نسل کو اللہ اسلام کی حکمرانی کی نعمت دے دے گا۔ آج کے لوگ آخرت میں اجر پا لیں گے۔ آخرت ہی بڑی اور اصل چیز ہے۔

❀❀❀

جب اپنے بھی پہچان نہ سکے

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ﴿۵۸﴾

''اور یوسف کے بھائی آئے، پھر اس کے پاس داخل ہوئے تو اس نے انھیں پہچان لیا اور وہ اسے نہ پہچاننے والے تھے۔''

یہ وہ وقت تھا جب یوسف علیہ السلام مصر کے حکمران تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے انتہا صبر، پر خلوص قربانیوں اور گناہ سے بچنے کی خاطر جیل جھیلنے کے انعام کے طور پر اقتدار نصیب کر دیا تھا اب جیسا کہ آپ خواب کی تعبیر فرما چکے تھے۔ حسب خواب حالات پیدا ہوتے گئے۔ پہلے سات سال تو خوب بارشیں برسیں، شاندار فصلیں اگیں اور پورا مصر اناج سے بھر گیا۔ یوسف علیہ السلام نے کمال حکمت عملی سے یہ اناج محفوظ کر لیا۔ اگلے سات سال نہایت تلخ قحط سالی کے تھے مگر مصر کے خزانے میں اہل مصر ہی کے لیے نہیں اردگرد کے لوگوں کی خوراک کے لیے بھی وافر غلہ محفوظ کیا جا چکا تھا۔ درست ہے کہ جب رکھوالا جاگ رہا ہو تو شہر کے مکین سکون کی نیند سوتے ہیں اور جب حکمران بصیرت اور دردِ دل رکھنے والے ہوں تو رعایا قحط سالی میں بھی سیر ہو کے سوتی ہے۔ اہل مصر خوش قسمت تھے کہ وہاں یوسف صدیق جیسے حکمران تھے یہ قحط ایسا وسیع تھا کہ نا صرف مصر بلکہ اردگرد کے بہت سے علاقے بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ یہاں تک کہ مصر سے بہت دور فلسطین اور کنعان میں بھی لوگ قحط سے بلبلا رہے تھے۔ جہاں دور دراز کے علاقے قحط کی بد حالی کا شکار تھے۔ وہاں یہ بات بھی ہر جگہ پھیل چکی تھی کہ مصر کے دانا اور صاحبِ فراست حکمران نے پہلے ہی پیش آمدہ حالات کو نظر میں رکھ کر بہت سا غلہ ذخیر کیا ہوا ہے اور اب وہاں سے قیمتاً غلہ مل جاتا ہے۔

چنانچہ اطرافِ مصر سے لوگ آتے اور مصر کے دارالحکومت سے غلہ خرید کے لے جاتے یہ خبر کنعان میں بستے اللہ کے پیغمبر یعقوب علیہ السلام تک بھی پہنچی اور انھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مصر کا نیک دل اور صالح حکمران ہر فرد کو ایک اونٹ غلے سے زائد نہیں دیتا چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے گیارہ بیٹوں کو غلہ کے حصول کے لیے مصر روانہ کر دیا بن یامین جو یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی تھے اور یوسف علیہ السلام کی عدم موجودگی کے باعث باپ کی قربت و محبت کو زیادہ حاصل کر چکے تھے۔ انھیں باپ نے اپنی خدمت وغیرہ کے لیے پاس رکھ لیا۔ باقی تمام بھائی گھر سے جمع پونجی لے کر غلہ کے حصول کے لیے دیارِ مصر روانہ ہو گئے۔

اِدھر سیدنا یوسف علیہ السلام کا حال یہ تھا کہ ان کے ذہن میں رب کا وہ فرمان گونجتا رہتا تھا جو بہت پہلے اس وقت انھیں سنایا گیا تھا جب بھائی انھیں کنویں میں پھینک کر چلے گئے تھے۔ تب حوصلہ و تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انھیں بتایا تھا:

﴿لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ﴾ [یوسف : ۱۵]

''یعنی اے یوسف! آپ انھیں یعنی بھائیوں کو بدسلوکی کے بارے میں ضرور بتائیں گے جبکہ ان کو شعور ہی نہیں ہو گا۔''

چنانچہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام اس پیش گوئی کے پورا ہونے کے ہمیشہ منتظر رہتے تھے۔ وہ باہر سے آنے والے قافلوں کو ٹٹولتے رہتے کہ دیکھیے رب کا یہ وعدہ کب پورا ہوتا ہے۔ بہر حال جب یہ لوگ مصر پہنچے تو یوسف علیہ السلام کو قافلے کی خبر دی گئی۔ انھوں نے ان نو واردوں سے خود گفتگو کی اور جب مختلف سوالات کیے تو انھیں پتا چل گیا کہ یہ اس کے بھائی ہیں۔ اب صورتحال یہ تھی کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے تو انھیں پہچان لیا مگر وہ یوسف علیہ السلام کو بالکل نہیں پہچان سکے۔

دراصل ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بقول اس بات کو ۴۰ سال بیت چکے تھے اور جب بھائیوں نے کنویں میں پھینکا تھا تو تب یوسف علیہ السلام کم سن تھے۔ ابھی داڑھی بھی نہ آئی تھی۔ اب

سیدنا یوسف علیہ السلام کے مبارک چہرے پر نا صرف نورانی داڑھی بہار دے رہی تھی بلکہ جسم پر شاہی لباس تھا اور ہاتھ میں پورے مصر کا قلمدان تھا۔ بھائیوں کا تو تصور بھی ادھر نہ بھٹکا ہو گا کہ کل جس وجود سے وہ اس قدر نفرت و حسد کرتے تھے کہ اسے اپنے درمیاں گوارا نہ کر سکتے تھے آج وہ پورے مصر کا حکمران ہے اور وہ اس کے سامنے نہایت عاجزی سے گندم کا سوال کررہے ہیں، تو ایسے میں وہ کیسے پہچانتے؟

انسان حیرت سے سوچتا ہے کہ یہ بھی کیا منظر تھا۔ کل کے ظالم آج احسان کی بھیک مانگ رہے تھے۔ کاش انسان ظلم کرتے وقت کبھی حالات کی ستم ظریفی کے متعلق بھی سوچ لے۔ وہ صرف اتنا تصور کرے کہ کبھی وقت آ سکتا ہے کہ جس جگہ وہ خود ہے وہاں کل وہ شخص بھی ہوسکتا ہے جس پر وہ ظلم کر رہا ہے۔ تو شاید وہ باز آ جائے۔ مگر جب قوت و زور ہوتا ہے اور بس چل رہا ہوتا ہے تو کوئی بھی اپنے انجام اور عاقبت کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔ پھر جب حالات انسان کی ہڈیوں سے گودا چھین لیتے ہیں اور وہ بے بس ہو کے پڑا ہوتا ہے تو آہیں بھر بھر کے اپنے عروج میں کیے گئے ظلم یاد کرتا ہے مگر اب وقت گزر چکا ہوتا ہے اور پچھتانے سے حالات و واقعات میں کچھ تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ حالات بدلتے رہتے ہیں، عروج بھی آتا ہے اور پھر زوال بھی، سبھی کے مقدر میں دھوپ اور چھاؤں کے اوقات مقرر ہیں۔ عقل مند وہی ہے جو اس حقیقت کو ذہن میں رکھے اور اپنے کردار کو ہمیشہ متوازن اور معتدل رکھے۔ قرآن مجید تو ہر آن اعلان کر رہا ہے:

﴿ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ [آل عمران : ١٤٠]

”اور یہ تو دن ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان باری باری بدلتے رہتے ہیں۔“

❀❀❀

بنیامین سے ملنے کی چاہت

وَ لَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُوْنِيْ بِاَخٍ لَّكُمْ مِّنْ اَبِيْكُمْ اَلَا تَرَوْنَ اَنِّيْٓ اُوْفِي الْكَيْلَ وَ اَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِيْنَ۝۵۹ فَاِنْ لَّمْ تَاْتُوْنِيْ بِهٖ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِنْدِيْ وَ لَا تَقْرَبُوْنِ۝۶۰

”اور جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو کہا میرے پاس اپنے اس بھائی کو لے کر آنا جو تمھارے باپ سے ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ بے شک میں ماپ پورا دیتا ہوں اور میں بہترین مہمان نواز ہوں۔ پھر اگر تم اسے میرے پاس نہ لائے تو تمھارے لیے میرے پاس نہ کوئی ماپ ہوگا اور نہ میرے قریب آنا۔“

سیدنا یوسف علیہ السلام نے جب ان کے لیے اسباب تیار کروا دیا یعنی اونٹوں پر غلہ لدوا دیا تو حکم فرمایا کہ جب آئندہ آؤ تو اپنے باپ کی طرف سے جو تمھارا بھائی ہے اسے بھی لیتے آنا۔ اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو یوسف علیہ السلام نے سوالات کر کے ان سے مکمل حالات دریافت کر لیے ہوں گے یا پھر خود بھائیوں نے رحم کی درخواست کرتے ہوئے اپنے جملہ حالات بیان کر دیے ہوں گے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کا اصول تھا کہ ایک شخص کو غلے سے لدا ہوا ایک ہی اونٹ دیا کرتے تھے، اس سے زائد نہیں، تو وضاحت کرتے ہوئے ان بھائیوں نے بتایا ہوگا کہ پیچھے غم سے نڈھال ایک باپ اور اس کی خدمت میں ایک بھائی بھی چھوڑ آئے ہیں۔ ازراہِ کرم ان کے لیے بھی غلہ عنایت فرما دیا جائے، تو یوسف علیہ السلام نے انھیں آئندہ پھیرے میں اپنے پیچھے چھوڑے ہوئے بھائی کو ساتھ لانے کا حکم دیا، شاید کہا ہوگا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ واقعی تمھارا کوئی اور بھائی موجود بھی ہے یا تم ایسے ہی زائد غلہ لے جانا چاہتے ہو۔ بہر حال بالاصرار فرما دیا کہ تم آئندہ اپنے بھائی کو ضرور لاؤ گے۔ انسان اپنی مقصد برآری کے لیے

دو ہی انداز اختیار کر سکتا ہے اور وہ ہے ترغیب اور ترہیب، یعنی لالچ اور ڈراوا۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی کیفیت سمجھ میں آتی ہے۔ وہ برسوں سے اپنوں سے جدا تھے۔ باپ کا چہرہ دیکھے مدت بیت گئی تھی۔ پیارے بھائی کی آواز سنے بھی عرصہ ہونے کو آیا تھا۔ گو اب خود تو ناز ونعمت کے اک قابل رشک مقام تک آ گئے تھے مگر جب کسی بچھڑے شخص کو پردیس میں راحت ونعمت میسر آ جائے تو پھر اپنوں کی چاہت اور ضرورت اور زیادہ تڑپانے لگتی ہے۔ سو اپنوں سے رابطے کی بحالی کے سلسلے میں انھوں نے ہر دو ممکنہ راستے برت لیے۔ بھائی کو لانے کا حکم دیا تو پہلے اپنا حسن سلوک انھیں باور کروایا:

''کیا دیکھتے نہیں کہ میں پورا پورا پیمانہ دیتا ہوں اور بہترین مہمان نواز ہوں۔''

دراصل سیدنا یوسف علیہ السلام نے نا صرف انھیں پورا پورا غلہ عنایت کر دیا تھا بلکہ درد کے اک لامتناہی سلسلے میں پھینک دینے والے ان بھائیوں کو شاہی مہمان بنا کے رکھا تھا۔ بہترین خدمت کروائی تھی اور اعلیٰ ترین ضیافتوں سے شاد کام کیا تھا۔ چنانچہ انھیں بتلایا کہ اگر تم اپنے بھائی کو نہ لائے تو اس کا مطلب ہو گا تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے اور ایسی صورت میں تمھیں غلہ نہیں ملے گا اور نہ ایسی صورت میں تم میرے پاس آنے کی کوشش ہی کرنا۔ تو یہ ایک دھمکی تھی۔ اس طرح گویا سیدنا یوسف علیہ السلام نے ترغیب وترہیب ہر دو ہنر ان پر آزما لیے تا کہ آئندہ وہ ہر صورت یوسف کے ماں سے سگے بھائی کو ساتھ لائیں۔

❀❀❀

''ہم آمادہ کر لیں گے''

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾

''انھوں نے کہا ہم اس کے باپ کو اس کے بارے میں ضرور آمادہ کریں گے اور بے شک ہم ضرور کرنے والے ہیں۔''

معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے ہر طرح سے ان لوگوں پر حجت پوری کر دی تو

اب ان کے پاس بھائی ساتھ نہ لانے کا کوئی بہانہ یا جواز باقی نہ بچا تھا۔ چنانچہ ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ وہ حقیقت حال کھول کے یوسف علیہ السلام کے سامنے رکھ دیں۔ چنانچہ مذکورہ آیت کے پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے یہ حالات یوسف علیہ السلام کو بتا ہی دیے۔ بتا دیا کہ باپ غم سے نڈھال ہے اس کا ایک بیٹا کھو گیا تھا جس کے غم میں وہ خود تو گھل ہی گئے ہیں مگر روتے روتے بینائی بھی زائل ہو گئی ہے۔ اب یہ چھوٹا بن یامین ان کے پاس ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے سے کم ہی جدا کرتے ہیں، یعنی بھائی کو لانے میں یہ سخت صورتحال درپیش ہے مگر ہم پھر بھی کوشش کریں گے۔ باپ کو بتائیں گے کہ شاہِ مصر نے اس کے بغیر اپنے حضور حاضری سے بھی منع کر دیا ہے۔ اب گندم تو آپ کے علاوہ کہیں سے ملتی نہیں سو اس کے بغیر گزارہ نہیں مگر بھائی لانے والا مسئلہ بھی کچھ آسان نہیں۔ بہرحال ہم یہ کریں گے۔ باپ کو قائل کرنے اور بھائی کو لانے میں پوری محنت صرف کر دیں گے۔

«اِنَّا لَفٰعِلُوْنَ» کا لفظی ترجمہ بنتا ہے کہ بے شک ہم یہ کرنے والے ہیں۔'' یعنی ہم ایسا کرنا جانتے ہیں۔'' لگتا ہے جیسے وہ اپنی سابقہ کارگزاری ذہن میں رکھ کے بات کر رہے ہوں کہ پہلے بھی یوسف کے معاملے میں باپ کو اپنی چرب زبانی سے قائل کر کے اسے باہر لا چکے تھے، سوچتے ہوں گے کہ اس بار بھی ایسا کر ہی لیں گے۔

❀❀❀

کریم کی اک اور کرامت

وَقَالَ لِفِتْيٰنِهِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَهُمْ فِيْ رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُوْنَهَآ اِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٢﴾

''اور اس نے اپنے جوانوں سے کہا ان کا مال ان کے کجاووں میں رکھ دو، تاکہ وہ اسے پہچان لیں جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں، شاید وہ پھر آجائیں۔''

فتیۃ فتی کی جمع ہے۔ اگر دس سے کم افراد مراد ہوں تو جمع فتیۃ آتی ہے تاہم اگر جمع میں کثیر لوگ مراد ہوں تو ''فتیان'' جمع آتی ہے۔

یوسف کی زندگی سے مسرت کے پھول چن کر کانٹے بھر دینے والے بھائی آج چالیس سال بعد پہلی مرتبہ یوسف علیہ السلام سے ملے ہیں تو یوسف علیہ السلام کے احسان اور دم بہ دم مہمان نوازی و کرم کا ذائقہ چکھتے جا رہے ہیں۔ انھیں شاہی مہمانوں کے طور پر ٹھہرایا گیا۔ شاہی ضابطے سے ہٹ کر انھیں ان دو افراد کے لیے بھی دو الگ سے غلہ کے اونٹ دے دیے گئے جو گھر میں موجود ہیں۔ اب اس کے بعد یوسف علیہ السلام نے ایک اور احسان یہ کیا کہ جس قدر جمع پونجی یہ گھر سے غلہ خریدنے کے لیے لائے تھے۔ اس کے عوض غلہ تو دے ہی دیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کیا کہ وہ ساری دولت، ساری پونجی اور سارا سرمایہ غلہ بار کرنے والے ملازموں کے ذریعے سے غلے میں رکھوا دیا۔ یہ وہ کریم ابن کریم شخص ہے جس نے چالیس سال باپ کی شفقت و محبت سے دور رکھنے والوں سے بدلہ نہیں لیا تو آج وہ قحط میں پھنسے اپنے سگے باپ اور بھائیوں سے غلے کے پیسے کیسے لے لیتا؟ مگر اتنا تھا کہ یوسف علیہ السلام ابھی اپنے بھائیوں کے سامنے ظاہر نہ ہونا چاہتے تھے سو چپکے سے اسی اناج میں پیسے رکھوا دیے جو بالآخر گھر پہنچ جانا تھا۔ قرآن مجید نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے پیسے غلے میں رکھ کر واپس لوٹا دینے کی ایک وجہ ذکر کی ہے یعنی «لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ» تاکہ وہ دوبارہ پلٹ سکیں۔'' یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام نے سوچا کہ قحط سالی کا موسم ہے۔ عسرت و افلاس کے اژدھے نے بڑی بڑی دولتوں کو نگل لیا ہے۔ چالیس سال سے باپ کا کریم چہرہ اور گھر کی دہلیز نہیں دیکھی کیا خبر قحط کے اس جان لیوا موسم میں گھر میں خوشحالی ہے یا تنگ دستی کا راج ہے۔ کیا خبر وہاں عیش و عشرت یا ناداری و عسرت ہے، سو خاموشی سے روپے غلے میں رکھوا دیے کہ ہاتھ سے دے کر بھائیوں کو ممنون ہونے کی شرمندگی سے بھی بچا لیں اور ایسے آڑے وقت میں اپنوں کا کردار بھی ادا کر دیں۔

جب یوسف علیہ السلام نے روپے رکھوا دیے تو دل میں ہوگا کہ گھر جا کے جب بوڑھے باپ کے سامنے مارے خوشی کے غلہ ڈھیر کریں گے تو انھیں اک مزید خوشی بھی میسر آ جائے گی یعنی، اپنے روپے واپس پا لینے کی خوشی، جانے اس وقت آنکھوں میں کیا کیا تصویریں گھوم رہی ہوں گی، اپنے رفیق و شفیق باپ کی پیشانی پر پھوٹتی شفق نظر آتی ہوگی۔ معصوم بن یامین کے چہرے پر بکھرتے قوس وقزح کے رنگ نظر آئے ہوں گے۔ دل کہتا ہے کیا اس وقت انھیں باپ کی آنکھوں کے بے نور ہونے کا بھی احساس ہوگا؟

بہرحال یہ یوسف علیہ السلام کا اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایک نہایت مشفقانہ سلوک تھا۔ انبیاء ایسے ہی فراخ دل ہوتے ہیں، یہاں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک معاملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا، بہت دلچسپ ہے۔ لیجیے آپ مکمل پڑھ لیجیے:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کہتے ہیں: ''ایک جہادی سفر میں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ واپس آ رہا تھا، میرا اونٹ تھک گیا اور سست ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگ گیا۔ (تو میں نے اتر کر پیدل چلنا شروع کر دیا) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے قریب آئے اور مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے: ''جابر!'' میں نے کہا: ''جی حاضر!'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' میں نے عرض کی: ''اونٹ تھک گیا اور سست ہو کر آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو اپنی سواری سے نیچے اترے اور لاٹھی کے ساتھ میرے اونٹ کو ہانکنے لگے اور پھر مجھے کہا: ''اب سوار ہو جا۔'' میں اس پر سوار ہوا تو اب وہ اس قدر تیز چلنے لگا کہ مجھے اس کو مشکل سے روکنا پڑا کہ کہیں وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے نہ نکل جائے۔ اب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے باتیں کرنے لگے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''شادی کر لی؟'' جابر رضی اللہ عنہ: ''جی ہاں!'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''کنواری سے کی یا بیوہ سے؟'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ: ''میری بہنیں کافی ہیں (ماں فوت ہو گئی ہے) لہٰذا سوچا کہ ایسی خاتون سے شادی کروں جو ان کو باہم جوڑے رکھے۔ ان کی کنگھی کرے اور ان پر پوری پوری نگرانی کرے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ''اچھا! اب گھر پہنچنے والے ہو، وہاں خوب خوش

کرنا۔'' پھر فرمایا: ''اونٹ بیچو گے؟'' حضرت جابر رضی اللہ عنہ: ''جی ہاں!''

اور پھر ایک اوقیہ چاندی کے بدلے سودا طے ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے پہلے مدینہ پہنچ گئے اور میں اگلے دن صبح کو پہنچا۔ میں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اکٹھے ہی مسجد کے پاس پہنچے۔ میں نے دروازے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: ''ابھی پہنچے ہو؟'' میں نے کہا: ''جی ہاں!'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اپنا اونٹ چھوڑ دو، مسجد میں داخل ہو جاؤ اور دو رکعت نماز پڑھ لو۔''

میں مسجد میں داخل ہوا، دو رکعت نماز ادا کی، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مجھے ایک اوقیہ چاندی تول دیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے چاندی تولی تو جھکتی ہوئی تول کر دی۔ اب میں چاندی پکڑ کر چل دیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جابر کو میرے پاس بلاؤ۔''

میں نے دل میں کہا: ''اب میرا اونٹ مجھے واپس ہو گا۔'' اور واپسی مجھے ناگوار تھی۔ میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اونٹ بھی لے جاؤ اور چاندی بھی پاس ہی رکھو۔''

[بخاری، کتاب البیوع، باب شراء......الخ: ۲۰۹۷۔ مسلم: ۱۴۶۶/۳۶۴۱]

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے صحابہ کے ساتھ محبت تھی اور یہاں ایسا ہی معاملہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا۔

یوسف علیہ السلام نے ان کی جمع پونجی انھیں کیوں لوٹا دی؟ مفسرین نے یوسف علیہ السلام کے اس رویے پر غور کر کے کچھ اور بھی فوائد ڈھونڈے ہیں۔

- جب وہ اپنے روپے واپس پائیں گے تو یوسف علیہ السلام کے فضل و احسان اور حسنِ معاملہ کے قائل ہو کر جلد ہی دوبارہ آنے پر مجبور ہوں گے۔
- یوسف علیہ السلام کو خدشہ تھا کہ ممکن ہے باپ کے پاس اس کے علاوہ نقدی موجود نہ ہو اور یہ بے چارے اسی مجبوری کے مارے دوبارہ آ ہی نہ سکیں۔

- شاید یہ سوچتے ہوں کہ قحط سالی اور غربت نے ہر شخص کو بے حال کر رکھا ہے تو تنگی کے ان حالات میں ذرا باپ کا ہاتھ کھلا رہے۔
- شاید یہ سوچ کر پیسے لوٹا دیے کہ دانے دانے کو ترستے باپ اور بھائیوں سے کھانے کے لقموں کے پیسے لینا تو درست نہیں اور کمزور فطرت لوگوں کا کام ہے۔
- شاید یہ سوچ کر رکھ دیے ہوں کہ پیسے دیکھ کر انھیں خیال آئے گا کہ یہ غلطی سے غلے میں رکھ دیے گئے ہیں اور وہ اولادِ انبیاء مالک تک اس کا مال واپس دینے تھے ضرور آتے۔
- اس لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بھائیوں اور باپ پہ احسان بھی ہو جائے اور اس انداز سے انھیں شرمندگی کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔
- یا شاید بھائیوں کے ذہن میں اٹھنے والے کسی ممکنہ شک کے ازالے کے لیے تاکہ وہ سمجھیں کہ ان کے بھائی کو کسی بھی ظلم وزیادتی کے لیے نہیں محض مزید احسان کے لیے رہے ہیں۔
- یا باپ کو یہ اشارہ دینے کے لیے کہ شاہِ مصر ان کا خیر خواہ ہے اور مزید بھلائی کا ارادہ رکھتا ہے تاکہ اسے اپنا چھوٹا بیٹا ارسال کرتے وقت آسانی رہے۔
- یا یہ کہ وہ اس شدت وصعوبت کے دور میں کسی ایسے طریقے سے ان کی مدد کرنا چاہتے تھے جس سے وہ راہ کے ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں اور ان کی پونجی بحفاظت گھر پہنچ جائے۔
- یا اپنے ظرف اور طبیعت کی نیکی کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسا کیا یعنی جتنا انھوں نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ اذیت وعذاب کا معاملہ کیا وہ اتنا ہی شدت کے ساتھ ان سے احسان کا معاملہ کرنا چاہتے تھے۔

بہر حال یہ مفسرین کی مختلف آرا تھیں جو پیش کر دی گئیں، ایک عمل کے ایک سے زیادہ محرک ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے ایک مناسب حال محرک بتا دیا ہے باقی کی نفی نہیں فرمائی۔ بہر حال یہ غرض تو ضرور تھی کہ وہ کسی طور ہی سہی، واپس ضرور آئیں اور آئیں تو بھائی کو ساتھ ضرور لائیں۔

❁❁❁

بنیامین کی خاطر باپ کے حضور التجائیں

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾

''تو جب وہ اپنے باپ کی طرف لوٹے تو انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہم سے ماپ روک لیا گیا ہے، سو تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج کہ ہم (غلے کا) ماپ لائیں اور بے شک ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔''

جب یہ لوگ مصر سے غلہ لے کر واپس پلٹ آئے تو آتے ہی شاہِ مصر سے ہونے والی اپنی گفتگو، اس کے حسن معاملہ اور آئندہ کے لیے ان پر لگا دی جانے والی شرائط سے باپ کو آگاہ کرنے لگے۔ اب چونکہ ان کے سامنے اہم ترین معاملہ اپنے آئندہ سفر میں بن یامین کو لے جانا تھا تو اسی بات کو زور دے کر دہرانے لگے تاکہ ابھی سے باپ کو قائل کرنے کے کام کا آغاز کر دیں۔ کہنے لگے: ''اے ابا جان! گو ہماری بڑی عزت افزائی ہوئی، ہم سے شاہی مہمانوں کا سلوک کیا گیا لیکن ہم سے نا صرف ایک اونٹ کا غلہ روکا جا رہا تھا، بلکہ آئندہ کے لیے بھی یہ شرط لگا دی گئی ہے کہ جب تک اپنے ساتھ اپنے بھائی کو نہیں لاتے تمھیں ہر گز غلہ نہ دیا جائے گا بلکہ یہاں تک کہہ دیا گیا کہ ایسی صورت میں تو تمھیں شاہِ مصر کے قریب بھی پھٹکنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ شاہِ مصر نے صاف کہہ دیا ہے کہ آئندہ غلہ لینا ہے تو بھائی کو ساتھ لانا پڑے گا۔ بصورت دیگر آنے کی ضرورت نہیں۔

ہم غلہ لے تو آئے ہیں مگر آپ دیکھیے یہ غلہ کتنی دیر چلے گا؟ بہت جلد ہمیں مزید غلے کی ضرورت ہوگی اور غلہ ملتا ہے صرف شاہِ مصر سے اور شاہِ مصر بنیامین کو لے جائے بغیر بات سننے کا بھی روادار نہیں۔ ابا جان! یہ تو صورتحال پیدا ہوگئی ہے سو آپ نرمی اور شفقت فرمائیے اور ہمارے پورے خاندان کی زندگی کے ظاہری سہارے اناج کے حصول کے لیے بن یامین کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دیجیے۔ ہمیں علم ہے یوسف کے بعد آپ اسے جدا

کرنے پر تیار نہیں ہوتے، آپ اس کی حفاظت کے سلسلے میں اندیشوں کا شکار رہتے ہیں مگر ہم پر اعتماد کیجیے ہم اس کی مکمل حفاظت کی ضمانت دیتے ہیں۔

❀❀❀

محبت بھرے باپ کے جذبات، تحفظات

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ؕ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

"اس نے کہا میں اس پر اس کے سوا تمھارا کیا اعتبار کروں جس طرح میں نے اس کے بھائی پر اس سے پہلے تمھارا اعتبار کیا، سو اللہ بہتر حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سارے حالات توجہ اور انہماک سے سنے، ظاہر ہے توڑے کے اس موسم میں غلہ کی دستیابی اور مزید ملنے کی نوید بڑی حوصلہ افزا اور خوش آئند تھی مگر یعقوب علیہ السلام کے لیے یوسف کی والدہ کی آخری نشانی بنیامین کو جدا کرنا بھی آسان کام نہ تھا مگر بیٹوں کے بیان کردہ حالات کی روشنی میں اس کے سوا اب چارہ بھی نہ تھا۔ تاہم جونہی انھوں نے اپنی حفاظت اور ضمانت کے متعلق بات کرنا چاہی تو سیدنا یعقوب علیہ السلام کے ذہن پر فوراً دورِ گزشتہ کے واقعات کی ریل چلنے لگی۔ اس وقت بھی کس طرح وہ یوسف علیہ السلام کے ہمدرد اور خیر خواہ بن کے اسی طرح بیٹھے اجازت طلب کر رہے تھے۔ کس طرح یوسف کے کھیلنے، کھانے اور باہر سیر سپاٹے کی باتیں کرتے تھے اور پھر اس کی حفاظت کے سلسلے میں انھوں نے کس قدر یقین دہانیاں کروائی تھیں یہ سب یعقوب علیہ السلام کو بھولا تو نہ تھا اور وہ یہ بھی نہ بھولے تھے کہ ایسی ہی حفاظت کی بے شمار ضمانتوں کے بعد ایک بار جب انھوں نے یوسف کو ان کے ساتھ بھیج دیا تھا تو آج تک وہ پلٹ کے نہ آ سکے تھے۔ سو شاید یہی وہ پس منظر تھا جس کے باعث اذیت و درد سے بھرپور لہجے میں یعقوب علیہ السلام نے انھیں جتایا:

''تو گویا بن یامین کے سلسلے میں بھی تم پر ویسا ہی اعتماد کرلوں جیسا اس پہلے اس کے بھائی یوسف کے سلسلے میں کر چکا ہوں؟''

نہیں تم لوگوں پر اعتماد کرنے کا نتیجہ تو دیکھ چکا ہوں، مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا، سو اب تم پر نہیں اپنے رب پر اس کی حفاظت کا بھروسا کروں گا۔ ہاں میں اپنا معاملہ اور اپنا بیٹا رب کے سپرد کرتا ہوں اسی پر توکل کرتا ہوں کہ وہ سب حفاظت کرنے والوں میں سے بہترین حفاظت کرنے والا ہے اور وہ سب رحم کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ رحیم ہے۔ امید ہے میری سابقہ زندگی کے دکھ اور اذیت ملحوظ رکھتے ہوئے اس سن رسیدگی اور بڑھاپے میں کسی مزید غم و حزن میں نہ ڈالے گا۔''

❀❀❀

غلہ بھی اور ساتھ پونجی بھی ......!

وَلَمَّا فَتَحُوا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ إِلَيْهِمْ ۖ قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي ۖ هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ ﴿٦٥﴾

''اور جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنے مال کو پایا کہ ان کی طرف واپس کر دیا گیا ہے، کہا اے ہمارے باپ! ہم کیا چاہتے ہیں، یہ ہمارا مال ہماری طرف واپس کر دیا گیا ہے اور ہم گھر والوں کے لیے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ ماپ زیادہ لائیں گے، یہ بہت تھوڑا ماپ ہے۔''

جب باپ سے احوالِ سفر کی بات ہو چکی۔ ذرا تھکان اتری اور وہ ذرا سا دم لے چکے تو اب اناج کے تھیلے کھولنے لگے۔ جونہی غلہ ڈھیر کیا یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کی ساری جمع پونجی بھی غلے کے ساتھ ہی ان تک پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک حیرتناک منظر تھا، چنانچہ وہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ باپ سے مخاطب ہوئے، کہنے لگے:

”اے ابا جان! اب ہمیں اور کیا چاہیے، یہ لیجیے ہماری تو ساری پونجی یعنی وہ قیمت جو غلہ خریدنے کے لیے لے کر گئے تھے ہمیں لوٹا دی گئی ہے۔ یہ تو نہایت کریم اور سخاوت کرنے والا بادشاہ ہے، اب تو ہم جائیں گے اور ضرور اپنے اہل خانہ کے لیے مزید رسد لائیں گے۔ بھائی کو ساتھ لے جائیں گے اور اس کی حفاظت کریں گے اور اس بار ایک اونٹ کا غلہ مزید لائیں گے۔ یہ جو ہم لا چکے ہیں یہ غلہ تو ہمارے اخراجات کے مقابلے میں بہت کم ہے سو جلد ختم ہو جائے گا۔“

اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کی تدبیر نہایت کارگر رہی۔ اب برادرانِ یوسف کے پاس یوسف علیہ السلام کی مدح میں اتنے زیادہ قصیدے تھے۔ اس کے فضل و احسان کے اس قدر دلائل تھے کہ وہ باپ کے سامنے باقاعدہ اصرار کرنے لگے تھے کہ دیکھیے بادشاہ کتنا اچھا ہے۔ اس نے غلہ بھی دیا اور پیسے بھی لوٹا دیے۔ وہاں بھی جب تک ٹھہرایا بے انتہا عزت و سلوک کے ساتھ رکھا، بھیجا تو، مزید غلہ دینے کے وعدے کے ساتھ، اور مطالبہ صرف ایک کیا ہے کہ اپنے بھائی کو ساتھ لانا۔ دیکھیے ہمارا کوئی نقصان تو اس نے ہونے ہی نہیں دیا۔ ایسے بادشاہ کی طرف دوبارہ نہ جانا یا اس کی معمولی سی شرط بھی پوری نہ کرنا بھلا کیوں کر درست ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہہ رہے تھے اور ان کے الفاظ ﴿ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ﴾ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے درست اندازہ لگا لیا تھا کہ روپے انھیں بھول کر نہیں دانستہ لوٹائے گئے ہیں اور وہ اس سے یہی سمجھے کہ یہ اس بادشاہ کا ان کے ساتھ ایک اور مشفقانہ اور ہمدردانہ سلوک تھا۔

❁❁❁

رب کی گواہی کے زیر سایہ، عہد و پیمان

قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ﴿۶۶﴾

”اس نے کہا میں اسے تمھارے ساتھ ہرگز نہ بھیجوں گا، یہاں تک کہ تم مجھے اللہ کا

پختہ عہد دو گے کہ تم ہر صورت اسے میرے پاس لاؤ گے، مگر یہ کہ تمھیں گھیر لیا جائے۔ پھر جب انھوں نے اسے اپنا پختہ عہد دے دیا تو اس نے کہا اللہ اس پر جو ہم کہہ رہے ہیں، ضامن ہے۔''

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کی پر دلائل اور جذباتی گفتگو نہایت اطمینان سے سماعت فرمائی اور پھر حالات کے اس پیچیدہ تناظر میں دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ تھا، بنیامین کو ان کے ساتھ مصر روانہ کرنے کا، مگر مشروط، شرط یہ تھی کہ تمام بھائی اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر ان سے یہ عہد و پیمان باندھیں کہ وہ بھائی کی دل و جان سے حفاظت کریں گے۔ نیز فرمایا کہ اللہ نہ کرے اگر کوئی مشکل مرحلہ آ بھی جائے تو تم تمام بھائی بنیامین کے لیے پورا زور لگاؤ گے اور جان تک کھپا دو گے۔ یعنی جو بھی صورتحال بنے، بنیامین کو ضرور میرے پاس لاؤ گے۔

ایک ایسے بوڑھے باپ کے لیے، جس کا ایک دلارا بیٹا عرصۂ چالیس سال سے متاعِ گم گشتہ ہو چکا ہو، اپنے دوسرے بیٹے کو انھی بیٹوں کے ساتھ روانہ کر دینا بہت صبر آزما اور نہایت مشکل مرحلہ تھا۔ سو سیدنا یعقوب علیہ السلام نے جس قدر ممکن تھا ان کو احساس دلایا، قسمیں لیں اور رب کو اس پر گواہ ٹھہرایا کہ وہ بھائی کو ضرور ساتھ لائیں گے۔ ایک پیغمبر کی سوچ میں توازن اور طبیعت کا ٹھہراؤ ملاحظہ فرمایئے کہ ایسے خالص جذباتی مرحلے میں بھی دانش ان کے لہجے میں کس قوت سے بول رہی ہے۔ یہ سب کر لینے کے بعد بھی یہ گوشہ بہر حال ان کی نگاہ میں تھا کہ یہ بھائی جس قدر بھی زور مار لیں آخر کو انسان ہیں اور انسان پر ایک مرحلہ آتا ہے کہ جب وہ اپنی تمام دانش و بصیرت اور قوت و طاقت کے باوجود بے بس ہو کے رہ جاتا ہے، سو پر زور اصرار اور وعدے لینے کے بعد بھی ایک استثنا تقدیر کی بالادستی کے اعتراف کے طور پر باقی رکھا ہے اور وہ «اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ» کے الفاظ سے عیاں ہے۔ یعنی تم بھائی کو ہر صورت لاؤ گے سوائے اس صورت کے کہ پوری کوشش اور سخت محنت کے باوجود مجبور ہو کے رہ جاؤ۔

«اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ » کے مفسرین نے مختلف معانی بتائے ہیں۔ سیدالمفسرین قتادہ نے اس کا معنی کیا ہے کہ سوائے اس صورت کے کہ تم ہلاک کر دیے جاؤ۔ دراصل عربوں کی بول چال میں یہ لفظ اس شخص کے لیے کہا جاتا ہے جو قریب المرگ ہو۔ قرآن مجید میں یہ لفظ انھیں معنوں میں متعدد مرتبہ آیا ہے۔

مثلاً سورۃ الکہف میں ایک متکبر شخص کے باغ کی ویرانی کے لیے یہ لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ آیت ہے:

﴿ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ ﴾ [الكهف : ٤٢]

''اور اس کا پھل مارا گیا۔''

سورۂ یونس میں یہ لفظ پیغمبروں کے ایک تصور اور گمان کے متعلق آیا ہے، لفظ ہیں:

﴿ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ ﴾ [يونس : ٢٢]

''اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یقیناً ان کو گھیر لیا گیا ہے۔''

بہر حال یہاں معنی یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنیامین کے لیے ہر طرح کا داؤ آزماؤ، جان لڑاؤ اگر اس کے باوجود مجبور و مقہور اور بے بس رہ جاؤ تو پھر معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

جب اولاد نے شدت سے قسمیں کھا کر اور حلف دے کر اپنی خلوص نیت کا کامل یقین دلا دیا تو سیدنا یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ سب تو بجا ہے لیکن اس سب معاملہ پر اللہ کو اپنا وکیل اور کارساز ٹھہراتا ہوں۔ اسی پر بھروسا کرتا ہوں کہ اس کے سپرد کی ہوئی امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔ یہاں یہ سبق دیا جا رہا ہے کہ زندگی میں ہر انسان کو ایسے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ضروری ہے کہ بندہ پیش آمدہ میں خوب محنت کرے اور ساتھ تقدیر پر ایمان بھی رکھے تقدیر پر ایمان کا معنی یہ نہیں ہے کہ محنت نہ کرے اور سمجھے کہ جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ محنت کا کیا فائدہ؟ اگر عقیدہ صحیح ہو تو سمجھنا چاہیے کہ تقدیر میں کیا ہے اس کا علم تو پہلے ہوتا ہی نہیں۔

دمِ رخصت باپ کی حکمت بھری نصیحت

وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۗ وَمَاۤ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۗ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿٦٧﴾

''اور اس نے کہا اے میرے بیٹو! ایک دروازے سے داخل نہ ہونا اور الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا اور میں تم سے اللہ کی طرف سے (آنے والی) کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا، حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اسی پر میں نے بھروسا کیا اور اسی پر پس لازم ہے کہ بھروسا کرنے والے بھروسا کریں۔''

یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو دوبارہ غلہ لانے کی خاطر مصر جانے اور بنیامین کو ساتھ لے جانے کی اجازت مرحمت فرما دی اور ساتھ پند و نصائح سے بھی نوازا جیسا کہ ہر دردمند باپ اولاد کو کسی سفر پہ روانہ کرتے وقت نصیحتیں کیا کرتا ہے۔ منجملہ نصیحتوں کے ایک یہ تھی کہ

''اے بیٹو! شہر مصر پہنچ جاؤ تو ایک ہی دروازے سے شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ ہو کے متفرق دروازوں سے داخل ہونے کی کوشش کرنا۔''

یہ بات سمجھنے کے لیے ہمیں قدیم دور کے شہروں کو جاننا ہو گا۔ تب حفاظتی نقطۂ نظر سے پورے شہر کے گرد ایک مضبوط دیوار کر دی جاتی تھی، جس میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے مختلف مضبوط دروازے رکھے جاتے تھے۔ رات کو یہ دروازے بند کر دیے جاتے اور صبح کھول دیے جاتے۔ یہاں تک کہ کسی بھی شہر میں رات کو دیر سے پہنچنے والے ساری رات صبح کا انتظار کرتے دیوارِ شہر سے باہر گزار دیتے، کیونکہ یہ دروازے پھر صبح ہی کو کھلتے تھے۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام کی نصیحت کا پس منظر یہ تھا کہ ان کی اولاد نہایت حسین و جمیل اور مضبوط ڈیل ڈول کی تھی۔ طاقت اور وجاہت سے سارے بیٹے مالا مال تھے۔ صاحب جمال

وکمال تھے۔ پھر ماشاء اللہ تعداد میں بھی درجن بھر تھے تو دیکھنے والا ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کے رہ جاتا۔ دردِ دل رکھنے والے باپ نے سوچا کہ جب یہ سب اکٹھے شہر میں داخل ہوں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کوئی حاسد نظر بد سے دیکھے اور یہ لوگ اس نظر بد کا شکار ہو جائیں۔ یا کسی اور بد خواہ کی کسی غلط سوچ کی بھینٹ چڑھ جائیں۔ چنانچہ اس ممکنہ تکلیف سے بچانے کی خاطر باپ نے نصیحت کر دی کہ متفرق دروازوں سے جدا جدا ہو کے داخل ہونا۔

مفسرین کی ایک بڑی تعداد نے اس آیت سے نظر بد ہی مراد لیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نظر کا لگ جانا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ احادیث مبارکہ میں بھی اس کا برحق ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ حسن وحسین کو مندرجہ ذیل دعا کے ساتھ دم کیا کرتے تھے:

((أُعِيذُ كُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَ هَامَّةٍ وَ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ)) [بخاری، کتاب احادیث الأنبیاء، باب : ۳۳۷۱]

''میں تم دونوں کو ہر شیطان اور ہر زہریلے جانور سے اور ہر لگ جانے والی نظر سے اللہ تعالیٰ کے مکمل کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں۔''

آپ ﷺ نے مزید وضاحت کی کہ ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام بھی انھی کلمات کے ساتھ اللہ کی پناہ میں آیا کرتے تھے۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں دن کے شروع میں رسول اللہ ﷺ کے ہاں گیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو شدید تکلیف کی حالت میں دیکھا۔ پھر میں شام کو بغرض عیادت حاضر ہوا تو رسول اللہ ﷺ تندرست وتوانا تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے بتایا کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے تھے۔ انھوں نے مجھے اس دعا کے ساتھ دم کیا تو افاقہ ہو گیا، دعا یہ ہے:

((بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيْكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيْكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَيْنٍ

حَاسِدٍ، اَللّٰهُ يَشْفِيكَ بِسْمِ اللّٰهِ اَرْقِيكَ ﴾ [مسلم، کتاب السلام، باب، الطب والمرض والرقى : ٢١٨٦]

''اللہ کے نام کے ساتھ میں تمھیں دم کرتا ہوں ہر تکلیف پہنچانے والی چیز سے اور جاندار کے شر سے اور ہر حاسد کی نظر سے، اللہ تمھیں شفا عطا فرمائے۔ میں اللہ کے نام کے ساتھ تمھیں دم کرتا ہوں۔''

ایک دن رسول اللہ ﷺ سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو وہاں ایک بچے کو تکلیف میں دیکھا، انھوں نے بتایا کہ اے اللہ کے رسول ! اسے دراصل نظر لگ گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا: ''تو تم اسے نظر بد سے بچاؤ کا دم کیوں نہیں کرتے؟''

زیر تفسیر آیت اور پیش کردہ دیگر احادیث سے خوب واضح ہو جاتا ہے کہ نظر بد کا لگ جانا واقعی ایک حقیقت ہے اور یہ کہ اس کے علاج کے طور پر دم کرنا ثابت اور جائز ہے۔

بہر حال دردمند باپ نے کسی بھی ممکنہ مصیبت سے بچاؤ کی خاطر بیٹوں کو یہ نصیحت فرما دی۔ ساتھ ہی یہ بھی وضاحت فرما دی کہ یہ تو محض انسانی ذہن سے سوچی ہوئی ایک تدبیر ہے۔ جہاں تک تقدیر کا تعلق ہے تو اس کے سامنے سب انسانوں کی طرح میں بھی بے بس ہوں۔ اس صورت میں جبر و ابتلا کے جو حالات و واقعات اللہ رب العزت نے ہمارے مقدر میں کر رکھے ہیں اس سے دیگر لوگوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی مفر نہیں۔ رب کے سامنے ہم بھی اسی طرح عاجز و درماندہ ہیں جس طرح دیگر لوگ، حکم اور حکمرانی اسی کی چلتی ہے۔ اسی کے فیصلے غالب آتے ہیں اور اسی کے بحکم حالات رونما ہوتے ہیں۔ ہم تم تدبیر کرتے ہیں جو کبھی کامیاب ہوتی ہے اور کبھی تقدیر کے ہاتھوں پٹ جاتی ہے۔ مطلب یہ کہ یہ نصیحت بس ایک تجویز ہی ہے۔ باقی توکل و اعتماد اور بھروسا تو رب کی ذات ہی پر ہے۔

اس مقام پر ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ یعنی حکم صرف اللہ کا ہے۔ اس حکم سے مراد تکوینی حکم ہے۔ حکم تکوینی میں وہ تمام امور شامل ہیں جن میں انسان کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان اللہ کے حکم یعنی تقدیر کے سامنے بے بس ہے اور بس انسان اللہ سے دعائیں کرے

اور توکل رکھے۔

سمجھنے والوں کے لیے بات بڑی واضح ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام پیغمبر ہیں، باپ اور دادا بھی پیغمبر ہیں۔ پورا خاندان انبیاء اور صلحا کا خاندان ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ میں بھی تمھیں تقدیر کے اس وار اور اللہ کے اس فیصلے سے نہیں بچا سکتا جو رب تمھارے لیے مقدر کر چکا۔

گویا سیدنا یعقوب علیہ السلام نے تدبیر بتانے کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ اوہام وخیالات کی دنیا کے اسیر نہیں بلکہ ان کا توکل و اعتماد اللہ ہی کی ذاتِ برکات پر ہے۔

اب کی بار سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو مصر میں الگ الگ داخلے کی نصیحت فرمائی تو یہ موجب حیرت ہے پہلی دفعہ ایسا کیوں نہ کیا؟ شاید اس لیے کہ پہلی مرتبہ جب وہ لوگ داخلِ مصر ہوئے تھے تو خستہ حال اور اجنبی تھے۔ اب وہ صورت نہ تھی، بادشاہ کے ہاں تعارف و تکریم بھی ہو چکی تھی اور پہلے کی نسبت حالت بھی بہتر تھی۔ حسد ونظر کے علاوہ شاید یہ بھی ذہن میں ہو کہ اس قدر مضبوط نوجوانوں کے یکبارگی داخلے پر حکومتی کارندے کسی سازش میں ماخوذ جان کر ہی نہ دھر لیں۔ ذہن کہتا ہے کہ اس مرتبہ بالخصوص نصیحت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس بار بنیامین بھی ساتھ تھے اور ان سے باپ کا خصوصی لگاؤ تو سب پر واضح ہے۔

❀❀❀

حسبِ ہدایت داخلہ، خلافِ خواہش معاملہ

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٦٨﴾

”اور جب وہ داخل ہوئے جہاں سے ان کے باپ نے انھیں حکم دیا تھا، وہ ان سے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو ہٹا نہ سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی جو اس نے پوری کر لی اور بلاشبہ وہ یقیناً بڑے علم والا تھا، اس وجہ

سے کہ ہم نے اسے سکھایا تھا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یہ لوگ سفر مصر پر روانہ ہوئے، پہنچ گئے اور پھر باپ کے حسبِ حکم اور حسبِ خواہش متفرق دروازوں سے مصر میں داخل بھی ہو گئے یہ سارا کچھ تو ایسے ہی ہوا مگر قرآن مجید یہاں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اس تدبیر پر تبصرہ فرماتا ہے اور قرار دیتا ہے کہ یہ محض سیدنا یعقوب علیہ السلام کی ایک تدبیر اور خواہش تھی کہ الگ الگ دروازوں سے جاؤ وگرنہ اللہ کی تقدیر سے اس تدبیر کے ساتھ بچاؤ ممکن نہ تھا اور یہ بات خود سیدنا یعقوب علیہ السلام بھی جانتے تھے اور بیٹوں کے سامنے اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ وقت رخصت سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بیٹوں سے گفتگو کے سلسلے میں آپ یہ پڑھ چکے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا:

﴿ وَمَآ أُغْنِي عَنكُم مِّنَ ٱللَّهِ مِن شَيْءٍ ﴾ [یوسف : ٦٧]

''اور میں تم سے اللہ کی طرف سے آنے والی کوئی چیز نہیں ہٹا سکتا۔''

اب قرآن مجید یہاں وہی بات کہہ رہا ہے:

﴿ مَّا كَانَ يُغْنِي عَنْهُم مِّنَ ٱللَّهِ مِن شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَىٰهَا ﴾

[یوسف : ٦٨]

''وہ ان سے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو ہٹا نہ سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی۔''

مقصد یہ ہے کہ اللہ کی تقدیر اور اس کی قضا و قدر کی طاقت ہم اچھی طرح جان لیں اور یہ بھی جان لیں کہ تدبیر کبھی تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، چنانچہ دیکھ لیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی یہ سب تدبیریں بیٹوں کو کسی آزمائش سے بچانے اور بالخصوص بنیامین کو بحفاظت واپس لانے کے سلسلے میں تھیں، کام نہ آ سکیں۔ چنانچہ قرآن مجید ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ یہ محض ایک تدبیر ہی تھی جس کا سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے حکم، قدرت اور غلبے کا اظہار ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ ایسے نادان بھی ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کی قدرت کو معاذ اللہ کھیل بنا دیا ہے۔ ہمارے ہاں عقائد کی یہ خرابیاں اتنی پھیل

چکی ہیں کہ لوگ ایسے ایسے قصے بطور دین بیان کرتے پائے جاتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی توہین کے ضمن میں آتے ہیں۔ مثلاً ایک واقعہ واعظین کی طرف سے بہت بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بڑھیا تھی جس کا اکلوتے بیٹے کے سوا کوئی سہارا نہ تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ بیٹا فوت ہو گیا۔ بڑھیا روتی پیٹتی پیر صاحب کے ہاں داد وفریاد کرنے حاضر ہوئی۔ کہنے لگی میں تو تنہا رہ گئی۔ ایک ہی بیٹا تھا وہ بھی فوت ہو گیا۔ پیر صاحب نے اک عجب قلندرانہ جلال سے دریافت کیا: ''مر گیا؟'' یعنی کیا ہماری اجازت کے بغیر ہی مر گیا؟

چنانچہ پیر صاحب اس پر بڑے غصے میں آ گئے۔ انھوں نے ملک الموت کو طلب کیا۔ وہ دن بھر کی قبض کردہ روحیں ایک تھیلے میں لیے ہوئے حاضر خدمت ہو گیا۔ پیر صاحب نے تھیلا چھینا اور تمام قبض کردہ روحوں کو آزاد کر دیا۔ پیر صاحب نے یہ کیا اور فرشتے کو ایک زوردار تھپڑ بھی جڑ دیا۔ اتنا زوردار کہ فرشتے کی آنکھ نکال دی۔ اب فرشتہ رب کے پاس شکایت لے کے چلا گیا اور ادھر تھیلے میں موجود تمام روحیں جو آزاد ہوئیں تو اس روز بڑھیا کے بیٹے سمیت تمام لوگ زندہ ہو گئے۔

اب سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہیے یہ واقعات کیا ہیں؟ کیا یہ تقدیر اور قدرتِ الٰہی کا مذاق بلکہ انکار نہیں۔ سچ یہ ہے کہ عام لوگوں اور واعظین کے پاس دین کا علم اور فہم نہیں جو عقائد کی بنیاد ہو۔ یہ ایک واقعہ نہیں، ہمارے ہاں کچھ لوگوں کے ہاں دین کا تصور ایسے ہی ماورائی قصے کہانیوں پر مشتمل ہے۔ کاش یہ لوگ قرآن کریم کو کبھی تبرک کے علاوہ تفہیم کے لیے بھی پڑھیں، مگر افسوس کہ.....

ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

ادھر اولیاء کا رتبہ اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ ان سے خدائی امور میں بے تحاشا مداخلت کروائی جا رہی ہے اور ادھر حقیقت یہ ہے کہ قرآن ایک پیغمبر ابن پیغمبر کے متعلق فرما رہا ہے:

﴿ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ﴾

[یوسف: ٦٨]

''وہ ان سے اللہ کی طرف سے آنے والی کسی چیز کو ہٹا نہ سکتا تھا مگر یعقوب کے دل میں ایک خواہش تھی۔''

یہ بات نہیں کہ اس سے پیغمبروں کی شان میں کمی آتی ہے یا ان کے حضور گستاخی لازم آتی ہے، نہیں، پیغمبروں کو رب نے جو عطا کیا ہوتا ہے دنیا میں کوئی اور اس کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ صاحبِ علم اور صاحبِ وحی ہوتے ہیں اور سیدنا یعقوب علیہ السلام بھی تھے۔ چنانچہ قرآن مجید صراحت کرتا ہے:

«وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنَاهُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ»

ہم نے انھیں بڑا علم دیا تھا۔ وحی کا علم عطا کر کے ان کا رتبہ بلند و بالا کر دیا تھا۔ لیکن اکثر لوگ اس سے لاعلم رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ اسی علم کا اثر تھا کہ انھوں نے دونوں باتیں کہہ دی تھیں۔

پہلی بات یہ کہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا، تا کہ کسی حاسد کے حسد اور شریر کے شر سے محفوظ رہو۔

دوسری یہ کہ یہ صرف میری ایک تدبیر ہے جو تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، تاہم اکثر لوگ ان باتوں کو نہیں جانتے اور نہ وہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں سو عقائد کی گمراہیوں میں پڑے رہتے ہیں اور شرک کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سمجھنے کی توفیق دے۔

❀❀❀

برسوں سے بچھڑے بھائیوں کی ملاقات

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ قَالَ إِنِّي أَنَا أَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٩﴾

اور جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس جگہ دی، کہا بلاشبہ میں ہی تیرا بھائی ہوں، سو تو اس پر غم نہ کر جو وہ کرتے رہے ہیں۔''

بھائی مصر پہنچ گئے، شاہِ مصر کے دربار میں داخل ہو گئے۔اب وہ یوسف علیہ السلام کے رو برو تھے۔ بات چیت اور ضروری گفتگو ہوئی۔ اب ان بھائیوں کے قیام و طعام کی باری آئی۔ مفسرین بتاتے ہیں کہ جب دسترخوان چن دیا گیا تو شاہِ مصر یعنی یوسف علیہ السلام نے ہدایت کی کہ سب دو دو ہو کے بیٹھو اور کھانا تناول کرو۔ آنے والوں کی تعداد گیارہ تھی۔ دس بھائی ایک ماں سے اور گیارھواں بنیامین، جو ظاہر ہے ان کا باپ جایا بھائی تھا اور اس کی والدہ ماجدہ دوسری تھیں، چنانچہ وہ آپس میں دو دو ہو کے دسترخوان پر بیٹھ گئے اور بنیامین تنہا رہ گئے۔ شاہِ مصر نے کہا آپ میرے ساتھ آ کے کھانا کھا لیجیے۔

اس کے بعد جب قیام کی باری آئی تو اب پھر سابقہ ترتیب برقرار رکھی گئی۔ کہا گیا اسی طرح دو دو افراد ایک کمرے میں قیام کرو۔ بنیامین اکیلے رہ گئے۔ یوسف علیہ السلام سب ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ ''آپ میرے ساتھ قیام کر لیں۔''

یہ مفسرین کی باتیں ہیں، قرآن مجید کے لفظ ﴿اٰوٰۤى اِلَيْهِ﴾ اس کی تائید کرتے ہیں۔ جب سب اپنی اپنی متعین جگہوں پر چلے گئے اور بنیامین اپنے بھائی کے ساتھ آ گئے تب یوسف علیہ السلام نے بات کھول دی اور رنجیدہ اور غمزدہ بھائی پر یہ انکشاف کیا: ﴿اِنِّيْۤ اَنَا اَخُوْكَ﴾ ''بنیامین، سنو ! میں ہی تمھارا بھائی ہوں، تمھارا ماں جایا اور یعقوب کا بیٹا یوسف !'' پھر یوسف علیہ السلام نے ان کے سامنے بیتے ایام کے مصائب کھول کر رکھ دیے۔

جب یہ بتا دیا تو ظاہر ہے بنیامین کی دل ونگاہ میں یوسف پر ہونے والے ظلم اور اس کی رنج بھری زندگی کے سارے دردناک لمحے تیر گئے ہوں گے۔ کس طرح گھر کے صحن میں معصوم یوسف بھائی کے ستم حسد کا شکار ہوئے۔ کس طرح اسے کنویں کی تہہ میں بے یار و مددگار اتار دیا گیا اور گھر آ کے بھیڑیے کے کھا جانے کا فسانہ سنایا گیا۔ آج جب بعد مدت کے بچھڑے بھائی نم آنکھوں سے ایک دوسرے کے گلاب چہرے اپنی نظروں میں سمو رہے تھے تو حیات گزشتہ کے رنج کی زنجیروں میں جکڑے سارے لمحے ضرور تصور میں آتے گئے۔

مگر ہمالیہ سے بلند اور سمندر سے زیادہ گہرے ظرف کے مالک یوسف علیہ السلام نے ایک ہی جملے میں نا صرف یہ سارے ستم، سارے ظلم خود بھلا دیے بلکہ بھائی سے بھی کہا کہ انھیں فراموش کر دیجیے، فرمایا: «فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ»

چھوڑیے بنیامین! ماضی کی سب غم کی شدتیں اور الم کی کیفیتیں بھلا دیجیے۔ جو ہوا سو ہوا اب دونوں مل بیٹھے ہیں تو غم ماضی کا کیا ذکر اور گئے دور کے درد کا کیا تذکرہ؟ میں نے یہ سب بھلا دیا سو آپ بھی ان کے متعلق دل صاف کر لیجیے۔ دیکھتے نہیں رب نے ہمارے صبر کا کیا اعلیٰ صلہ دیا ہے۔ بھائیوں نے کنویں میں پھینکا مگر رب نے اس کنویں کو ہمارے لیے مصر کا تخت و تاج بنا دیا تو اب ان سے کیا شکوہ، کیا شکایت اور کیا گلہ!

سبحان اللہ! نہیں معلوم اللہ اپنے پیغمبروں کے قلوبِ اطہر کس پاکیزہ آب و گلِ سے تراشتا ہے کہ ان میں نیکی، وفا، خلوص اور پارسائی کے اوصاف حمیدہ ہی ملتے ہیں، بے وفائی، کج ادائی اور حسد و کینے کے نشان بھی نہیں ہوتے۔ جانے یہ لوگ کیا سلیقہ رکھتے ہیں کہ زخم کھاتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ دامن پہ پتھر پڑتے ہیں تو ان کے لب سے دعا کے گلاب جھڑتے ہیں۔ سچ کہ جو لوگ سلیقے دعا کے رکھتے ہیں وہ واقعی حوصلے بھی بلا کے رکھتے ہیں۔ اللہ ہمیں بھی معاف کرنے کا سلیقہ عطا فرمائے۔ بقول شاعر.....

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَ لَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

”مجھے نیک لوگوں سے محبت تو بہت ہے مگر میں ان جیسا نہیں ہوں، شاید اللہ مجھے بھی اس محبت کی بدولت ان جیسا کر دے۔“

القصہ، یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو نا صرف اپنے متعلق سب بتا دیا بلکہ بھائیوں کے سب ستم بھلا کر دل صاف کر لینے کا بھی کہہ دیا۔ نیز منع فرما دیا کہ ابھی ان بھائیوں کو اس حقیقت کے بتانے کا وقت نہیں آیا سو یہ بات چیت ابھی اپنے ہی درمیان رہنی چاہیے۔

❀❀❀

رکو، ٹھہرو، اے اہلِ قافلہ! تم چور ہو!

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ ﴿٧٠﴾

''پھر جب اس نے انھیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا، پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا اے قافلے والو! بلاشبہ تم یقیناً چور ہو۔''

جب برادرانِ یوسف شاہی مہمان نوازی سے فیض یاب ہو چکے اور انھیں غلہ فراہم کر دیا گیا تو وہ سب مطمئن و مسرور اور شاداں و فرحاں واپسی کے لیے روانہ ہوئے۔

دراصل اس کا پس منظر یہ تھا کہ شبِ گزشتہ سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی بنیامین میں طے پا گیا تھا کہ بنیامین کو یوسف اپنے ہاں روک لیں گے۔ تدبیر یہی اختیار کی گئی تھی کہ بادشاہ کا وہ خاص برتن جو خزانے میں اناج ماپنے کے لیے مستعمل ہے، چپکے سے بنیامین کے غلے میں رکھوا دیا جائے گا اور پھر بنیامین کو چور قرار دے کر ٹھہرا لیا جائے گا۔ چنانچہ اسی طے شدہ تدبیر کے تحت اب پکار پکار کے قافلے کو روکا جا رہا تھا۔

بات آگے بڑھانے سے قبل یہاں ایک سوال کا جواب دینا ضروری ہے، سوال یہ ہے کہ حقیقت میں تو یہ لوگ چور نہ تھے، پھر ایک پیغمبر کی بلند مرتبت اور عالی حوصلے سے یہ کیسے ممکن ہے کہ انھیں چور قرار دے۔ مفسرین نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں۔

⌘ اولاً: یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی سے مل کر یہ تدبیر ضرور کی تھی کہ پیالہ بھائی کے غلے میں رکھوا دیا تھا مگر یہ جو بعد میں اعلان ہوئے وہ زبان نبوت سے نہ تھے۔ بس اتنا ہوا کہ کسی طرح اناج پر مامور کارندوں کو پیالے کی گمشدگی کا احساس ہوا تو انھوں نے دیکھا کہ یہی قافلے والے ہی یہاں سے روانہ ہوئے ہیں اس کے علاوہ نہ کسی کی آمد ہوئی اور نہ رفت، سو انھوں نے فوراً اہل قافلہ کو روک لیا اور اعلان کر دیا کہ ٹھہرو ضرور تمھی چور ہو۔

یہ تو طے ہے کہ یہ صدا سیدنا یوسف علیہ السلام نے نہیں لگائی تھی کیوں کہ قرآن مجید نے ﴿ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ ﴾ یعنی منادی نے ندا لگائی کہا ہے۔ عقلاً بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خود بادشاہ ہی منادی شروع کر دے۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک باقاعدہ منصب ہے اور اس کے لیے ہر دربار میں علیحدہ لوگ مختص ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر صورتحال یہ تھی تو اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ پیالہ رکھنے کی تدبیر یوسف علیہ السلام نے کی اور باقی سارے معاملات اناج پر مامور کارندوں نے یوسف علیہ السلام کی ہدایات کے بغیر سرانجام دیے۔ دراصل انھوں نے وہی کیا جو اس صورتحال کا تقاضا تھا۔

⌘ ثانیاً: زیادہ قرین قیاس تو وہی صورت ہے جو اوپر مذکور ہے تاہم اگر بالفرض یوسف علیہ السلام نے انھیں چور کہا بھی تھا تو یہ ایک تعریض تھی۔ اہل ادب کلام کی اس صنف کے متعلق جانتے ہیں، اس میں جو بولا جاتا ہے وہ تو صحیح ہوتا ہے لیکن وہ صحیح کسی اور موقع کے لیے ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر برادرانِ یوسف علیہ السلام کو چور قرار دیا گیا تو یہ کلام اس اعتبار سے غلط نہیں کہ وہ سیدنا یعقوب علیہ السلام سے ان کا لخت جگر چرا کر بیچ چکے تھے۔ لہٰذا چور کہنا غلط نہ تھا۔

⌘ ثالثاً: اس چوری کا سارا بوجھ اس پر تھا جس کے غلے سے بادشاہ کا پیالہ برآمد ہوتا اور وہ بنیامین تھے۔ بنیامین کی اس سلسلے میں رضامندی یوسف علیہ السلام پہلے ہی حاصل کر چکے تھے اور وہ اس پر بخوشی آمادہ تھے۔ لہٰذا یہ کسی پر زیادتی نہ تھی۔

یہ وہ صراحتیں ہیں جو اس مقام کے متعلق مفسرین کرام کی فکر اور علم و فن کا نتیجہ ہیں اور یقیناً قابل قدر ہیں مگر ہمیں یہاں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سارے حالات و واقعات دراصل واقعہ میں مذکور کرداروں اور بالخصوص سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اک نہایت کڑی آزمائش تھے۔

یہ تمام تر حالات نہ یوسف علیہ السلام کی خواہش پر پیش آئے نہ اس میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی

آرزو شامل تھی۔ یہ حالات دراصل گردشِ دوراں کے مالک اور لیل ونہار کے خالق ہی کی مرضی ومنشاء کے مظہر تھے۔ یوسف علیہ السلام نے جہاں جو کیا اس میں ان کی اپنی مرضی نہیں تھی وہ وحی الٰہی کے تابع تھے اور الٰہی ہدایات کے مطابق ہی سارے اقدامات کرتے رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اقتدار کے حصول کے بعد وہ کسی بھی ذریعے سے باپ کو خبر نہ کرتے، کیونکہ اب ان کے پاس تمام تر وسائل تھے۔ اقتدار اور اختیار تھا وہ خود باپ کو جا ملتے، انھیں بلوا بھیجتے یا کم از کم اپنی خیریت ہی کا سندیسہ بھیج دیتے۔

مگر چونکہ ابھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت نہ تھی۔ ابھی اللہ کو اپنے نہایت صابر بندے سیدنا یعقوب علیہ السلام کا مزید امتحان مقصود تھا اس لیے سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ یعقوب علیہ السلام سے بالکل رابطہ نہ کیا۔ باقی معاملات بھی جو پیش آتے رہے ان کی اس کے سوا کوئی دوسری توجیہ نہیں کہ وہ حکم الٰہی کے تابع تھے۔ یہاں یہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا یا جو کچھ یوسف علیہ السلام نے کیا یہ محض ان کی اپنی تدبیر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ بھی بس احکامات کی پیروی ہی تھی۔ سو اس سارے سلسلے میں یوسف علیہ السلام کے کردار کو زیر بحث لانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آخری بات کے طور پر یہ دیکھ لیجیے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی یہ ساری تدبیر اور بعد ازاں پیش آمدہ معاملات میں یوسف علیہ السلام کی خاموشی وغیرہ، یہ ان کی خود اختیار کردہ راہ نہیں، بلکہ احکامات الٰہی کے حضور محض تسلیم و رضا تھی سب کچھ اللہ کی طرف سے تھا۔ جس طرح یوسف علیہ السلام نے اللہ کی رضا کو مانا ہمیں بھی ماننا چاہیے۔ یہ بھی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ اللہ کے ہر کام میں حکمت ہے اور خیر ہے ضروری نہیں کہ ہر حکمت سمجھ آئے۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے اس اہم موقع پر سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس کردار کو مکمل تحفظ فراہم کیا ہے۔ ہمیں اس شخص پر اعتراض یا اس کی صفائی کی بھلا کیا ضرورت جس کے متعلق قرآن مجید نے کہا:

«كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ» اور یوں اللہ رب العزت نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو بری الذمہ قرار دے کر سارا کچھ اپنے ذمے لے لیا۔

یہ ایک ضروری وضاحت تھی جسے مدنظر رکھے بغیر بات کی درست سمت سمجھی نہیں جا سکتی، بہر حال بات ہو رہی تھی کہ قافلے والے روانہ ہوئے تو انھیں روک لیا گیا بلکہ ان پر چور ہونے کا لیبل بھی چسپاں کر دیا گیا۔

یہ اعلان سن کر برادرانِ یوسف نے فوراً قافلے کا رخ موڑا۔ وہ منادی کرنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے بھئی! دمِ رخصت تم نے یہ کیا چوری کی صدا شروع کر دی ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ: «مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ» ''تمھاری کیا چیز غائب ہوئی ہے جس کے لیے ہمیں چور قرار دے رہے ہو؟''

❁❁❁

پیالے کی گمشدگی، دستیابی اور فیصلہ

قَالُوْا وَ اَقْبَلُوْا عَلَیْهِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ وَ لِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّ اَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ ۝ قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَ مَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ۝

''انھوں نے کہا، جب کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے، تم کیا چیز گم پاتے ہو؟ انھوں نے کہا ہم بادشاہ کا پیمانہ گم پاتے ہیں اور جو اسے لے آئے اس کے لیے ایک اونٹ کا بوجھ (غلہ) ہوگا اور میں اس کا ضامن ہوں۔ انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تم جان چکے ہو کہ ہم اس لیے نہیں آئے کہ اس ملک میں فساد کریں اور نہ ہم کبھی چور تھے۔''

برادرانِ یوسف اس سلسلے میں بے قصور اور پورے معاملے سے لاعلم تھے۔ وہ تو باپ کی نصیحتیں پلے باندھ کے بچتے بچاتے آئے تھے۔ ایسے کسی بھی ممکنہ الجھاؤ سے بچنے کی خاطر الگ الگ دروازوں سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ مفسرین نے لکھا کہ انھوں نے اپنے اونٹوں کے منہ تک باندھ رکھے تھے تاکہ وہ کسی کی فصل میں منہ نہ ماریں اور کسی لڑائی

جھگڑے یا تو تکرار کی نوبت نہ آئے۔

اب جو ان پر الزام عائد کیا گیا تو انھوں نے اللہ کی قسم اٹھا کے اپنی صفائی پیش کی۔ دراصل ان کے لہجے اور گفتگو میں یہ سارا اعتماد اس لیے تھا کہ وہ واقعتاً چور نہ تھے۔ آج شاید اس لیے اس الزام کو سن رہے تھے کہ دنیا میں مکافاتِ عمل کا سلسلہ بہر حال جاری رہتا ہے۔ کردہ جرم سے بندہ بچ جائے تو کبھی کسی ناکردہ جرم میں دھر لیا جاتا ہے اور یہ اللہ کا بندے پر ظلم نہیں ہوتا، بہر حال انھوں نے قسم اٹھا کے دو چیزوں کی نفی کی:

① ہم زمین میں فساد بپا کرنے نہیں آئے۔

② اور نہ ہی ہم کسی چوری کی نیت سے آئے ہیں۔

ظاہر ہے برادرانِ یوسف نے انھیں ہر طرح کی صفائی دینے اور پوری طرح سے مطمئن کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ جب بادشاہ ان کے ساتھ اس اعزاز و اکرام اور عزت و احترام کے ساتھ پیش آ رہا ہے، انھیں اونٹ بھر بھر کے غلے سے نواز رہا ہے۔ ان کے لیے شاہی ضیافت کدوں کے دروازے کھول کر ہر آسائش و اکرام ان پر نچھاور کر رہا ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسی بادشاہ کی کوئی چیز چرا لیں؟ پھر یہاں آنا، رہنا ہماری طرزِ بود و باش سب تمھارے سامنے ہے، ہم پہلے بھی آ چکے، یہ سب تم جانتے ہو، پھر یہ الزام کیوں؟ وہ سخت برافروختہ ہو کر اور سخت پریشان ہو کر یہ سب پوچھ رہے تھے۔

اب صورتحال یہ ہے کہ بادشاہ کے اہلکاروں اور اہل قافلہ میں روبرو گفتگو ہو رہی ہے۔ برادرانِ یوسف کو چور قرار دے دیا گیا ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تم نے جو یہ شور مچایا ہے تو یہ تو بتاؤ تمھارا کیا کھو گیا ہے اور تم کس چیز کی تلاش میں ہو؟

اہلکاروں نے انھیں بتایا:

«نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ» ”دراصل ہم بادشاہ کا پیالہ تلاش کر رہے ہیں۔“

یہ پیالہ کیسا تھا؟ اس کے متعلق مفسرین نے بڑی خیال آرائیاں کی ہیں۔ کسی نے اسے

سونے کا اور کسی نے چاندی کا لکھا۔ کسی نے بتایا کہ یہ بادشاہ کا مشروب پینے کا خصوصی پیالہ تھا۔ بعض نے کہا نہیں بادشاہ کے پینے کا نہیں یہ دراصل گندم ماپنے کے کام آنے والا پیمانہ تھا۔

اتنا بہر حال طے ہے کہ تھا یہ بہت بیش قیمت کیونکہ اسے «صُوَاعَ الْمَلِكِ» یعنی ''بادشاہ کا پیالہ'' قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بادشاہ سے کوئی معمولی چیز منسوب نہیں کی جاتی ہے۔

بہرحال یہ پیالہ کھو گیا تھا اور اس کی بازیابی کے لیے اعلانات ہو رہے تھے اور یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ جو بھی اسے فراہم کرے گا یا اس سلسلے میں معاونت کرے گا اسے اتنا غلہ فراہم کرنے کی ضمانت دی جاتی ہے جتنا غلہ کسی بھی اونٹ پر لادا جا سکتا ہے۔

❀❀❀

اپنے ہی ہاتھوں مصیبت کا سامان کر بیٹھے

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ ﴿٧٤﴾ قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿٧٥﴾

''انھوں نے کہا پھر اس کی کیا جزا ہے، اگر تم جھوٹے ہوئے؟ انھوں نے کہا اس کی جزا وہ شخص ہے جس کے کجاوے میں وہ پایا جائے، سو وہ شخص ہی اس کی جزا ہے۔ اسی طرح ہم ظالموں کو جزا دیتے ہیں۔''

معلوم ہوتا ہے اہلکاروں نے برادرانِ یوسف کے یہ سارے دلائل صفائی سنے، اپنی براءت پر ان کا اصرار ملاحظہ کیا اور اس فعل سے بری الذمہ ہونے پر ان کا زور دیکھا تو پھر گویا ایک طرح سے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بات انھی پر پلٹ دی:

«فَمَا جَزَآؤُهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِيْنَ» ''اچھا جو تم نے کہا سب درست اب یہ بھی تم ہی تجویز کرو کہ اگر تم جھوٹے ثابت ہوئے تو تب تمھاری سزا کیا ہونی چاہیے؟''

اس پر انھوں نے بڑے دھڑلے اور دوٹوک انداز میں کہا کہ اگر ہم چور ثابت ہوں تو:

«مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ» ''جس کے کجاوے میں سے تمھارا پیالہ نکل آئے، اسے تم اپنے پاس رکھ لو۔''

کیونکہ: «كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ» ''ہمارے ہاں تو ایسا ظلم کرنے والوں کو یہی سزا دی جاتی ہے۔''

یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے جا رہے تھے، نہیں جانتے تھے کہ خود اپنے لیے ایک ایسا جال بن رہے ہیں کہ پھر اس سے نکل نہ پائیں گے۔ انھوں نے چور کی جو سزا بیان کی یہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھی۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ہماری شریعت سے پہلے چور کی یہی سزا ہوتی تھی۔ بہرحال یہ سزا شریعتِ یعقوب کے موافق تو تھی۔ مگر مصر میں ایسی کوئی سزا نہ تھی بلکہ وہاں چور کو مار پیٹ کر اس سے سامان واپس لے لیا جاتا تھا اور اسے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اب اگر یہ برادرانِ یوسف خود سزا تجویز نہ کرتے اور اس سلسلے میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے سزا کو ان پر چھوڑ دیتے تو کچھ بھی ہوتا بنیامین کو تو ساتھ لے جاتے مگر انھیں اپنی سچائی کا اس قدر یقین تھا کہ نہ کہنے کی باتیں بھی برابر کہتے چلے گئے۔

❀❀❀

جرم ثابت ہوتا ہے

فَبَدَاَ بِاَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِيْهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِيْنِ الْمَلِكِ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَفَوْقَ كُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾

''تو اس نے اس کے بھائی کے تھیلے سے پہلے ان کے تھیلوں سے ابتدا کی، پھر اسے اس کے بھائی کے تھیلے سے نکال لیا۔ اس طرح ہم نے یوسف کے لیے تدبیر کی، ممکن نہ تھا کہ بادشاہ کے قانون میں وہ اپنے بھائی کو رکھ لیتا مگر یہ کہ اللہ

چاہے، ہم جسے چاہتے ہیں درجوں میں بلند کر دیتے ہیں اور ہر علم والے سے اوپر ایک سب کچھ جاننے والا ہے۔''

جب اہلکاروں اور اہل قافلہ کے مابین بات چیت ہو چکی اور یہ طے پا گیا کہ اگر قافلے والے چور ثابت ہوئے تو جس شخص کے سامان سے بادشاہ کا بیش قیمت پیالہ نکلے گا وہ اس کے عوض پکڑ لیا جائے گا۔ اب غلہ کی تلاشی لی جانے لگی۔ یوسف علیہ السلام کو یہ تو صاف پتا تھا کہ پیالہ کس کے غلے میں ہے؟ اور ظاہر ہے کہ وہ بنیامین کے اونٹ پر لدے غلے میں تھا، اس کے باوجود پہلے دیگر اونٹوں کی تلاشی لی گئی تا کہ کہیں قافلے والے شک میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ کوئی خود ساختہ معاملہ ہے۔ سو پہلے دیگر اونٹوں کا غلہ چھانا گیا اور پھر جب بنیامین کی باری آئی تو اس کے غلے سے پیالہ برآمد کر لیا گیا۔

یہ دیکھ کر سب بھائیوں کی گردنیں شرم سے جھک گئیں۔ چند لمحے قبل اپنی صفائی میں کہے گئے ان کے سارے لفظ اور تمام دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ اب بادشاہ کے کارندے ثبوت ہاتھوں میں لیے کھڑے تھے اور ان کو انکار کی ہمت نہ تھی۔ سو یہ ندامت اور طیش سے بھرے بنیامین کو سخت سست کہنے لگے جو ظاہر ہے بنیامین نہایت لطف و مسرت سے سن اور سہہ رہے ہوں گے، کہ جو وہ جانتے تھے یہ نہیں جانتے تھے۔

﴿ كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّآ أَن يَشَآءَ اللّٰهُ ﴾

یہاں اللہ رب العزت اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعے سے ناممکن کو ممکن کرنے اور حالات کے دھارے کو بدل دینے کی طاقت کا اظہار فرما رہے ہیں۔ پہلے تو یہ صراحت فرمائی کہ کسی کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ یوسف یہ سب اپنی مرضی سے کرتا رہا۔ بھائیوں کو حقیقتِ حال سے بے خبر رکھ کر ان سے یہ کچھ کرتا رہا، بلکہ یہ سب تدبیریں اور منصوبے اللہ کی طرف سے تھے۔ ملکی قانون کی عدم موافقت کے باوجود بھائی کو پاس رکھنے کی تدبیر اللہ کی سمجھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اگر یوسف چاہتے بھی تو ملکی قانون کے تحت کسی صورت بھی بھائی کو رکھ نہ

سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ اگر اللہ چاہتا اور اس کی توفیق شامل حال ہو جاتی، چنانچہ اللہ کی مشیت کے بل پہ یہ ناممکن کام یوسف علیہ السلام کے حق میں ممکن ہو گیا۔

اب یہ اللہ تعالیٰ نے خود یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے منہ سے نکلوا دیا۔ وہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ ان پر ظلم ہوا، کیونکہ برادرانِ یوسف خود فیصلہ دے چکے تھے۔

«نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ وَ فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ»

یہاں اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی بھائیوں پر فوقیت وفضیلت کا اظہار کیا ہے۔ بھائیوں کی نسبت یوسف علیہ السلام کے درجات بلند تھے، ان کی تدبیر کارگر تھی، ان کا صبر ثمر بار تھا اور ان کی فراست بے پناہ تھی۔ بھائیوں کے ظلم پر انھوں نے صبر کیا اور اجر پایا۔

گویا یوسف علیہ السلام کی اللہ تعالیٰ مدح بیان فرما رہے ہیں اور یہ مدح وتعریف ان کے اس علم اور تدبیر کی کی جا رہی ہے، جو اللہ نے ان کو سمجھائی تھی۔ اللہ اپنے نبی کو علم وحی بھی دیتا ہے پھر باقی لوگوں پر فوقیت بھی دیتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے لفظ کیا ہیں:

«نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ»

''ہم جسے چاہتے ہیں اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں۔''

انھی الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی مدح بھی قرآن مجید میں فرمائی ہے۔ اس وقت جب نمرود سے ان کا مناظرہ جاری تھا اور وہ شمس وقمر کے الٰہ ہونے کے رد میں نہایت وزنی دلائل پیش کر رہے تھے، وہاں اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ﴾ [الأنعام: ۸۳]

''ہم جسے چاہتے ہیں اس کے درجات بلند کر دیتے ہیں۔''

مقصد یہ کہ علم بڑی عظیم نعمت ہے اور یہ درجات کی بلندی کا باعث ہے۔

پھر فرمایا کہ کسی کو اپنے علم، اپنی فراست، اور اپنی فہم پر تکبر کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ اگر کوئی عالم ہے تو یاد رکھے کہ اس سے بڑا عالم بھی موجود ہے۔ کوئی بھی شخص ناگزیر نہیں، قبرستان ناگزیر لوگوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہر عالم سے بڑا عالم موجود ہے اور اللہ تعالیٰ

کی ذات تمام تر عالموں سے بڑی ہے اللہ کا علم ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ اس کا یہ بھی معنی ہے کہ گو برادرانِ یوسف بھی ابن پیغمبر تھے، عالم و فاضل اور اصحاب فہم و فراست تھے، مگر یوسف کا علم ان سے بھی فزوں تر تھا اور یوں ہمیشہ ہر صاحبِ علم سے بڑا عالم ہوا کرتا ہے۔

❀❀❀

کینہ، حسد کی زہر نشانیاں

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ﴿۷۷﴾

''انھوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو بے شک اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ تو یوسف نے اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان کے لیے ظاہر نہیں کیا، کہا تم مرتبے میں زیادہ برے ہو اور اللہ زیادہ جاننے والا ہے جو تم بیان کرتے ہو۔''

تحقیق کے بعد جب ثبوت میسر آ گئے اور جب برادرانِ یوسف ہر طرح سے لا جواب ہو گئے اور سب کے سامنے بنیامین کے غلے سے شاہِ مصر کا پیالہ برآمد کر لیا گیا تو اب انھوں نے بنیامین کو خود سے الگ ظاہر کرنا اور اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ دراصل یہ ہے تو بھائی ہمارا مگر والدہ سے نہیں باپ سے ہے اور اگر اس نے آج چوری کر کے ہمیں پھنسوا دیا تو کیا تعجب اس کا ایک بھائی تھا یوسف، وہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے بھی چوری کی تھی۔ بس یہ دو بھائی ایسے ہیں باقی ہم تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔

اندازہ کیجیے یوسف علیہ السلام سامنے کھڑے ہیں۔ بھائیوں سے احسان و عزت کا بے انتہا سلوک کر چکے ہیں اور یہ لوگ اپنی جہالت اور نادانی کی بنا پر آج بھی یوسف علیہ السلام کو معاف کرنے کو تیار نہیں۔ یوسف نے بھلا ان کا بگاڑا ہی کیا تھا؟ حسد بھی کیا بری چیز ہے اور حاسد

کبھی نہ بجھنے والی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں؟ وہ جنھوں نے یوسف کو شفقتِ پدری سے محروم کیا، گھر کی مانوس فضا سے اٹھایا اور کنویں کی اجنبی تہہ میں اتار دیا۔ پھر یوسف جیسا بے مثال شخص بیس درہموں میں بیچ دیا گیا۔ گھر آ کے بوڑھے باپ کے سامنے خود ساختہ افسانہ دہرا کے یہ تو فارغ ہو گئے مگر روتے روتے باپ کی بینائی بھی جاتی رہی۔ کبھی انھیں باپ پہ ترس نہ آیا اور کبھی انھوں نے ان کے سامنے حقیقت بیان نہ کی۔

کہنے کا مقصد ہے جہاں بھی بن پڑا انھوں نے یوسف پر مظالم اور ستم کے پہاڑ توڑے مگر اس معصوم مظلوم کو منظر سے غائب ہوئے بھی اک زمانہ بیت گیا، یہ آج بھی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں۔

یہ ہے وہ آتشِ حسد جو جلاتی بھی ہے اور بھسم بھی نہیں ہونے دیتی۔ جو آنکھوں اور دل پہ تاریکی کا وہ گہرا رنگ پھیر دیتی ہے کہ پھر رحم، ترس اور خدا خوفی کے دوسرے رنگ دکھائی ہی نہیں دیتے۔

قربان جایئے، سیدنا یوسف علیہ السلام کے تحمل، ان کی برداشت اور ان کے حلم پر! کہ قوت اور تمام تر طاقت و اختیار کے باوجود بھی یہ تیر الزام اور یہ سنگ دشنام کس بردباری، حلیمی اور کس خاموشی سے سہہ لیا ہے۔ سچ کہ صاحب ہمت کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں، وسیع الظرف، حلیم الطبع اور منکسر المزاج! پست ہمت اور کم ظرف لوگ کانٹا بھی چبھے تو شور مچا دیتے ہیں۔ مگر اہل عزیمت کے دلوں میں طوفان ہی کیوں نہ مچل رہے ہوں ان کے لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلا کرتے ہیں، بقول اقبال......ع

کہہ رہا ہے شورِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

کاش اللہ ان لوگوں کو عقل دے جو زبان درازی ہی کو معراجِ عمل اور چرب زبانی ہی کو کمالِ فعل گردانتے ہیں۔ وہ جو واویلا، شور اور ماتم و گریہ ہی کو دلیل صداقت سمجھتے ہیں اور حکمت و دانائی کے باعث خاموش شخص کو بزدل خیال کرتے ہیں۔ یہ کس قدر بودے، کس

قدر گھٹیا اور کس قدر کھوکھلے لوگ ہوتے ہیں۔ جعلی اور وقتی جیت کے لیے دائمی صداقتوں کا منہ چڑانے والے یہ لوگ نہیں جانتے ہوتے کہ شاید سارا ماحول، اس ماحول کی تمام جزئیات حتیٰ کہ ان کا اپنا عمل اور جسم کے تمام اعضاء بھی اس وقت ان کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں۔ دھوکے میں آئے یہ لوگ کاش کبھی صداقت، عجز اور لب بستگی کا ذائقہ بھی محسوس کر سکتے۔ مگر نہیں، یہ تو سیدنا یوسف علیہ السلام جیسے کردار کے لوگوں کا نصیب ہے، دوسروں کا نہیں۔

یوسف علیہ السلام کی عظمتِ کردار کی قرآن گواہی دیتا ہے:

«فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ» ''تو یوسف نے اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان کے لیے ظاہر نہیں کیا۔''

سیدنا یوسف علیہ السلام نے سب کچھ دل میں چھپا لیا اور زبان و عمل اور چہرے کے تاثرات تک سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ یوں ظاہر کیا گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ گویا انھوں نے چوری کا الزام وقت کے حاکم، سامنے کھڑے یوسف پر نہیں، کسی اور پر عائد کیا ہے۔ سب چھپا لیا، سب دبا لیا یوں کہ ماتھے پر شکن آئی نہ چہرے پر ناگواری کا رنگ۔ اب یہاں دیکھیے کہ یوسف نے تو زبان دانتوں تلے دبا لی مگر عرش سے اس کا رب بولا، وہ رب جو اپنا ہو جانے والوں کی عزت وحمیت کا نگہبان بن جاتا ہے۔ وہ جس نے اعلان کر رکھا ہے۔

''میرے ولی سے جنگ مجھ سے جنگ۔''

یوسف خاموش رہا مگر یوسف کا رب نہیں، اس نے تبصرہ کیا جو رہتی دنیا تک تلاوتوں اور مسجدوں میں گونجتا رہے گا۔ فرمایا:

«أَنتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۖ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ» یوسف چور نہیں تھا۔ اس کا رب بہتر جانتا ہے مگر سنو، تم نے جو کچھ کیا اس پر رب گواہی دیتا ہے کہ وہ نہایت شر پر مبنی تھا۔ یہ بہت بڑی دعوت ہے دین کے داعی حضرات کے لیے کہ جب لوگ حسد کی وجہ سے ان پر الزام تراشیاں کرتے ہیں تو اللہ خود دفاع کرتا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ پر توکل رکھنا چاہیے۔

❀❀❀

کل کے زبردست، زیر دست ہو گئے

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝

''انھوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا ایک بڑا بوڑھا باپ ہے، سو تو ہم میں سے کسی کو اس کی جگہ رکھ لے، بے شک ہم تجھے احسان کرنے والوں سے دیکھتے ہیں۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ کہ ہم اس کے سوا کسی کو پکڑیں جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے، یقیناً ہم تو اس وقت ظالم ہوں گے۔''

جب برادرانِ یوسف، سیدنا یوسف علیہ السلام اور بنیامین پر دل کی بھڑاس نکال چکے تو انھیں صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ آگے بڑھ بڑھ کر جو دعوے کیے تھے۔ وہی اب بلائے جاں بن گئے تھے۔ انھیں یاد آیا کہ کس مشکل اور وعدے سے بھائی کو ساتھ لائے تھے اور اب اگر ساتھ نہ لے جا سکے تو پہلے سے ستم رسیدہ باپ پر یہ نئی افتاد کس طور ٹوٹے گی۔ جب گھر داخلے اور باپ کے سامنے پیشی کا تصور آیا تو یوسف اور برادرِ یوسف کے خلاف سب چوکڑی بھول گئے اور پھر لگے شاہِ مصر کی خوشامد اور منتیں کرنے۔

کہنے لگے کہ یہ تو درست کہ بنیامین نے چوری کی، وہ تو خیر اس کے بھائی نے بھی کی تھی، مگر اے احسان کے عادی اور مروت کے پیکر شاہِ مصر، صورتحال بڑی سنگین ہے۔ اس کا باپ بڑا بوڑھا اور ستم گزیدہ شخص ہے۔ اس کو تو پہلے ہی گردش حالات نے کمر خمیدہ کر دیا ہے۔ پہلے ایک جوان بیٹا جو گم ہوا تو آج تک پلٹ کے نہیں آیا۔ جوان بیٹے کی گمشدگی پر بوڑھا باپ رو رو کر ہلکان ہو چکا ہے، وہ تو اتنا رویا ہے کہ ((و ابیضت عیناہ)) اس کی تو آنکھوں کی بینائی بھی سلامت نہیں رہی، سو جوان بیٹے کی حرکت پر نہیں پیرانہ سال بزرگ کی

حالت پر رحم کیجیے۔ قانون اور انصاف کی عملداری بجا مگر ہم اس کے بدلے اپنا کوئی سا بھی دوسرا بھائی آپ کی گرفت میں دینے کو تیار ہیں۔ مگر خدارا اسے چھوڑ دیجیے۔ ہم اس کے بنا باپ کا سامنا نہ کر سکیں گے اور اس خبر کے بعد باپ کی ابتر ہوتی ہوئی حالت نہ دیکھ سکیں گے۔ ازراہِ کرم ہم میں سے جسے چاہتے ہیں پکڑ لیجیے، مگر اسے چھوڑ دیجیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بڑے نیک ہیں۔ پہلے بھی ہمارے ساتھ نہایت عمدگی سے پیش آ چکے۔

ظاہر ہے یہ ساری التجا، استدعا اور آہ و زاری سیدنا یوسف علیہ السلام نے نہایت آزردگی سے سنی ہوگی اور بالخصوص باپ کی دل ادھیڑ دینے والی حالت نے یوسف کو خون کے آنسو رلایا ہوگا مگر لب کھلے تو کہا وہی جو منشائے ایزدی تھا، فرمایا:

﴿مَعَاذَ اللّٰهِ﴾ ”اللہ کی پناہ! کہ ہم یہ ظلم کریں۔ بادشاہوں کا کام ظلم نہیں عدل اور انصاف ہوتا ہے ایک ملزم اور خطا کار شخص کو چھوڑ دینا اور اس کی جگہ کسی بے گناہ کو پکڑ کر دینا نہ تو قرینِ انصاف ہے اور نہ عدل کا تقاضا، چنانچہ جو کچھ تم نے بیان کیا وہ اپنی جگہ بجا مگر شاہوں کے کٹہرے میں عدل ہی کے علم لہرایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم ظلم کر کے اپنا شمار ظالموں میں نہیں کروانا چاہتے۔ بلکہ عدل ہی ہوگا اور عدل کا تقاضا ہے کہ بنیامین کو ہی روکا جائے گا۔

❀❀❀

شکست خوردہ قافلہ، حسرت و یاس کا منظر

فَلَمَّا اسْتَايْـَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ؕ قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۰﴾

”پھر جب وہ اس سے بالکل ناامید ہو گئے تو مشورہ کرتے ہوئے الگ جا بیٹھے، ان کے بڑے نے کہا کیا تم نے نہیں جانا کہ تمھارا باپ تم سے اللہ کا عہد لے چکا ہے اور اس سے پہلے تم نے یوسف کے بارے میں جو کوتاہی کی، اب میں اس

زمین سے ہرگز نہ ہلوں گا یہاں تک کہ میرا باپ مجھے اجازت دے، یا اللہ میرے لیے فیصلہ کر دے اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہے۔''

جب شاہِ مصر کے حضور برادرانِ یوسف نے اپنی آہ بے اثر دیکھی اور دیکھا کہ سب داد وفریاد اور نالہ بادشاہ کے فیصلے کو ذرا متاثر نہیں کر سکا تو تھک ہار کر الگ ہو بیٹھے۔

اب پریشان حال اور پراگندہ خیال بیٹھے سوچتے ہیں کہ اس آفتِ ناگہانی سے نجات کی کیا صورت ہو؟ سب تدبیریں، سارے منصوبے اور تمام آرزوئیں پامال ہو چکی تھیں اور ناکامی و مایوسی کا زہر ان کی نس نس میں اتر چکا تھا۔ کل یوسف کو پردیسی لوگوں کے ہاتھ چند درہم کے عوض شاداں وفرحاں بیچ آنے والے آج خود غریب الدیاری میں بے بسی کا ذائقہ چکھ رہے تھے۔ قرآن بتاتا ہے: «خَلَصُوا نَجِيًّا» مگر تدبیر کیا کر سکتی ہے جب تقدیر پرے کھڑی اس پر مسکرا رہی ہو.....ے

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں، کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

برادرانِ یوسف میں جو بڑا تھا وہ اس محفل میں سب سے زیادہ زیرک اور دردِ دل رکھنے والا شخص تھا۔ یہ وہی تھا جس نے یوسف علیہ السلام کے قتل سے بھائیوں کو روکا تھا اور کہا تھا کہ قتل کی بجائے اسے کسی اندھے کنویں میں پھینک دو، وہ بھائیوں کو احساس دلانے لگا کہ اب کس دل سے اور کس منہ سے گھر جائیں گے۔ کیا نہیں جانتے اللہ کے نام پر باپ نے ہم سے حلف لیے تھے کہ بنیامین کو ساتھ لانا، اب جب وہ ساتھ نہیں تو باپ کو ہم کسی طور بھی مطمئن نہیں کر سکتے۔ لاکھ حقیقت حال بتائیں گے مگر باپ نہیں مانے گا اس لیے کہ ہمارے سابقہ کردار اور ریکارڈ میں یوسف علیہ السلام کا واقعہ بھی موجود ہے۔ باپ تو یہی سمجھے گا کہ آج پھر یہ اسی قصہ کو دہرا آئے ہیں۔ سو بھائیو! تم چلے جاؤ، اس لیے کہ باپ کو تنہا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا کہ کہیں وہ یہ ہی نہ سمجھ لے کہ سبھی جوان بیٹوں کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔ اس لیے تم جاؤ مگر میں تو اب جانے کا نہیں...... مجھ میں باپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں، میں تو یہیں

مصر ہی میں ٹھہروں گا۔ باپ کو جا کے واقعہ بتا دینا اور میرے متعلق بھی کہہ دینا اب میں یہاں انتظار کروں گا، شاہِ مصر کی منتیں سماجتیں کروں گا۔ شاید اللہ اس کے دل میں رحم ڈال دے اور بنیامین کو چھوڑ دے تو میں اس کے ساتھ چلا آؤں گا۔ یا ممکن ہے میری اس حالت پر باپ کو ترس آ جائے کہ کس طرح بیٹا پردیس میں بیٹھا ہے چنانچہ وہ خود مجھے بلا لے۔ یا ممکن ہے اللہ ہی کوئی فیصلہ فرما دے۔ ہماری حالت و کیفیت اور ہماری اس معاملے میں حسن نیت سے اللہ تو خوب آگاہ ہے۔ وہ حالات میں کشادگی پیدا فرما دے گا کہ وہ سب فیصلہ سازوں میں بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔

چنانچہ اس طرح یہودا نے اپنے بھائیوں کو گھر جانے اور خود ارضِ مصر میں بنیامین کی خلاصی کے لیے چارہ جوئی یا خدائی حکم کا انتظار کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

❀❀❀

نامکمل قافلے کی روانگی

ارْجِعُوا إِلَى أَبِيكُمْ فَقُولُوا يَا أَبَانَا إِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ وَمَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حَافِظِينَ ﴿٨١﴾ وَاسْأَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا وَإِنَّا لَصَادِقُونَ ﴿٨٢﴾

''اپنے باپ کی طرف واپس جاؤ، پس کہو اے ہمارے باپ! بے شک تیرے بیٹے نے چوری کر لی اور ہم نے شہادت نہیں دی مگر اس کے مطابق جو ہم نے جانا اور ہم غیب کی حفاظت کرنے والے نہ تھے۔ اور اس بستی سے پوچھ لے جس میں ہم تھے اور اس قافلے سے بھی جس میں ہم آئے ہیں اور بلاشبہ ہم یقیناً سچے ہیں۔''

سب سے بڑے بھائی، مفسرین نے بتایا، روبیل تھے مگر فہم و فراست اور عقل و دانش میں یہودا سب سے فائق تھے، ان کا بیان جاری ہے۔ وہ خود کو مصر میں رکھنے کا فیصلہ سنا چکے ہیں اب بھائیوں کو کہتے ہیں کہ تم لوگ کنعان پلٹ جاؤ، سارا واقعہ باپ کے گوش گزار کر دو

اور بتا دو کہ آپ کے بیٹے نے چوری کر لی ہے۔ یہ سارا واقعہ انھیں بتا دو لیکن وہ یقین نہیں کریں گے، اس لیے کہ ہمارے دامن پر یوسف کے معاملے میں جو داغ لگ چکا ہے۔ باپ کے ذہن سے تو وہ بات ہی نہیں جاتی تاہم تم لوگ خوب وضاحت وصراحت سے معاملہ بتا دینا۔ کہہ دینا کہ ہمیں کیا پتا تھا کہ بنیامین وہاں جا کے اس احسان کرنے والے بادشاہ کے ساتھ یہ گل کھلائے گا۔ غیب کا علم تو ظاہر ہے ہمیں حاصل نہیں اب کیا جانتے تھے کہ بنیامین یہ کرے گا، وگرنہ اسے لیکر ہی کیوں جاتے۔ پھر اگر یہ جانتے تو بنیامین کی حفاظت و ذمہ داری کی قسمیں ہی کیوں اٹھاتے؟ یہ سب باتیں تب غیب تھیں جسے ہم نہ جانتے تھے۔ مگر جو ہمارے سامنے پیش آیا، وہ یہ ہے کہ پیالہ بنیامین کے سامان سے نکلا، اسے روک لیا گیا، ہم نے منت سماجت جتنی کر سکتے تھے کی، مگر وہ بے سود رہی...... ہم بالکل سچے ہیں اور عین حقیقت بیان کر رہے ہیں اگر آپ کو ہم پر یقین کرنے میں تامل ہو تو آپ مصر تشریف لے جا کر اہل مصر سے تحقیق کر سکتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں کہ ہم جو کہہ رہے وہ سچ ہے کہ نہیں؟ یا اگر مصر نہیں جانا چاہتے تو اس قافلہ والوں سے دریافت کر لیجیے جو کنعان سے ہمارے ساتھ گیا تھا۔ اب وہ غیر جانبدار لوگ تو جھوٹ بولنے سے رہے۔ آپ جتنی چاہیں تحقیق کر لیں جس سے چاہے پوچھ لیں بالآخر نتیجہ یہی نکلے گا کہ ہم نے جو کہا وہ درست ہے اور جو حالات ہم نے بیان کیے وہ عین مبنی بر حقیقت ہیں۔

❀❀❀

الم رسیدہ باپ کو اک اور صدمہ

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا ۖ فَصَبْرٌ جَمِيلٌ ۖ عَسَى اللَّهُ أَن يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ﴿٨٣﴾

''اس نے کہا بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک کام مزین کر دیا ہے، سو (میرا کام) اچھا صبر ہے، امید ہے کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے گا،

یقیناً وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔‘‘

یہودا وہیں رہ گیا، باقی تمام بھائی کنعان واپس آ گئے۔ انھوں نے باپ کو یہ قصہ سنایا، باپ کہ جس کے دل پہ پہلے ہی یوسف کی جدائی کے داغ تازہ تھے، اب دوسرے محبوب بیٹے کا داغ نمایاں ہو گیا۔ کون جانتا ہے کہ کس دل سے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یوسف کے بعد اب بنیامین کی جدائی کے چرکے کو سہا ہو گا۔ قربان جائیے سوہنے مولا پر بھی کہ وہ اپنے پیاروں کی کیا آزمائشیں کرتا ہے۔ جگر چیر دینے والی اور ہڈیاں سے گودا الگ کر دینے والی آزمائشیں۔ مگر آفرین ہے رب کے ان بندوں پر کہ جو ہر وار سہتے اور ہر آزمائش کو دل پہ جھیلتے ہیں، مگر جن کے یاقوتی ہونٹوں پر ہمیشہ صبر و رضا کے موتی ہی دمکتے ہیں۔ جن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ذخیرہ تو خشک ہو جاتا ہے مگر لب کبھی شکوہ سے آلودہ نہیں ہوتے۔

چنانچہ یہ خبر بھی سیدنا یعقوب علیہ السلام نے نہایت صبر سے سہہ لی مگر بیٹوں کے بیان کردہ حالات کو ماننے سے یکسر انکار کر دیا۔ دراصل یہ لوگ پہلے ہی مشکوک تھے۔ اس لیے اگر باپ کے اندیشے حقیقت کا روپ دھار رہے تھے تو ان کے یقین نہ کرنے کی معقولیت ظاہر ہوتی ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو صاف صاف فرما دیا کہ تمھاری بیان کردہ داستان کی حقیقت ہے تو صرف اتنی کہ:

«قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا» : بلکہ تمھارے لیے تمھارے دلوں نے ایک کام مزین کر دیا ہے۔ اب میں اس پر صبر جمیل اختیار کرتا ہوں اور اگر تم میرے بڑھاپے اور بزرگی پر رحم نہیں کھاتے تو کیا دکھ، اللہ تو میرا حامی و ناصر موجود ہے۔ جو داستانیں تم نے سنائیں اور جو کچھ تم نے بیان کیا اس سب پر میرا اللہ ہی میرا معین و مددگار ہے۔ وہی میرا مونس و غمخوار ہے۔

یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ہر پھیرے میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کا کوئی نہ کوئی لختِ جگر جدا کر دیا اور انھیں جدائی کی ہڈیاں چٹخا دینے والی آگ میں سلگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب وہ مہربان و مشفق اور ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندے کو محبوب رکھنے والے رب سے ہی

امید باندھ رہے تھے کہ وہی ان کی شامِ غم کو صبحِ درخشاں سے بدل دے گا۔ وہی ان کی پیرانہ سالی، ضعف اور شدت غم وحزن پر ترس کھائے گا اور کہہ رہے تھے کہ کیا عجب اب اللہ تعالیٰ یوسف سمیت سب کو بوڑھے غمزدہ باپ سے ملا ہی دے، بے شک وہ علم والا بھی ہے اور حکمت والا بھی۔

آیت میں 'صبر جمیل' کے لفظ ہیں۔ صبر جمیل وہ ہوتا ہے جس میں جزع فزع نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

《 اَلصَّبْرُ ضِیَاءٌ 》 [مسلم، کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء : ۲۲۳]

''صبر روشنی ہے۔''

صبر یہ ہے کہ بندہ رب کے حضور التجائیں اور دعائیں جاری رکھے۔ دل کے آنگن میں امید کے دیے جلائے رکھے اور صفحہ ذہن پر کبھی مایوسی کے بادلوں کو نہ امنڈنے دے۔ جب بندے کی یہ کیفیت ہوتی ہے تو رب اس کے لیے تمام دروازے کھول دیتا ہے، خیر اور فلاح کے دروازے صابر بندے پر ہر آن کشادہ رہتے ہیں۔ خیر کے دروازے صرف اسی شخص کے لیے بند ہوتے ہیں جو مایوس ہو جاتا ہے۔ جو صبر نہیں کر سکتا۔

یہاں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی امید، آرزو اور اپنے سوہنے رب سے حسنِ ظن کی کیفیت ملاحظہ کیجیے کہ غم کی برستی بارش میں پورا جسم بھیگ چکا ہے اور حزن کے بادل کی یہ ایک بوچھاڑ ہے جو بنیامین کی جدائی صورت دل و جاں دہلا رہی ہے مگر جیسے جیسے حالات سخت سے سخت اور کٹھن سے کٹھن ہوتے جا رہے ہیں ویسے ویسے امید اور آرزو بھی زور آور ہوتی جا رہی ہے۔ ادھر خبر ہے کہ بنیامین بھی گیا اور ادھر امید کہتی ہے:

《عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا》 ''امید ہے کہ اللہ رب العزت سبھی کو جمع کر کے لائے گا۔'' اس لیے کہ وہ علیم ہے، اپنے بندے کے تلخ حالات اور مجروح جذبات کو بہت دیکھتا اور بہت جانتا ہے۔ وہ حکیم ہے حکمت و دانائی سے حالات بدل دیتا ہے۔ جب

وہ روشنی کی کوکھ سے اندھیرا اور تاریکی کے پہلو سے روشنی لے آتا ہے تو عین ممکن ہے اب ابتلا کا یہ دور تمام ہو اور برسوں کے بچھڑے پھر اک دوسرے سے آن ملیں۔

❀❀❀

جب بینائی آنسوؤں میں بہہ گئی

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰۤاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۸۴﴾

''اور وہ ان سے واپس پھرا اور اس نے کہا ہائے میرا غم یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں، پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔''

یوسف کے بعد اب بنیامین کی گرفتاری کی خبر ایسی تھی کہ اس نے یوسف کے دردِ جدائی کو بھی تازہ کر دیا۔ بوڑھے باپ کے الم رسیدہ اعصاب پر یہ خبر گویا برق بن کے برسی اور وہ غم سے نڈھال ہو گئے۔ یہاں تک کہ رخ موڑا اور بیٹوں سے الگ جا بیٹھے اور اس لمحۂ غم میں انھیں یوسفِ گم گشتہ بے طرح یاد آیا۔ مفسرین نے یہاں ایک سوال اٹھایا ہے کہ گم تو بنیامین ہوئے ہیں اور یاد یوسف کو کیوں کیا جانے لگا ہے؟ دراصل ایسا ہوتا ہے کہ بعض غم روح میں بہت گہرائی تک اترے ہوتے ہیں۔ دکھتی ہوئی جگہ یا اس پھوڑے کی طرح کہ ایک ذرا سے چھونے سے ہی جس کا درد جاگ اٹھتا ہے اور پھر پیمانۂ غم چھلکنے لگتا ہے۔ کسی اپنے بہت عزیز اور نہایت پیارے کی جدائی دل میں بسی ہو تو پھر کسی اجنبی کے جنازے پر بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ یہ آنسو اجنبی پر نہیں بلکہ اپنے عزیز پر بہہ رہے ہوتے ہیں۔ تو آج بنیامین کے غم نے یوسف کے خوابیدہ درد کو جگا دیا تو اس میں تعجب، سوال یا اعتراض ہی کیا؟ یہ تو ایک فطری بات ہے، چنانچہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے الگ ہو کے یوسف کو یاد کرنا شروع کر دیا اور غم یوسف کوئی معمولی غم تو نہ تھا۔ اسے تو صرف سیدنا یعقوب علیہ السلام ہی جان سکتے ہیں، جنھوں نے بوڑھی جان پہ جوان بیٹے کی جگر پاش جدائی کے کانٹے اک مدت تک

جھیلے ہیں۔ جنھوں نے شام وسحر اور لیل ونہار فراقِ یوسف میں آنسو بہائے ہیں۔
'گریۂ یعقوب' کسی تن آسان اور بے صبرے کے بس کی بات نہیں۔ جب آنکھوں سے بینائی بہہ نکلے اور جب آنکھ سے سیاہی ہی ڈھل جائے تو تب جا کے یہ گریۂ یعقوب کہلاتا ہے۔ گریۂ یعقوب شعروں میں تو اوروں سے بھی ممکن ہے مگر عملاً یہ یعقوب ہی کا خاصہ تھا۔ اک جلیل القدر اور وسیع الظرف پیغمبر کا صبر آزما دورِ صعوبت اور روح شکن عہد ابتلا کا بیان کہ جسے قرآن مجید نے بیان کیا اور صرف دو لفظوں میں! صرف دو لفظ، مگر جن کی تشریح میں کتابیں تصنیف کی جائیں تو کم پڑیں۔ فرمایا:

«وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ» ''اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں۔''

یہ یعقوب علیہ السلام ہیں، رفیع الشان پیغمبر، رب کے محبوب بندے اور نبی ابن نبی۔ پیغمبر کے بیٹے پیغمبر کے باپ اور دیکھیے کہ ان پر غم وہ ٹوٹے ہیں کہ زمین کا سینہ شق کر دیں۔ یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے وہ جو رب سے محبت کا دعویٰ اور اس کا بندہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اولاً رب انھیں آزماتا ہے اور پھر نوازتا ہے۔ جس کا جتنا ظرف ہے اتنی ہی بڑی آزمائش ہوتی ہے اور پھر اتنی ہی بڑی نوازش بھی آتی ہے۔ رب سے محبت کے اعلان کے بعد اس کی عنایت کی برکھا برستی ضرور ہے مگر اس کی راہ کچھ اذیت سے ہو کے گزرتی ہے۔ اک ذرا لمحۂ آزمائش آتا ہے اور اک کسوٹی پر ذرا دیر کے لیے یہ محبت پرکھی جاتی ہے۔ جو خام ہوں وہ کباڑ خانے میں جاتے ہیں مگر جو یہاں کی تپش برداشت کر کے سرخرو ہو جائیں پھر وہ کندن بن جاتے ہیں۔ یہ ایک اصول بھی ہے اور رب سے محبت کی ایک پرکھ اور پہچان بھی۔ دراصل یہ جنت کی راہ ہے۔ جنت، جو بڑی بیش قیمت ہے اور اس کی بے شمار راہیں ہیں مگر ساری کانٹوں سے اٹی پڑی ہیں۔ چنانچہ اس کے حصول میں جو جتنا مخلص ہے، رب کی محبت و عنایت کا جو جتنا دعویدار ہے اس کے لیے راہ اتنی ہی دشوار ہے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَشَدُّ الْبَلَاءِ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ فَاِذَا كَانَ الرَّجُلُ صَلْبَ الدِّيْنِ يُبْتَلِى الرَّجُلُ عَلٰى قَدْرِ دِيْنِهٖ فَمَنْ ثَخُنَ دِيْنُهٗ ثَخُنَ بَلَاؤُهٗ وَمَنْ

ضَعُفَ دِیْنُهٗ ضَعُفَ بَلَاؤُهٗ﴾ [مستدرك حاكم : ۱/ ۴۱، ح : ۱۲۰]

''سخت ترین آزمائش انبیاء کی ہوتی ہے پھر ان علماء کی جو عمل میں ان جیسے ہوتے ہیں اور پھر ان لوگوں کی جو ان علماء جیسے ہوتے ہیں۔ جب آدمی دین میں راسخ ہو تو اس کی آزمائش بھی اتنی ہی سخت ہوتی، آدمی کی آزمائش اس کے دین کے بقدر ہی ہوتی ہے، اور جو آدمی دین میں مضبوط ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی ہی کٹھن ہوتی ہے۔ اگر دین میں کمی ہو تو آزمائش میں بھی کمی ہوتی ہے۔''

بات بڑھانا مقصود نہیں، یہ بتانا مطلوب ہے کہ اگر ہم ان انبیاء کے پیروکار ہونے کے دعویدار ہیں، اگر جنت کے طلبگار اور رحمت و محبت الٰہی کے امیدوار ہیں تو پھر اپنے حصے کے رنج و الم اور محنت و مشقت سے فرار نہ تو دانائی ہے اور نہ مردانگی۔ بڑی فراخ حوصلگی سے اسے جھیلنا چاہیے۔ ہم بھی کیا عجب ہیں! ذوق جنت کا رکھتے ہیں اور بے عملی بھی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ زندگی اہل دنیا کی سی بسر کرنا چاہتے ہیں اور انجام اہل ایمان کا سا مانگتے ہیں، ہاتھ کائنات کی سب سے قیمتی چیز پر رکھتے ہیں اور روپیہ ایک بھی خرچ کرنا نہیں چاہتے۔ نہیں، نہ یہ سودے سستے ہیں اور نہ یہ راہیں اتنی سہل ہیں۔ یہاں نہ جعل سازی چلتی ہے اور نہ تن آسانی۔ یہاں بھٹی سے گزرنا پڑتا ہے اور محبت کا عمل سے ثبوت دینا ہوتا ہے۔ رسولِ رحمت ﷺ نے خبر دی ہے:

﴿ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ ﴾

''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ تعالیٰ کا سودا یعنی جنت بہت بیش قیمت ہے۔''

اور رب کا قرآن کہتا ہے:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾ [البقرة : ۲۱۴]

''کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ان جیسی

حالت نہیں آئی جو تم سے پہلے تھے، انھیں تنگ دستی اور تکلیف پہنچی اور یہاں تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے کہہ اٹھے اللہ کی مدد کب ہو گی؟ سن لو بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔''

ایک پیغمبر سے بڑھ کر ان حقائق کو کون جانے گا، چنانچہ سیدنا یعقوب علیہ السلام رب کی رضا کے لیے اپنے عمل سے اور اپنے صبر سے ایمان کے ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ وہ اس محبت اور نعمت جنت کی قدر و قیمت سے آگاہ ہیں، سو اس کے دامن میں اپنے عمل کے موتی پیش کر رہے ہیں۔ رب کے بہت محبوب ہیں، چنانچہ غم بھی وہ اترا ہے کہ دل سے چین، ذہن سے راحت اور آنکھوں سے بینائی چھین لینے والا ہے مگر صبر بھی اس انتہا کا ہے کہ قرآن اس کا بھی ساتھ ذکر فرماتا ہے:

«فَهُوَ كَظِيمٌ»: یہ بھی کیا لفظ ہیں کہ جو قرآن مجید نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی تصویر کشی میں استعمال کیے ہیں۔ جہاں یہ الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی رفعتِ شان، علو مرتبت اور صبر کی کیفیت بیان کی، وہاں بہت سوں کے منہ بند کر دیے۔

غم بڑے پیہم اور موسلا دھار برسے تھے، مگر وہ سب سہہ گئے، بے انتہا پیاروں کی جدائیاں بڑی جگر پاش تھیں، مگر سیدنا یعقوب علیہ السلام بھی کظیم تھے سو جان پر سب جھیل گئے۔ آنکھ میں آنسو نہ رہے، جسم میں جان نہ رہی اور کمر بارِ غم سے دہری ہو گئی، مگر وہ سب برداشت کر گئے۔

❀❀❀

دلِ مضطرب کے الم و حزن

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ
قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾

''انھوں نے کہا اللہ کی قسم! تو ہمیشہ یوسف کو یاد کرتا رہے گا، یہاں تک کہ گھل کر

مرنے کے قریب ہوجائے، یا ہلاک ہونے والوں سے ہوجائے۔اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہوجانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

جب اولاد نے سیدنا یعقوب علیہ السلام پر غم یوسف کی یہ شدتیں اور کیفیتیں طاری دیکھیں تو گویا باپ کو سمجھانے بجھانے لگے کہ ابا جان! آپ یہ ہر وقت یوسف کو کیوں یاد کرتے رہتے ہیں۔جب دیکھو اس کے غم میں آہیں بھرتے رہتے ہیں اور جب دیکھو انھیں یاد کرنے بیٹھے جاتے ہیں۔رو رو کے آنکھیں بھی گنوالی ہیں،شاداب کمر دہری ہوگئی ہے مگر اب بھی یوسف کو یاد کرتے رہتے ہیں۔اتنا عرصہ بیت گیا ہے اب تو آپ کو یوسف کو فراموش کر دینا چاہیے۔ہمیں تو خدشہ ہے کہ آپ اسی غم میں گھل گھل کر اپنی جان ہی گنوا بیٹھیں گے۔سو ابا جان! اب اس تذکرۂ یوسف سے جان چھڑائیے اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنی اس گرتی ہوئی صحت ہی کا خیال کیجیے اور اب اس گھر کو غم کدہ بنانے اور اپنی جان گھلانے کا سلسلہ موقوف فرما دیجیے۔اس پر سیدنا یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

«قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ»

''اس نے کہا میں تو اپنی ظاہر ہوجانے والی بے قراری اور اپنے غم کی شکایت صرف اللہ کی جناب میں کرتا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''

میں یہ غم والم کسی اور سے تو نہیں کہتا، نہ اس شکوہ و شکایت کے دفتر تمھارے سامنے کھولتا ہوں۔مخلوق سے مجھے اس سلسلے میں کیا تعلق، میں تو جو دل پہ گزرتی ہے وہ اپنے رب سے کہتا ہوں۔میں نے تو اپنے رب کے ہاں دعا کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔اپنے سارے دکھ درد، تمام گلے شکوے، سارے حرف شکایت اپنے رب ہی سے کہتا ہوں میں نے اپنی امید اور آرزو کا محور و مرکز اسی ذات بے مثال کو بنایا ہے۔اسی پر اعتماد ہے،اسی پر بھروسا اور

اسی پر توکل اور میں اپنے رب کی طرف سے وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، میرے پاس علم وحی کا مستقل اور قابل اعتماد ذریعہ ہے۔ اور اس سلسلے میں ایک قطعی علم مجھے حاصل ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یوسف کا خواب سچا ہے اور ابھی وہ پورا سو وہ جانتے تھے کہ ابھی وہ وقت آنا ہے جب بھائیوں نے یوسف کے حضور سرنگوں ہو کے کھڑا ہونا ہے۔ یہ سب انھیں معلوم تھا مگر یہ نہ جانتے تھے کہ یوسف ہے کہاں؟ اسی لیے انھوں نے فرما دیا کہ ﴿وَأَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنے رب کی وسعتِ رحمت اور کرم و شفقت کے متعلق جتنا میں جانتا ہوں، تمھیں اسی کی اتنی خبر نہیں، میرا یہ رونا اور رب کے حضور گڑ گڑانا بے کار اور بے اثر نہیں، رب کے ہاں میری دعائیں ضرور ثمر بار ہوں گی۔

دیکھیے ایک پیغمبر کا حوصلہ، اس کی امید و استقامت اور مداومت عمل کہ یوسف کو بچھڑے ہوئے اک عرصہ بیت گیا ہے مگر سیدنا یعقوب علیہ السلام یہ سلسلۂ دعا قائم کیے ہوئے۔ ابھی تک شنوائی نہیں ہوئی مگر نہ یعقوب علیہ السلام اس سلسلے میں اکتائے ہیں اور نہ اس عمل میں کوئی کوتاہی آئی ہے۔ مسلسل اور متواتر رب کے حضور داد و فریاد اور دعا و التجا کا سلسلہ جاری ہے، اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کہ ملامت کرنے والوں کی ملامت کی بھی چنداں فکر نہیں، بیٹے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو صاف کہہ دیا جاتا ہے رب سے مانگتا ہوں تمھیں اس سے کیا مطلب؟ یہی وہ امید ہے جسے اللہ کبھی خائب نہیں کرتا اور یہی وہ حسن ظن ہے جو بندے کا رب کے ساتھ ہونا چاہیے اور ان اسباق کو ہمیں بھی اپنی زندگیوں میں مشعل راہ بنانا چاہیے۔

① اپنی زندگی میں وتیرہ بنا لیں کہ دعا اور مناجات کا سلسلہ صرف رب ہی سے جوڑا جائے۔

② دعا سے کبھی اکتاہٹ نہ اختیار کی جائے۔ رب کو پکارا جائے اور مسلسل پکارا جائے اور ہمیشہ استقامت اور مداومت کے ساتھ، مکمل یقین اور اعتماد کے ساتھ۔ بے یقینی رب کے ہاں اگر روا رکھی جائے تو زہر قاتل ہے۔ بے یقین لوگ رب سے کیا لیں گے؟ اور پھر رب پر یقین بھلا کیوں نہ کیا جائے؟ اس کی قدرتِ عطا پر شک ہے یا اس کی

وسعت رحمت پر اعتماد نہیں؟ اور اگر یقین ہی نہیں تو دست سوال دراز کرنے اور ہاتھ پھیلانے کا مقصد ہی کیا۔ رب تو دیتا ہے اس میں کچھ شک نہیں مگر تم مانگ مانگ کے اپنے آپ کو رب کے ہاں ''مانگنے والا'' تو ثابت کرو۔ دعائیں کبھی ضائع نہیں ہوتیں۔ کبھی ذخیرہ ہو جاتی ہیں، مومن دعا سے کبھی نہیں اکتاتا اور مایوس ہو کر کبھی نہیں چھوڑتا۔

❀❀❀

نومیدی زوالِ علم و عرفان ہے

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اس کے بھائی کا سراغ لگاؤ اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں۔''

بیٹے باپ کو تذکرۂ یوسف سے باز رہنے کی نصیحت کرتے ہیں مگر سیدنا یعقوب علیہ السلام انھیں تلاش یوسف میں نکل کھڑے ہونے کا حکم صادر فرماتے ہیں۔ دراصل یہ ایک ایمان دار شخص کا عمل ہے کہ ایک تو اس کی امید حالات کے جبر کے آگے کبھی سرنگوں نہیں ہوتی، دوسرے وہ ہمیشہ حرکت و عمل پہ اعتقاد رکھتا ہے۔ چنانچہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو حکم دیا کہ بیٹو! اس طرح کی باتیں مت کرو جن سے مایوسی ٹپکتی ہو۔ بلکہ تم وہ کام کرو جو تمھارے کرنے کا ہے۔ امید کی شمع دل میں روشن کرو اور ان دونوں کی تلاش میں لگ جاؤ، اللہ نے چاہا تو وہ سب کو اکٹھے فرما دے گا۔ اللہ کو بس تمھاری کوشش مطلوب ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تمام تر امور پر قادر ہے مگر اسے انسان سے جستجو اور عمل مطلوب ہے۔

انسان جب کوشش کرتا ہے اور خلوصِ نیت سے ریاضت بروئے کار لاتا ہے تو اللہ رب العزت انسان کی محنت کو رائگاں نہیں جانے دیتا۔ عربی مقولہ ہے:

((مَنْ جَدَّ وَجَدَ)) ''جس نے کوشش کی اس نے مطلوب کو پا لیا۔''

تو یعقوب علیہ السلام بیٹوں کو یہی حرکت وعمل اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آج ہی یہ حکم کیوں دیا گیا، آج سے پہلے اس طرح تلاش میں نکلنے کا کیوں نہ کہا۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے اب خلیج جدائی کو پاٹنا تھا اس لیے ویسی ہی تدبیریں بھی سجھا دیں اور ویسے حالات بھی پیدا فرما دیئے۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے بندے سے جو کام لینا ہوتا ہے۔ وہ اسے اس کے حسب حال صلاحیتیں بھی دے دیتا ہے اور جو واقعہ رونما کرنا ہو اس کے موافق حالات بھی پیدا فرما دیتا ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یہاں امید کو مومن کا کردار اور مایوسی کو کافر کا شعار قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ سیدنا ابراہیم نے بھی اسی مفہوم کے لفظ کہے:

﴿ قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴾ [الحجر : ٥٦]

''انھوں نے کہا کہ گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے کون نا امید ہوتا ہے؟''

یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید اور حسن ظن ایمان کا حصہ ہے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

((اِنَّ الْمُؤْمِنَ مِنَ اللّٰهِ عَلٰى خَيْرٍ يَرْجُوْهُ فِي الْبَلَاءِ وَ يَحْمَدُهٗ فِي الرَّخَاءِ))

''مومن رب کی طرف سے ہمیشہ بھلائی میں رہتا ہے۔ مصیبت میں مبتلا ہو تو رب سے امید رکھتا ہے، فراخی اور کشادگی میں ہو تو اس کی حمد وثنا کرتا ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بھی اس مضمون کا ہے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((عَجَبًا لِّأَمْرِ الْمُؤْمِنِ ! اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ لَهٗ خَيْرٌ، وَ لَيْسَ ذٰلِكَ لِاَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ ، اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ، وَ اِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَّهٗ)) [مسلم، كتاب الزهد، باب المؤمن امره كله خير : ٢٩٩٩]

''مومن کا معاملہ بھی عجیب ہے، اس کے ہر کام میں خیر ہے اور یہ معاملہ صرف

مومن کے لیے ہے اگر اسے خوشی حاصل ہوتی ہے تو شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہوتا ہے اور اگر اسے تکلیف پہنچتی ہے تو صبر کرتا ہے اور اس میں اس کے لیے خیر ہوتی ہے۔‘‘

یہ ساری آیات و احادیث ہمیں اسی بات پر ابھارتی ہیں کہ ہمیں ہر حال میں رب پر امید ہونی چاہیے، اس سے ناامیدی اور مایوسی کی صورت دل میں نہیں لانی چاہیے۔ مایوسی کو جو کفر کہا گیا تو اس لیے کہ اس سے رب کی قدرت اور رحمت کی نفی کا تصور ابھرتا ہے۔ جب ساری کائنات اللہ ہی کے دائرۂ اختیار میں ہے اور وہ بندے سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اس کا مفاد چاہتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ناامیدی رکھی جائے۔

❀❀❀

غربت و عسرت کی فریاد

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَأَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَأَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ ﴿٨٨﴾

’’پھر جب وہ اس کے پاس داخل ہوئے تو انھوں نے کہا اے عزیز! ہمیں اور ہمارے گھر والوں کو تکلیف پہنچی ہے اور ہم حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں، سو ہمارے لیے ماپ پورا دے دے اور ہم پر صدقہ کر۔ یقیناً اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔‘‘

باپ کے حکم پر بیٹے یوسف اور بنیامین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اپنے ہاتھوں یوسف کو جلا وطن کرنے والے آج اسی کی تلاش میں نکلے ہوئے نظر آتے ہیں اور اب جب اللہ کو انھیں ملانا مقصود ہے تو اس نے ان کا رخ بھی مصر ہی کی جانب موڑ دیا۔ شاید ان لوگوں کے ذہن میں یہ ہو کہ پہلے بنیامین کے لیے چارہ جوئی کی جائے۔ ظاہر ہے وہ تو مصر ہی میں تھے سو اس کے لیے انھیں سب سے پہلے مصر ہی جانا

چاہیے تھا۔

مصر پہنچ کر پہلے بادشاہ کے حضور اپنی خستہ حالی کا پُر درد منظر پیش کیا تا کہ بادشاہ کی ہمدردی حاصل ہو جائے تو پھر باپ کی اندوہناک صورتحال بیان کر کے بھائی بنیامین کی خلاصی کی استدعا کریں۔ چنانچہ کہہ رہے ہیں کہ جناب ہم تو وہ ہیں کہ سخت مصیبت زدہ ہیں۔ اذیت و تکلیف نے گویا ہمارے گھر کی راہ دیکھ لی اور قحط نے ہماری اقتصادیات کا گلہ گھونٹ دیا۔ سو ہم مصیبت کے مارے اور فلاکت زدہ لوگ اب چند ناقص سکے لائے ہیں۔ مگر ہمارے پاس کچھ اور تھا ہی نہیں، جو میسر تھا لا کے آپ کے سامنے ڈال دیا مگر آپ ان کے نقص یا مارکیٹ ویلیو کو نہ دیکھیں ہماری مظلومانہ حالت کو دیکھیں اور ہمیں پورا پیمانہ بھر کے عنایت فرما دیں، بلکہ اسی پر اکتفا نہ کریں کہ آپ مصر کے بادشاہ ہیں اور ہم مظلومِ وقت سو ہمیں مزید سے بھی نواز دیجیے۔

آیت میں ان کی لائی ہوئی رقم کے متعلق قرآنِ مجید نے « بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ » کے لفظ استعمال کیے ہیں۔ بضاعہ کا مطلب ہے پونجی، یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے۔ بضاعت اور بے بضاعتی وغیرہ اس کے اردو استعمالات دیکھے جا سکتے ہیں «مُّزْجٰىةٍ» کے لغوی معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے لوٹانا، قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُزْجِيْ سَحَابًا ﴾ [النور : ٤٣]

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بے شک اللہ بادل کو چلاتا ہے۔''

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ درہم ایسے تھے جو منڈی میں بطور غلے کی قیمت کے قبول نہ کیے جاتے تھے۔ بعض مفسرین نے بیان کیا کہ درہم نہیں یہ گھر کا کوئی دیگر سامان تھا مثلاً: پنیر، رسی یا اون وغیرہ، بہرحال کچھ ایسی ہی چیز تھی جس سے غلہ کا حصول ناممکن تھا، یہ منظر برادرانِ یوسف کی انتہائی بے کسی اور درد بھری حالت کا عکاس تھا۔

آیت کے الفاظ «وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا» کا معنی ہے کہ ہم پر صدقہ کیجیے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اولادِ انبیاء پر صدقہ جائز تھا؟

سفیان بن عیینہ نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے قبل دیگر انبیاء پر صدقہ جائز تھا مگر دیگر مفسرین نے اس سے انکار کیا ہے کیونکہ صدقہ کو اموال کی میل کچیل کہا گیا ہے اور کسی پیغمبر یا اولادِ پیغمبر کے شایانِ شان نہیں کہ وہ اسے قبول کر کے عندالناس اپنے آپ کو حقیر کریں۔ چنانچہ معنی یہ ہوا کہ یہ ردی اور ناقص پونجی قبول فرمایئے اور ہمیں پورا پورا غلہ دے کر ہم پر صدقہ کیجیے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے اسی عمل کو صدقہ قرار دیا تھا نا کہ الگ سے صدقے کا مطالبہ کیا۔

❀❀❀

کیا بھول گئے، کل کیا کرتے تھے؟

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ﴿٨٩﴾

”اس نے کہا کیا تم نے جانا کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا، جب تم نادان تھے؟“

مفسرین نے صراحت کی ہے کہ جب بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کے سامنے گھر کا یہ دردناک منظر رکھا تو سیدنا یوسف علیہ السلام کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور یہ فطری بات تھی۔ جس گھر کے فرد کی آج مصر پر حکمرانی ہے جب وہ تقدیر کے یہ کھیل دیکھتا ہے کہ اس کے بھائی یوں التجا اور آہ و زاری سے کھڑے گھر کی چیزیں قبول کر لینے اور غلہ عنایت کر دینے کی باتیں کرتے ہیں تو کون ہوگا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکیں؟ سو سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل پہ رقت طاری ہونا اور آنکھوں سے اشکوں کا رواں ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ بہرحال اس جذباتی کیفیت سے سیدنا یوسف علیہ السلام نے انھیں ماضی یاد دلایا کہ آج تم کس طرح مظلومیت کا رونا روتے ہو اور کس طرح درد کی تصویر بنے کھڑے ہو، کچھ یاد ہے کل تم کیا کرتے رہے ہو۔ تم نے یوسف پر کیا ستم کے پہاڑ توڑے اور اس کے بھائی پر ظلم کے کون کون سے طریقے ہیں جو روا نہ رکھے؟

سبحان اللہ ! سیدنا یوسف علیہ السلام کا ظرف ملاحظہ فرمایئے کہ گو بھائیوں کو جتا دیا کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ جو سلوک کیا اسے یاد کرو، مگر ساتھ ہی ان کے دکھے دل کو مزید زخمی نہیں کیا، ان کی معذرت و معافی اور شرمندگی و شرمساری سے پہلے ہی گویا انھیں معافی کی تسلی دے دی کہ «اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ» یعنی یہ تم نے اس وقت کیا جب تم نادان تھے۔

یہ ہے عزیمت کے حامل افراد کا ظرف اور یہ ہے حرمت الفاظ کے قائل لوگوں کا وتیرہ، کیا سادہ، بے ضرر اور نرم الفاظ ہیں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے ظالم بھائیوں کے لیے استعمال فرمائے، وہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے: «اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ» ''جب تم ظالم تھے'' مگر نہیں کہا۔ کہا تو یہ کہ تم بڑے نادان تھے۔ نبوت کی زبان کی یہی شان ہے اور نبوت کی زبان کا ہمیشہ یہی انداز ہوتا ہے۔ اس سے لوگوں کے لیے راحتیں اور آسانیاں ہی پھوٹتی ہیں اور اس سے لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ پھوار ہی برستی ہے۔

اصل میں یہ ہماری تربیت ہے۔ ہمیں الفاظ کی حرمت اور رویے سکھائے جا رہے ہیں ہمارے اخلاقی ضابطے طے کیے جا رہے ہیں اور بتایا جا رہا ہے کہ ایک داعی کس طرح اپنے منفرد اور ہمدردانہ رویے کو بروئے کار لاتے ہوئے ظالموں کے بھی دل موہ لیتا ہے۔ کس طرح وہ زندگی کے ہر لمحے میں ساری کائنات سے الگ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ظلم سہہ رہا ہو تو صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا اور جب اقتدار و اختیار کا مالک ہو تو انتقام نہیں لیتا، انتقام تو رہا ایک طرف اس کے تو گوشۂ ہائے لب سے اپنے ظالم بھائیوں کے لیے بھی نوک دار لفظ نہیں نکلتے۔ دراصل قوت و اختیار رکھنے کے باوجود معاف کر دینا ہی اصل وسعتِ ظرف اور اخلاق کریمانہ کی علامت ہے۔

یہ اصلاح اور تربیت کے انداز ہیں، جہاں قدم قدم نرمی اور جہاں لمحہ لمحہ محبت کی فراوانی ہونی چاہیے، ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ اتنا غالب ہو کہ انتقام اور نفرت کے سارے جذبے اس کے سامنے کمزور اور بے بس ہو جائیں۔ نرمی ہی دعوت کا زیور ہے، فرعون سے

بڑا ظالم کون تھا؟ وہ کہ جو رہتی دنیا تک ظلم کا استعارہ بن گیا ہے۔ مگر دیکھیے جب رب کریم اس ظالم فرعون کی طرف سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دعوتِ توحید کے لیے روانہ کرتے ہیں تو کیا نصیحت فرماتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾

[طٰہٰ : ۴۳، ۴۴]

''دونوں فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکشی میں بہت دور نکل چکا ہے پھر اس سے نرمی کے ساتھ بات کرو شاید وہ (بہ رغبت) نصیحت قبول کر لے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے۔''

معلوم ہوا نرم روی اور شستہ لہجہ دعوت کے میدان میں ایسا طریقہ ہے جو پتھر دل اور سخت طبیعت انسان کو بھی پگھلا کر مسحور کر دیتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ وَ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهِ))

[بخاری، کتاب استتابۃ المرتدین ، باب اذا عرض الذمی ...... الخ : ۶۹۲۷]

''بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہے اور تمام معاملات میں نرمی چاہتا ہے۔''

یہ ایسی عظیم صفت ہے جس پر اللہ تعالیٰ اتنا ثواب دیتا ہے جتنا کسی دوسری صفت پر نہیں دیتا، ارشادِ نبوی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَ يُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنُفِ وَمَا لَا يُعْطِيْ عَلٰى مَا سِوَاهُ))

[مسلم ، کتاب البر والصلۃ ، باب فضل الرفق : ۲۵۹۳]

''بے شک اللہ تعالیٰ نرم ہے اور نرمی پسند کرتا ہے۔ نرمی کرنے پر اتنا ثواب دیتا ہے جتنا سختی کرنے پر نہیں دیتا اور نہ کسی دوسرے فعل پر اتنا ثواب عطا فرماتا ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات عالیہ میں نرمی کی بہت زیادہ تعریف فرمائی ہے۔ اسے ہر چیز کی زینت قرار دیا ہے۔ وہ جس چیز میں بھی پائی جاتی ہے اسے زینت بخشتی ہے اور لوگوں

کے دلوں اور نگاہوں میں پسندیدہ بناتی ہے اور جس چیز میں نرمی نہیں ہوتی وہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے اور قلوب و ارواح اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ حدیث نبوی ہے:

«إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ»

[مسلم، كتاب البر والصلة، باب فضل الرفق : ٢٥٩٤]

''بے شک نرمی جس چیز میں ہوتی ہے وہ اسے زینت بخشتی ہے اور جس چیز سے نکل جاتی ہے اس کو برا کر دیتی ہے۔''

رسول کریم ﷺ مسلمانوں کو لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں نرمی کی تعلیم دیتے تھے اور خوش اسلوبی کے ساتھ ایسا مثالی رویہ اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے جو اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف دعوت دینے والے مسلمان کے شایان شان ہو، خواہ صورت حال کتنی ہی بغض و نفرت کو بھڑکانے والی اور غیظ و غضب پر اکسانے والی ہو۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔ لوگ دوڑے کہ اسے تنبیہ کریں مگر نبی ﷺ نے فرمایا:

« دَعُوهُ وَ أَهْرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ ذَنُوبًا مِنْ مَاءٍ أَوْ سَجْلاً مِنْ مَاءٍ فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَ لَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ»

[بخاري، كتاب الأدب، باب قول النبي ﷺ يسروا ولا تعسروا : ٦١٢٨]

''اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی بہا دو۔ تم لوگ آسانی کے لیے بھیجے گئے ہو لوگوں پر سختی کرنے کے لیے نہیں بھیجے گئے۔''

واقعہ یہ ہے کہ صرف نرمی، آسانی، مہربانی اور فراخدلی ہی سے دلوں کے بند دروازے کھولے جا سکتے ہیں اور لوگوں کو حق کی طرف بلایا جا سکتا ہے نہ کہ تشدد، سختی، شدت اور زجر و توبیخ سے، اسی لیے اس سلسلہ میں رسول کریم ﷺ کی تعلیم یہ ہے:

«يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَ بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا»

[مسلم، كتاب الجهاد ، باب في الأمر بالتيسير و ترك التنفير : ١٧٣٣]

''آسانی پیدا کرو اور سختی نہ کرو، خوش خبری دو اور نفرت نہ دلاؤ۔''

کیونکہ لوگ فطری طور پر درشتی، سختی اور تشدد کو ناپسند کرتے ہیں اور نرمی، خوش خلقی، آسانی اور رقت کو پسند کرتے ہیں۔

جب آپ کسی خطا کار کو ڈانٹتے ہیں تو وہ شرمندہ ہو کر اصلاح کرنے کی بجائے اپنے اندر سے اٹھتی ایک توانا لہر کے تحت جھوٹے سچے دفاع پر تل جاتا ہے۔ پھر وہ شرمندہ ہونے، اعتراف کرنے اور اصلاح کرنے کی بجائے ڈھٹائی کی راہ اختیار کر لیتا ہے، چنانچہ یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اپنی انا کو تسکین دینا، سرکشی اور تکبر سے اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹنا مقصود ہے تو پھر ڈانٹ ڈپٹ اور عتاب ہی مناسب و موزوں ہیں تاہم اگر اصلاح کا ارادہ ہے اور ہم اپنے آپ کو فرشتہ نہیں انسان ہی سمجھتے ہیں تو اس کے لیے نرمی، لطافت، شائستگی اور شستگی کا راستہ ہے، اسی میں خیر ہے اور اسی میں اصلاح کا راز مضمر ہے یہی سیدنا یوسف علیہ السلام کا عمل ہے اور یہی دیگر انبیاء و صالحین کا طریقہ کہ جو کل قتل کے درپے تھے اور جنھوں نے کل در بدر کی ٹھوکروں کے حوالے کر دیا تھا آج انھیں شرمندہ بھی ہونے نہیں دیا گیا، کہا بھی گیا تو کیا: «اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ» ''یعنی تب تم نادان تھے۔'' کیا مطلب یعنی تب تھے، تو تھے، آج ایسے نہیں ہو۔ انداز ایسا ہے جو بھائیوں پر گراں نہ گزرے بلکہ وہ اپنی غلطی پر سوچیں، اگر کہنے والے کا انداز سخت ہو تو مخاطب اپنی غلطی پر سوچنے کی بجائے جواب دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلوبِ دعوت میں اس کا لحاظ بہتر ضروری ہے۔

❀❀❀

''آپ ہی یوسف ہیں کیا؟''

قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾

''انھوں نے کہا کیا یقیناً واقعی تو ہی یوسف ہے؟ کہا میں یوسف ہوں اور یہ میرا

بھائی ہے، یقیناً اللہ نے ہم پر احسان فرمایا ہے۔ بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

جب برادرانِ یوسف نے مدتوں کے بعد کسی کی زبان سے سنا: ''جانتے ہو تم نے یوسف کے ساتھ کیا کیا؟'' تو وہ حیرت میں پڑ گئے۔ ایک اجنبی شخص سے برسوں پہلے ہونے والے واقعہ کا ذکر سننا اور وہ بھی ایک ایسے موقع پر جب وہ خود کو مظلوم ثابت کرنے جا رہے ہوں؟ سوچتے ہوں گے کہ یہ پوچھنے سے اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ قصہ تو بڑا پرانا تھا، لیکن اس بادشاہ کو اس کی کیا خبر؟

بے ساختہ برادرانِ یوسف کے لبوں سے نکلا:

''کیا یقیناً تو ہی یوسف ہے؟''

اب جذباتی کیفیت ایسی بن چکی تھی اور معلوم ہوتا ہے یوسف کو اپنی شخصیت کے اظہار کا اب اللہ رب العزت کی جانب سے بھی اذن مل گیا تھا، چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ کہا:

﴿اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِيْ﴾ ''ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے۔''

انسان سوچتا ہے کہ بھائی یوسف سے ناواقف تو نہ تھے، چنانچہ یوسف علیہ السلام کا اتنا کہنا بھی کافی تھا کہ ''ہاں میں وہی ہوں'' اور بنیامین کے بارے میں بھی یہی کافی تھا کہ یہ بنیامین ہے، لیکن اپنا نام لینا اور بنیامین کو بالخصوص 'اپنا' بھائی کہنا، اس میں بھائیوں کے لیے، بڑی عبرت اور نہایت موعظت پنہاں تھی، چنانچہ انھوں نے اسے دیکھا، سنا اور پھر یہ سبق سیکھ کے سرنگوں بھی ہوئے۔

محسوس ہوتا ہے اس ایک جملے میں گویا سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی ساری درد بھری کہانی کہہ ڈالی تھی۔ کہا ہاں آج شاہِ مصر کے روپ میں وہی یوسف ہی ہوں۔ کل جس کو تم نے فنا کے گھاٹ اتارنے کے منصوبے بنائے تھے۔ وہی یوسف جسے تم نے ایک ویران کنویں میں تنہا چھوڑ دیا تھا، وہی کہ بعد میں موقع مناسب دیکھتے ہوئے تم نے جس کے دام کھرے کر

لیے تھے۔

وہی یوسف جس کے متعلق تم نے بوڑھے باپ سے برسوں جھوٹ بولا، وہی یوسف جس کے باعث باپ کی بینائی زائل ہوئی اور تم اپنے فعل پر اظہارِ ندامت اور اپنی خطا کا اعتراف کرنے کی بجائے باپ کو ملامت کرتے رہے۔ آؤ دیکھو، غور کرو اور خوب مشاہدہ کر لو، تم نے جو کیا، جو منصوبے ترتیب دیے اور سازشوں کے جو جال بنے وہ سب تارِ عنکبوت ثابت ہوئے۔ آج وہی یوسف تمھارے سامنے کھڑا ہے، چمکتا اور دمکتا اور زندہ وسلامت، پہچانو! رب کی قدرت و جبروت کو! پہچانو اور جانو کہ:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴾ [الدھر : ۳۰]

''جو تم چاہتے ہو وہ نہیں ہوتا بلکہ جو رب چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے سب کچھ جاننے والا، حکمت والا ہے۔''

اور یہ ہے وہ یوسف کا بھائی جو یوسف کے بعد تمھارے جبر اور تمھارے ظلم کا واحد ہدف رہ گیا تھا۔ تم نے ظلم کیا، مگر ہم آج رحم کریں گے، تم نے مجھ سے عزت چھین لینا چاہی، ہم نے تمھیں عزت دی اور مزید دیں گے۔ تم نے انتقام لیے، ہم ایک ہی انتقام لیں گے کہ ہمیں معاف کر دینے کے سوا کوئی دوسرا انتقام لینا آتا ہی نہیں، سو ایک تم تھے اور ایک ہم ہیں۔

ایک تمھارا کردار تھا اور ایک ہمارا، آج ہر دو کرداروں کا انجام خوب دیکھ لو۔

اور ہمارا نہیں مکافاتِ عمل کا انتقام دیکھ لو، اپنی جگہ و مقام اور ہماری شان و احترام ملاحظہ کر لو، تم نے پہچانا اور درست پہچانا۔

یہ سب کچھ اشاروں کی زبان میں تھا بسا اوقات خاموشی کے اشارے حقائق کو زیادہ نکھار دیتے ہیں اور کہنے والا زیادہ پر وقار رہتا ہے۔

دیکھیے سیدنا یوسف علیہ السلام نے سارے قصے کو کس طرح چند لفظوں میں سمیٹ دیا، اب ذرا بھائیوں کی کیفیت کا اندازہ کیجیے، جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ تو وہی یوسف ہے، مگر آج زور

آور اور صاحبِ اختیار ہے۔ شاہِ مصر کے روپ میں وہ جو کمال لطف وکرم سے غلہ دیتا رہا وہ تو یوسف نکلا تو اندازہ کیجیے ان کے خوف اور ڈر کا کیا عالم ہوگا مگر یوسف کے نرم لب و لہجے، شیریں انداز و گفتار اور پرسکون انداز و اطوار نے ان کے سارے خوف دور کر دیے۔ آیت میں مذکور یوسف علیہ السلام کے جواب پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کہانیاں سنانے نہیں بیٹھ گئے۔ درد کے قصے اور اپنی بڑائی کے تذکرے سارے کے سارے پس منظر میں چلے گئے، جو سامنے رہا وہ یوسف کا نرم و گداز لہجہ ہے اور مہربان گفتگو ہے۔ اپنی بڑائی کا اظہار تو بالکل نہیں۔ ہاں رب کی تعریف ہے اور اس کے احسانات بے کراں کا تذکرہ اور اعتراف ہے۔ یوسف نے ستم کم تو نہ سہے تھے، فاصلے ایسے تو نہ تھے کہ چند لفظوں میں سمٹ سکتے مگر جب دل پہ تقویٰ حکمراں ہو اور جب انا کو رضائے رب میں فنا کر دیا گیا ہو تو پھر ویران مواقع پر بھی ایسے ہی پر بہار جلوے طلوع ہوتے ہیں، چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے نہ تو کنویں کی صعوبتیں یاد کیں، نہ کنعان سے مصر کے احوال سفر ذکر کیے، نہ زلیخا کی چالبازی اور اپنی پارسائی کی بات دہرائی، نہ جیل کے تلخ شب و روز کہے، نہ بادشاہ کے حضور اپنی بے مثال پذیرائی کے پرلطف مناظر بھائیوں کے سامنے رکھے، کہا تو جھکی گردن اور سجدہ ریز لہجے میں یہ کہا: «قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا» ''یہ سب ہم پر رب کا احسان ہے۔''

ہمیں بھی ایسا ہی کردار پیدا کرنے کی کاوش کرنی چاہیے۔ ہمیں بھی نمود و نمائش سے بیزار، ریا کے دشمن اور خودنمائی سے دور رہنے والے بننا چاہیے۔ کبھی دعوت کے میدان میں بڑی بڑی کامیابیاں نصیب ہو جائیں یا میدانِ جہاد کے معرکوں میں رب ہم سے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دلوا دے۔ کوئی بہت محیر العقول معرکہ یا کوئی بہت نادر المثال کارروائی میں ہمارا حصہ پڑ جائے تو اس پر نہ تو سینہ پھول جائے اور نہ گردن اکڑ جائے اور نہ ہر جگہ اس کے بیان کی گردان شروع کر دی جائے۔ کہے جائیں تو بس یہی لفظ کہ: «قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا» ''یقیناً یہ ہم پر رب کا احسان ہے اور بس!''

کبھی یہ جہادی معرکے اور جنگی کارروائیاں بیان بھی کرنا پڑتی ہیں۔ حالات کے تناظر میں کبھی اس کی شدید ضرورت بھی ہوتی ہے کہ صدقہ چھپا کر دینا افضل ہے مگر کبھی ترغیب کے لیے اسے ظاہراً بھی دیا جاتا ہے، سو ترغیب کے لیے جہاد کے واقعات اور دعوت کے حالات ذکر کرنا لازم ہو جاتے ہیں مگر جب ایسا کرنا ناگزیر ہو تو تب نمایاں کیا ہونا چاہیے؟ اپنا آپ ؟ نہیں بلکہ ایسے مواقع پر اپنی انا کو فنا کر کے ہر چیز کی نسبت رب کی طرف کی جائے۔ برائی اپنی طرف اور اچھائی رب کی طرف منسوب ہوتی چلی جائے، آپ دیکھ چکے زلیخا کی زور آور اور زہد شکن دعوت سے یوسف بچ نکلے، مگر پھر کہا تو کیا کہا:

﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ﴾

”اور میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا، بے شک نفس تو برائی کا بہت حکم دینے والا ہے مگر جو میرا رب رحم کرے۔“

کہ یہ سارا کمال میرے رب کے فضل کا ہے۔ یہ اسی کا رحم ہے کہ میں بچ گیا وگرنہ نفسِ انسانی تو دل کو بڑھاوے دیتا، آمادہ کرتا اور ترغیب دیتا ہے یہ تو رب نے بچایا ہے اور ہمیشہ وہی بچایا کرتا ہے۔ آج یہاں بھی دیکھ لیجیے، کوئی زور وشور نہیں، طبیعت کے منہ زور دریا میں کوئی طغیانی اور سرکشی نہیں بلکہ اطمینان ہی اطمینان ہے اور ہر طرف عاجزی کے کھیت لہلہا رہے ہیں۔ ڈینگ نہ بڑائی، تکبر نہ خبطِ عظمت بلکہ بس ایک انکسار اور بے شمار۔

پھر سیدنا یوسف علیہ السلام نے وہ بات کہی جو قصے کا عنوان ہے اور ساری زندگی کے لیے پلے باندھ لینے والی بات ہے۔ وہ جو کامیابیوں کی کنجی اور فلاح کا زینہ ہے:

«اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَيَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ» ”بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

گویا بتا دیا کہ کنعان کے کنویں سے مصر کے تخت تک کا سفر تو بس احسان الٰہی ہے مگر سننے اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جو تقویٰ شعار ہو جاتا ہے اور صبر جس کا کردار ہو جاتا ہے،

یعنی جو رب کی معصیت سے بچتا ہے اور جو تقدیر کی مشکلات پر صبر اختیار کرتا ہے رب تعالیٰ اس کی محنت اس کی کوشش اور اس کا عمل ضائع نہیں جانے دیتا، بلکہ اس کے صلے اور انعامات ملتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ انعام دنیا اور آخرت پر ہر دو جگہ میسر آتے ہیں۔ یہاں یہ بھی ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ بات صرف یوسف علیہ السلام تک محدود نہیں بلکہ عالمگیر اور قیامت تک کے لیے ایک مستقل اصول ہے، ذرا الفاظِ قرآن ملاحظہ کیجیے، فرمایا:

«إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ» ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

ہمیں بھی بارہا سننا پڑتا ہے کہ تم لوگ جو جہاد میں جانیں دیتے ہو، ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس سے تمھیں کیا ملا؟ یہ سوال ہوتا ہے ہم سے دیکھیے اتفاق سے آج ہم جس جگہ موجود ہیں، یعنی 'وادیٔ دیوال میں' یہاں کبھی ہم سے بہت بہتر اور بہت اعلیٰ لوگ بھی اترے تھے۔ شاہ اسماعیل شہید اور ان کے رفقاء مجاہدین کرام، کبھی وہ بھی سر بکف یہاں آئے تھے۔ انھوں نے سکھوں سے جہاد کیا تھا، انھوں نے اپنے اس معرکے میں سکھوں کو شکست دی تھی۔

آج علاقہ دیوال میں آپ کو جہاں ایک مسجد ملتی ہے کبھی یہاں سکھوں کا شمشان گھاٹ تھا، یعنی وہ جگہ جہاں وہ اپنے مردے جلایا کرتے تھے۔ اب یہاں مسجد ہے، اللہ کا گھر ہے، جہاں سے دن میں پانچ بار رب کی توحید کا ترانہ گونجتا ہے۔ جہاں پیشانیاں اس کے حضور جانے ایک روز میں کتنی بار سجدہ کے لیے جھکتی ہیں۔ یہ انھی مجاہدین کے جہاد کا ثمر ہے، مگر آپ دیکھیں یہی مجاہدین بالاکوٹ جا کے شہید ہو جاتے ہیں تو کیا وہ ناکام ہو گئے؟ نہیں اور کبھی کوئی یہ نہیں کہتا، اس لیے کہ اصل کامیابی جسموں اور جانوں کے بظاہر سدو زیاں سے نہیں نظریات کے پھیلاؤ سے ماپی جاتی ہے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا جہاد تو آج بھی زندہ ہے۔ ہم نے بھی اس جہاد کی آبیاری کے لیے خون پیش کیا ہے۔ شہادتیں پیش کی ہیں، نوجوانوں نے قربانیاں دی ہیں تو اس سے ہوا یہ ہے کہ سارے افق پر شہادت کا دل کش منظر ترتیب پا گیا ہے۔

کل جب کنہار کے اس پار سید اسماعیل رحمہ اللہ شہید ہو گئے، ان کے رفقاء نے اپنے نظریئے پر جانیں وار دیں تو مورخ کہتا ہے کنہار کا پانی سرخ ہو کے بہتا تھا، وہ لہو رنگ میں نہا گیا تھا اور انگریزوں نے اس پر فتح کے شادیانے بجائے تھے، تو کیا انگریز کامیاب ہو گئے تھے؟ تحریک سید اسماعیل شہید رحمہ اللہ اور تحریک جہاد تو آج بھی زندہ ہے۔ ان کا جہاد اور ان کی قوم کے غیرت مند سپوت زندہ ہیں۔ جہاد کے قافلے رواں دواں ہیں تو میرے بھائیو! دل چھوٹا نہ کیا کرو نہ ناواقف لوگوں کے پروپیگنڈے میں آیا کرو۔ اللہ کی قسم! ہمیں جتنا کچھ مل گیا ہمیں تو اتنے کی بھی توقع نہیں تھی۔ بس دو چار نکلے تھے ایک صدا لے کے، آج کتنے لوگوں کو رب نے ہمارا ہمنوا کر دیا ہے۔ جہاد کا راستہ بھی کیا عجب ہے! جہاد کا منہج کبھی پڑھے لکھوں کی سمجھ میں نہیں آتا یا دیر سے آتا ہے مگر دیکھو کتنے ہی سادہ دل اور ان پڑھ لوگ ہیں جو اس منہج کی تہہ تک پہنچ چکے ہیں۔ جب سمجھ میں آ جائے تو پھر دیر نہیں لگتی۔ جہادی معرکے سے ذرا پہلے صحابی کھجوریں کھا رہا تھا۔ پھر کچھ سوچا اور سوچ کر کہنے لگا:

«لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتَّىٰ آكُلَ تَمَرَاتِيْ هٰذِهِ، إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ»

[مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب، ثبوت الجنة للشهيد : ٤٩١٥]

"اگر میں کھجوریں ہی کھاتا رہا تو پھر یہ زندگی تو بڑی طویل ہے۔"

اس نے یہ کہا اور کھجوریں پرے پھینک دیں اور معرکے میں شامل ہو گیا اور بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گیا۔

جب جہاد سمجھ میں آتا ہے تو اتنی ہی دیر لگتی ہے اور آج یہ دعوتِ جہاد بہت سے لوگ تو اسی آسانی سے جان گئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قربانیاں پیش کر رہے ہیں اور یقین کیجیے یہ کبھی سوال نہیں کرتے، سوال تو وہ کرتے ہیں جنھوں نے کبھی کچھ پیش نہیں کیا، سو انھیں ایمان کا وہ ذائقہ بھی نصیب نہیں ہوا، اس لیے وہ شکوک میں گھرے رہتے ہیں۔ قرآن مجید دیکھیے، یہ منظر خود رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں بھی آپ کو ملے گا:

﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝۴۳

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٤٣، ٤٤]

''اللہ نے تجھے معاف کر دیا، تو نے انھیں کیوں اجازت دی، یہاں تک کہ تیرے لیے وہ لوگ صاف ظاہر ہو جاتے جنھوں نے سچ کہا اور تو جھوٹوں کو جان لیتا۔ تجھ سے وہ لوگ اجازت نہیں مانگتے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، اس سے کہ اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کریں اور اللہ متقی لوگوں کو خوب جاننے والا ہے۔''

تو مایوسی کی کوئی بات نہیں، نا امیدی جیسے کفر کے مرتکب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر دنیا میں اجر ملتا ہے تو یہ رب کا احسان ہے، تاہم اگر اللہ کو یہ منظور نہیں اس کی حکمت کچھ اور ہے اور وہ ہمارے لیے سب کچھ قیامت کے دن کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا ہے تو اللہ کی قسم! ہم اس پر بھی راضی ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ جو ہوا ہمیں تو یہ بھی بہت لگتا ہے۔ ہماری گردنیں تو رب کے اس احسان سے اٹھتی ہی نہیں ہیں کہ اس نے ہمیں جہاد کی توفیق دے دی۔ ہمیں شہادت کا راستہ دکھا دیا، ہمارا نام بھی اہل جہاد میں شامل کر لیا ہے۔ آج ہمیں بھی اسی خواہش کی توفیق دے دی گئی ہے جس کی آرزو سرورِ انبیاء، شافع محشر، سید الاولین والآخرین کرتے رہے ہیں۔

تو پھر ہم عجلتوں کا شکار کیوں ہوں، ہم ان لوگوں میں سے کیوں نہ ہو جائیں جو صبر کرتے اور معاملات کے انجام کو رب پہ چھوڑ دیتے ہیں، ایسے ہی لوگوں کو خوشخبری ہو، ان لوگوں کو سورۂ یوسف کی نوید ہو، جنھیں اللہ دنیا میں بدلے دے دیتا ہے، تاہم کبھی اللہ بندے کو دنیا میں نہیں بھی دیتا، یہ بندے کا ایک اور امتحان اور رب کی گہری محبت کا غماز معاملہ ہے۔ آخرت دنیا سے بہت بہتر ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴾ [الأعلى: ١٧]

چنانچہ بعض لوگوں کے لیے اللہ صرف آخرت کا انتخاب فرما لیتا ہے، مگر انسان اس کو

نہیں سمجھتا، وہ رب کی اس محبت اور انسان کے ساتھ اس خیر خواہی کی حکمتیں نہیں جانتا اور دراصل یہ انسان کی فطرت ہے۔ رب کا قرآن اس پر گواہ ہے:

﴿ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴾ [بنی اسرائیل : ١١]

''یعنی انسان جلد باز ہے۔''

انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ کوشش کرتا رہے، دعا مانگتا رہے۔ جلد بازی سے احتراز کرے اور ہمیشہ یہ یقین اور اعتقاد رکھے کہ دینے کا جو وقت ہمارے لیے مقرر رب کے ہاں مقرر ہے اس پر اللہ ہمیں ضرور دے گا۔ اب یہ جو دیر ہو رہی ہے تو اس میں اندھیر نہیں بس وہ حکمتیں ہیں جنھیں ہم تو نہیں دیکھتے مگر رب کریم ان کو دیکھ رہا ہے۔ جلد بازی میں جو ہمارے شدید نقصانات پنہاں ہیں، رب انھیں دیکھ کر تاخیر کر رہا ہے اس وقت تک جب تک نقصانات کے یہ بادل جنھوں نے ہماری قسمت کے افق کو ڈھانک رکھا ہے، چھٹ نہیں جاتے۔ یہ سب دیر سویر کا معاملہ ہے مگر ایمان یہ ہونا چاہیے کہ رب اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

جہاد بھی ایک بڑا صبر آزما اور حوصلوں کی آزمائش والا سلسلہ ہے۔ یہاں صبر کی اہمیت مزید دو چند ہو جاتی ہے۔ تاریخ کا سبق ہے اور قرآن مجید اس پر شاہد ہے کہ ہر ظالم کا بیڑا غرق ہوا اور ہر سرکش بالاخر اپنے عبرتناک انجام سے دو چار ہوا۔ عصر حاضر کی قوتیں بھی ضرور اس انجام کو پہنچیں گی، امریکہ ہو یا کوئی دوسری فرعونی طاقت اسے نابود ہونا ہے۔ مٹ جانا ہے اور اس کا بیڑا غرق ہونا ہی ہے۔ مگر اس میں ابھی کتنی دیر ہے؟ یہ رب کے علم میں ہے۔ ہم نہیں جانتے اسے سرکشی میں رب نے ابھی اور کتنی مہلت دینا ہے اور اپنے محسن و مخلص بندوں کی ابھی اور کتنی آزمائش کرنا ہے، مگر یہ طے ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

❀❀❀

حسد کا انجام، بالآخر اعترافِ شکست!

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَ اِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۱﴾

''انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً اللہ نے تجھے ہم پر فوقیت دی ہے اور بلاشبہ ہم واقعی خطا کار تھے۔''

اب وہ لمحہ آ گیا جب برادرانِ یوسف کو اپنی غلطی کا صاف اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ نہیں، چنانچہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور ساتھ یوسف علیہ السلام کی عظمت و بڑائی کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ یوسف ہم نے تم پر بڑی زیادتیاں روا رکھیں اور بڑے ظلم کیے، مگر وہ سارے ستم بھی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ اب سچ سامنے آ چکا اور سچ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھیں ہم پر فضیلت عطا کی ہے۔ تمھیں علم و حلم دیا ہے، جمال و کمال دیا ہے شرف و عزت دی ہے۔ نبوت و عظمت دی ہے اور ایک وسیع سلطنت کا حکمران بنا دیا ہے اور پھر یہ کہ ظرف و حوصلہ عطا کیا ہے۔ آج ہم کھلے دل سے یہ اعتراف کرتے ہیں کہ یقیناً ہم خطا کار ہیں اور آپ ایک صاحبِ فضل شخصیت ہیں، ہم ناحق حسد کی آگ میں جلتے رہے۔

مگر آج یہ فضیلت دینا، عظمت و حکومت دینا، محبتوں کا حق دار کر دینا تو بس اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ بھائی کی نعمت پر حسد کرنے اور جلنے کڑھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم نے ہر تدبیر آزمالی اور ہر ترکیب اختیار کر لی مگر سب بے سود رہا۔ چنانچہ آج خود اپنی زبان سے اعتراف کرتے ہیں کہ: «اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا» اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر ترجیح دی ہے۔

❀❀❀

کمال ضبط، بے مثال ظرف

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۫ وَ هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾

''اس نے کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے والوں

میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

جونہی بھائیوں نے اپنی خطا کا اعتراف کیا سیدنا یوسف علیہ السلام نے انھیں مزید اعتراف اور مزید شرمندگی سے فوراً بچا لیا۔ کہا جو ہوا سو ہوا، میں نے بھلا دیا، معاف کر دیا اور نا صرف خود معاف کر دیا بلکہ رب کے حضور بھی دعا گو ہوں کہ وہ بھی تمھیں معاف فرما دے اور جہاں تک رب کا معاملہ ہے تو وہ بڑا رحم کرنے والا ہے، بلکہ کائنات میں جتنے بھی لوگ رحم کرنا جانتے ہیں وہ ان سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

قربان جایئے ! جناب یوسف کی کمال شفقت اور دل نوازی کے عجب ڈھنگ پر، کہا بھی تو یہ نہیں کہا میں نے تمھیں معاف کر دیا، نہیں بلکہ معافی تو رہی الگ کہا تمھیں ملامت بھی کوئی نہیں، تمھیں کوئی عار ہی نہیں کہ دراصل لَا تَثْرِيْبَ کا لفظی معنی معاف کرنا نہیں ملامت نہ کرنا اور عار نہ دلانا ہے۔ جیسے حدیث رسول میں یہ لفظ آیا ہے:

《إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا》

[بخاری : ۲۲۳٤]

"جب تم میں سے کسی کی لونڈی زنا کر بیٹھے اور اس کا زنا واضح ہو جائے اور پھر اسے کوڑے لگا دیے جائیں تو پھر اسے اس پر ملامت نہ کی جائے۔"

تو یوسف علیہ السلام نے تثریب کے لفظ بول کر کہا کہ نہ تم پر ملامت ہے اور نہ عار۔ یہاں ہماری تربیت کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ کسی کو اللہ نواز دے، اعلیٰ مراتب دے دے، عظمتیں اور شان و شوکت عطا فرما دے تو پھر وسعت قلب بھی ہونا چاہیے پھر معاف کر دینے اور سہہ جانے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔ پھر یہ عظمت کردار بھی ہونا چاہیے کہ ظلم و ستم کے ایک نا قابل فراموش سلسلے کے بعد انسان کہہ سکے:

﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ "آج تم پر کوئی ملامت نہیں۔"

وہ لوگ کہ عظمت جن پر ٹوٹ کے برستی ہے، وہ ایسے ہی ہوتے ہیں کشادہ دل اور فراخ حوصلہ، رسول اللہ ﷺ کو دیکھیے اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کے گلاب جسم اور سندر بدن پر

کیا کیا ستم نہ توڑے تھے۔ ان کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے۔ کائنات کے مدبر ترین اور محترم ترین شخص کو پاگل، دیوانہ، مجنون اور ساحر کہا گیا۔ بے اولادی کے طعنے دیے گئے۔ صحن مکہ میں ان پر اوجھڑیاں پھینکی گئیں۔ قاتلانہ حملے کیے گئے، ایک مقاطع کے ذریعے انھیں شعب ابی طالب میں محصور کر دیا گیا، جہاں نوبت یہ بھی آئی کہ پتے کھانے پڑے اور چمڑے تک کو جلا کے کھانا پڑا، اپنے ہی شہر میں اجنبی کر دیا گیا، اپنے پرائے بن گئے اور پھر ایک شب انھیں مجبور کر دیا گیا کہ وہ چھلکتی آنکھوں اور مچلتے دل کے ساتھ بیت اللہ چھوڑ جائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے موقع پر وہ وقت آیا کہ کل کے سارے ظالم گردنیں جھکائے کھڑے تھے، دیگر سردارانِ قریش کے ساتھ ساتھ ابو سفیان کی پریشانی بھی دیدنی تھی، وہ اللہ کے رسول ﷺ سے عرض کرنے لگے: ''اے اللہ کے رسول! کیا قریش آج تباہ کر دیے جائیں گے؟'' [مسلم، کتاب الجهاد، باب فتح مكة : ۱۷۸۰]

رسول اللہ ﷺ نے نا صرف سب مظالم فراموش کر دیے، بلکہ انھیں عزت و تکریم سے بھی نوازا اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کی چوکھٹ کو پکڑ کر فرمایا:

((يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ! مَا تَقُوْلُوْنَ ؟ قَالُوْا : نَقُوْلُ ابْنُ أَخٍ وَ ابْنُ عَمٍّ رَحِيْمٌ كَرِيْمٌ، ثُمَّ عَادَ عَلَيْهِمُ الْقَوْلَ، قَالُوْا مِثْلَ ذٰلِكَ، قَالَ : فَإِنِّيْ أَقُوْلُ كَمَا قَالَ أَخِيْ يُوْسُفُ: ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴾

[السنن الكبرىٰ للنسائي : ۳۸۳/۷، ح : ۱۱۲۹۸، و إسناده حسن لذاته]

''اے قریشیو! تمھارا (میرے بارے میں آج) کیا خیال ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہم تو یہی کہتے ہیں کہ آپ ہمارے بھتیجے اور چچا زاد ہیں اور آپ بڑے مہربان اور کریم ہیں۔'' آپ ﷺ نے ان سے پھر وہی سوال کیا اور انھوں نے پھر وہی جواب دیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسف (علیہ السلام) نے کہی تھی: '' آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تعالیٰ تمھیں بخشے اور وہ رحم کرنے

والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

سچ کہ جو ٹہنی ثمر بار ہو وہ جھک جاتی ہے اور وہ اشجار کہ جن کی شاخیں ثمر سے خالی ہوں وہ جھکنا نہیں جانتے وہ سرکشیدہ رہتے ہیں۔ دراصل باعظمت انسان ہی جھکتے بھی ہیں اور معاف کرنے کا ہنر بھی رکھتے ہیں۔

❁❁❁

قمیص لے جاؤ اور پھر سبھی مل کے آؤ

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ وَاْتُوْنِيْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٩٣﴾

"میری یہ قمیص لے جاؤ اور اسے میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، وہ بینا ہو جائے گا اور اپنے گھر والوں کو، سب کو میرے پاس لے آؤ۔"

جب جان پہچان اور تعریف و تعارف کے سارے مرحلے طے ہو گئے۔ گھر کے حالات بھی بالتفصیل یوسف علیہ السلام کے گوش گزار کر دیے گئے اور بالخصوص یوسف کے بعد باپ کی جو حالتیں ہوئیں اس کا ذکر ہوا تو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی قمیص اتار کے دی اور کہا کہ اسے لے جاؤ اور باپ کے چہرے پر رکھو ان شاء اللہ اللہ اس کی بینائی لوٹا دے گا۔ یہاں سیدنا یوسف علیہ السلام نے بتا دیا کہ اس طرح سے باپ کی کھوئی ہوئی بینائی دوبارہ میسر آ جائے گی تو اس سے غیب ثابت کرنا کوئی دلیل نہیں بلکہ وحی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو آگاہ فرما دیا تھا۔ چنانچہ حسب وحی یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو ایسا کرنے کا حکم دیا۔

مفسرین نے حیرت ظاہر کی ہے کہ پیراہن یوسف یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام کی قمیص کیا نادرِ روزگار اور عجب یادگار چیز تھی۔ کیا عجب داستانیں اس سے منسوب ہوئیں اور کیا تعجب خیز مراحل میں یہ بروئے کار آئی۔

پہلی مرتبہ تب جب بھائیوں نے اسے بھائی کے تن سے اتروا لیا اور اسے کسی جانور کے

خون سے رنگ کر باپ کے حضور اپنی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کر دیا:

﴿ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ﴾ [یوسف : ١٨]

''اور وہ اس کی قمیص پر ایک جھوٹا خون لگا لائے۔''

دوسری مرتبہ جب زلیخا نے نیت بد سے آپ کو پھانسنا چاہا تو یوسف علیہ السلام کی قمیص پھٹ گئی۔ اب اسی قمیص کو رب نے یوسف علیہ السلام کی صداقت کا معیار بنا دیا اور فیصلہ یہ ہوا:

﴿ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴾

[یوسف : ٢٥، ٢٦]

''اگر اس کی قمیص آگے سے پھٹی ہو تو عورت نے سچ کہا اور یہ جھوٹوں سے ہے
اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہو تو عورت نے جھوٹ کہا اور یہ سچوں سے ہے۔''

اور اب تیسری بار پھر اس سے ایک عظیم کام ہونے جا رہا ہے اور وہ ہے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بینائی کی واپسی، حقیقت یہ ہے کہ قمیص میں کمال نہیں یہ سب اللہ کی قدرت کے کرشمے ہیں اور اس موقع پر تو معجزہ ہے۔

بہر حال سیدنا یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کو ہدایت کی کہ قمیص لے جاؤ اور اسے باپ کے چہرے پہ ڈالو گے تو اللہ رب العزت انھیں پھر سے بینا کر دے گا اور پھر سب گھر والوں کو یہاں مصر لے آؤ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ جو پھر مصر لائے گئے تقریباً ستر افراد تھے۔ بہر حال یہ نہایت تعجب خیز اور سبق آموز مرحلہ تھا کہ کل جن لوگوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو گھر سے نکال دیا تھا آج وہ سب اپنا گھر چھوڑ کر یوسف کے ہاں جا رہے تھے۔ کل جس کو پناہ نہ دی تھی آج پورا کنبہ اور قبیلہ اسی کی پناہ میں جا رہا تھا اور بزبان حال گویا کہتا جا رہا تھا:

﴿ فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ ﴾ [الحشر : ٢]

''سو عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو۔''

❁❁❁

فضاؤں میں تیرتی یوسف علیہ السلام کی خوشبو !!

وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِيْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ ﴿۹۴﴾

''اور جب قافلہ جدا ہوا، ان کے باپ نے کہا بے شک میں تو یوسف کی خوشبو پا رہا ہوں، اگر یہ نہ ہو کہ تم مجھے بہکا ہوا کہو گے۔''

آپ کو یاد ہو گا، سورۂ مبارکہ کی ابتدا میں ذکر ہوا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کی شان نزول کیا ہے؟ یہ سورۂ مبارکہ نبی آخر الزمان جناب محمد کریم ﷺ کی راہِ ہجرت میں نازل ہوئی، اس کا ایک مقصد آپ کو تسلی دینا تھا کہ آپ کو بیت اللہ چھوڑنا پڑا تھا۔ رات کی تاریکی میں اپنا وطن، اپنا شہر اپنا گھر اور اپنے پیارے عزیز و اقارب سے جدائی اختیار کرنا پڑی تھی، یہ راہ بڑی پر صعوبت اور بڑی کٹھن دکھائی دیتی تھی۔ حرم سے آپ کو جو بے پناہ محبت تھی اس کی بے پناہی نے آپ کی آنکھوں کو آبدیدہ کر دیا ہے۔ دل کو غم سے بھر دیا تھا اور تب لبوں سے یہ لفظ نکلے تھے:

((وَ لَوْلَا أَنِّيْ أُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ))

[ترمذي، كتاب المناقب، باب في فضل مكة : ٣٩٢٥ إسناده صحيح]

''مکہ! تجھے چھوڑنے کو دل تو نہیں کرتا مگر کیا کروں تیرے رہنے والوں (مشرکین) نے نکلنے پر مجبور کر دیا۔''

تو تب یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی، اور رسول اللہ ﷺ کو یوسف کی جلا وطنی، گھر سے دوری اور راہِ ہجرت کا سارا قصہ سنایا گیا اور پھر بتایا گیا کہ یہ ہجرت خیر کے اتنے بے پناہ اور لا تعداد مواقع اپنے دامن میں سمیٹے ہے کہ بعد میں پھر یہ دشواریاں راحتیں ہو جاتی ہیں۔ یوسف کے قصہ کو دیکھ لیجیے انھوں نے بھی گھر چھوڑا، وطن سے دوری انھیں بھی اختیار کرنا پڑی، اپنوں سے فرقت ان کا بھی مقدر بنی مگر انجام کار دیکھ لیجیے اللہ تعالیٰ نے نہ صرف انھیں سب اپنوں سے ملا دیا بلکہ پورے مصر کی حکمرانی بھی مقدر فرما دی، سو گھبرایئے نہیں۔

یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی دعوتِ تسلی تھی اور ہمارے لیے بھی اس میں بڑی خوشخبریاں پنہاں ہیں یہاں دراصل ہم پر ہجرت کی قدر و قیمت اور اہمیت واضح کی جاتی ہے۔ یاد رکھیے ہجرت ہی جہاد کی بنیاد ہے۔ جو ہجرت اختیار نہیں کر سکتا وہ جہاد بھی نہیں کر سکتا۔ جہاد کے لیے پر آسائش گھر چھوڑنے پڑتے ہیں، اپنوں کی شفیق اور مہربان معیت چھوڑنا پڑتی ہے۔ پیارا وطن اور مانوس دیس چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ سب چھوڑ چھاڑ کے جنگلوں میں بسیرا کرنا پڑتا ہے۔ پہاڑوں اور کبھی ان غاروں میں پناہ گزیں ہونا پڑتا ہے۔ خوف کی سنگینی کے سائے تلے شب و روز گزارنے پڑتے ہیں۔ موت کے سائے میں زندگی کرنا پڑتی ہے۔ ساری خواہشوں کو دامن سے نچوڑ پھینکنا پڑتا ہے۔ پھر انسان پر کبھی فاقے اترتے ہیں اور کبھی پیاس نزول کرتی ہے اور تب جا کے جہاد ہوتا ہے اور یہ سب بڑا سخت ہوتا ہے مگر ان پر نہیں جن کو اللہ توفیق دے دے۔

جہاد کا سارا انحصار ہجرت پر ہے۔ آج تو یہ کچھ اور مشکل ہو گیا ہے کہ آج کے انسان کی تو ساری زندگی ہی اسی مادیت کے گرد گھومتی ہے۔ آج تو پر آسائش گھر اور رئیسانہ رہائش ہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور جب گھر ایسے بنا لیے جائیں تو پھر ان کی محبت دلوں میں دور تک جا بیٹھتی ہے پھر یہ گھر چھوڑنے بڑے، شاق ہونے لگتے ہیں قرآن مجید نے یہ کہا ہے، ذرا پڑھیے:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾ [التوبة: ٢٤]

”کہہ دے اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑنے سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات، جنھیں تم پسند کرتے ہو، تمھیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو،

یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"
تو گھروں کی اور اپنوں کی اور اپنی خواہشوں کی یہ وہی محبت ہے جو قرآن کے ہاں قابل مذمت ہے۔ رسولِ رحمت نے بھی ارشاد فرمایا:

《 لَا خَيْرَ فِي الْبِنَاءِ》 [ترمذی : ٢٤٨٢]

"عمارتیں بنانے میں کوئی اجر نہیں۔"

بلکہ عمارتیں بنانا اور ان پر باہم فخر کرنا تو قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔
آج یہ سوچ ہمارے دل و دماغ پہ حکمران ہے مگر رسول اللہ ﷺ نے تو یہ نہیں فرمایا، یہ سوچ نہیں دی، یہ فکر تو اس نبی نے نہیں دی جو جب فوت ہوئے تو ان کی زرہ ایک یہودی کے ہاں گروی رکھی ہوئی تھی، چنانچہ ان کا ارشاد تو یہ ہے:

《 كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ》

[بخاری، کتاب الرقاق، باب قول النبی ﷺ ...... الخ : ٦٤١٦]

"دنیا میں یوں رہ گویا تو کوئی اجنبی شخص ہے یا راہ عبور کرنے والا کوئی مسافر۔"

نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے:

《 لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ》 [ترمذی : کتاب الزهد، باب، ما جاء فی ...... الخ : ٢٣٢٠]

"اگر اللہ کے نزدیک یہ دنیا مچھر کے پر جتنی بھی حیثیت رکھتی تو وہ کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلاتا۔"

تو یہ ہے دنیا کی حیثیت چنانچہ شہر نہیں، مجاہد جنگل آباد کرتا ہے، وہ تو وادیوں، غاروں اور پہاڑوں کا شہزادہ ہوتا ہے اور یہ وہ کر سکتے ہیں جو ہجرت اختیار کرتے ہیں اور یہ تب ہوتی ہے جب اللہ سے محبت دنیا کی نسبت زیادہ ہو، دراصل سورۂ مبارکہ میں یہ وہ مقام ہے جہاں ہجرت کے ثمرات کا ذکر ہے۔ ابھی وہ وقت آیا چاہتا ہے جب ہجرت کی فرقت کے مارے ملنے والے ہیں۔

اب یہ مہربان رب کی نوازشیں دیکھیے کہ ادھر سے قافلہ روانہ ہوتا ہے۔ قافلے میں خوشخبری دینے والا قمیصِ یوسف لیے چل پڑتا ہے، ادھر سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یوسف کی خوشبو سونگھنا شروع کر دی، رب کے بھی کیا نیارے نظام ہیں آج یوسف میلوں دور بیٹھا ہے تو باپ خوشبو محسوس کر رہا ہے، کل جب وہ بالکل قریب کنویں میں موجود تھے۔ تب آواز سنی نہ خوشبو محسوس کی، تو مان لینا چاہیے کہ انسان نبی بھی ہو تو بھی رب جتنا اور جو بتائے نبی اتنا ہی جانتا ہے۔ اسے غیب کا علم نہیں ہوتا، ہاں کبھی اسے معجزہ عطا کر دیا جاتا ہے اور کبھی اسے آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جیسے رب چاہے ہوتا ویسے ہی ہے، تو غیب دان صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

چنانچہ یعقوب علیہ السلام اپنے اہل خانہ سے کہتے ہیں کہ اگر دیوانہ نہ کہو۔ اگر تم اسے یوسف سے میری بے پناہ محبت کا شاخسانہ قرار نہ دو تو میں آج یوسف کی خوشبو محسوس کرتا ہوں۔

❀❀❀

پھر وہی بحث

قَالُوْا تَاللّٰهِ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ ﴿۹۵﴾

”انھوں نے کہا اللہ کی قسم! بلاشبہ یقیناً تو اپنی پرانی بھول ہی میں ہے۔“

حاضرین اور اہل خانہ نے ظاہر ہے اسے یعقوب علیہ السلام کی اسی پرانی روش اور قدیم طرزِ فکر کا شاخسانہ قرار دیا۔ وہ تو ایسے مواقع پر یعقوب علیہ السلام کو جھٹلایا ہی کرتے تھے۔

چنانچہ آج بھی وہی کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ یوسف کی محبت کے طلسم سے کبھی نکلے ہی نہیں، کبھی آپ نے انھیں بھلایا ہے اور نہ اسے مرا ہوا تسلیم کیا ہے اور آج تو آپ باقاعدہ ان کی خوشبو محسوس کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ تو آپ کا پرانا وتیرہ ہے اگر حقیقت پوچھتے ہو تو ایسا کچھ نہیں، بس یہ آپ کا تخیل اور یوسف سے محبت کا تصور ہے، جو آپ کو نت نئی امید کی تصویریں دکھاتا ہے اور آپ کے من چاہے حالات تراش تراش کے آپ کو دکھاتا ہے۔ وہ آج یہ کہہ رہے تھے۔ وہ تو خیر شروع ہی سے ایسا کہتے آئے تھے لیکن غلطی پر تھے۔

ایک ایسے ہی موقع پر انھیں یعقوب علیہ السلام نے بتایا تھا:

﴿ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ ”اللہ کی جانب سے میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔“

مگر آج وہ لوگ پھر اس بات کو فراموش کر چکے تھے اور یعقوب علیہ السلام کو جھٹلا رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے یعقوب علیہ السلام کی خبر نبوت مبنی بر حقیقت تھی۔ آیت کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ اللہ نے وحی کے ذریعے سیدنا یعقوب علیہ السلام کو بتا دیا تھا، کیونکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، بعض لوگ اس آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کو غیب کا علم دیا تھا۔ یہ اندازِ استدلال غلط ہے۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اللہ اپنے نبی کو وحی کے ذریعے وہ کچھ بتا دیتا ہے جو دوسروں کو نہیں بتاتا وحی ہی نبی کا اعزاز ہوتا ہے۔

❀❀❀

جب نابینا آنکھیں دیکھنے لگیں

فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ قَالُوْا یٰۤاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕیْنَ ﴿۹۷﴾ قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۹۸﴾

”پھر جیسے ہی خوشخبری دینے والا آیا اس نے اسے اس کے چہرے پر ڈالا تو وہ پھر بینا ہوگیا۔ کہنے لگا کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ بے شک میں اللہ کی طرف سے جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ انھوں نے کہا اے ہمارے باپ! ہمارے لیے ہمارے گناہوں کی بخشش کی دعا کر، یقیناً ہم خطا کار تھے۔ اس نے کہا میں عنقریب تمھارے لیے اپنے رب سے بخشش کی دعا کروں گا۔ بے شک وہی بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔“

سیدنا یعقوب علیہ السلام اہل خانہ کو پہلے ہی بشارت سنا چکے تھے کہ ”مجھے یوسف کی خوشبو

محسوس ہوتی ہے۔'' اب باقاعدہ بشارت دینے والا بھی آ پہنچا۔ مفسرین کی صراحت کے مطابق یہ یہودا تھا، دراصل یہودا ہی وہ شخص تھا جو پہلی دفعہ یوسف کا خون آلود پیرہن لایا تھا اور انھوں نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سامنے بھیڑیئے کے یوسف کو کھا جانے کا فسانہ سنایا تھا۔ تو آج یہودا نے تقاضا کیا کہ جب اس بدخبری کے موقع پر قمیص لے جانے کا ناخوشگوار فریضہ انھیں سرانجام دینا پڑا تھا تو آج خوشخبری و بشارت دینا بھی انھی کا حق ہے۔ سو وہ بڑی سبک روی سے اور بڑے جوش سے کنعان آئے۔ آ کر سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسب حکم پیرہنِ یوسف کو سیدنا یعقوب علیہ السلام کے چہرۂ اقدس پر ڈالا تو سیدنا یعقوب علیہ السلام کی زائل شدہ بینائی لوٹ آئی۔ یہاں مفسرین نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ کیا سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بینائی کلی طور پر چلی گئی تھی یا جزوی طور پر؟ اس سلسلے میں مفسرین دو رائے رکھتے ہیں کچھ کا خیال ہے کہ بینائی بالکل ہی جاتی رہی تھی لیکن بعض کہتے ہیں کہ نہیں کثرت گریہ کے باعث بینائی کمزور تو ضرور ہوئی تھی، مگر مکمل زائل نہ ہوئی تھی۔ بہر حال قرآن مجید کے لفظوں سے تو یہی واضح ہوتا ہے کہ ساری سیاہی ہی ڈھل گئی تھی اور اب اس آیت میں «فَارْتَدَّ بَصِيْرًا» سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بینائی پہلے موجود نہ تھی۔ بہرحال کچھ بھی صورت تھی اب رب کی رحمت کے باعث سیدنا یعقوب علیہ السلام کو دوبارہ سے مکمل اور کامل بینائی عطا کر دی گئی۔

«اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ» یہ وہ وقت تھا جب سیدنا یعقوب علیہ السلام جو پہلے کہتے رہے تھے کہ یوسف زندہ ہے اور اب وہ ثابت ہو چکا تھا، سو سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے جتایا کہ ''کیا میں نہ کہتا تھا کہ رب کی طرف سے جو میں جانتا ہوں تمھیں اس کی خبر نہیں۔''

بہر حال برادرانِ یوسف نے اب سب جان لینے کے بعد معافی کی درخواست کر دی۔

والدین آخر ماں باپ ہوتے ہیں۔ بچوں سے محبت کرنے والے اور انھیں چبھنے والا کانٹا بھی برداشت نہ کرنے والے، یہ والدین ہی ہوتے ہیں کہ اولاد کتنی ہی کمزور و لاغر ہو، اور سارے جہاں کے ہاں معتوب ہی کیوں نہ ہو مگر والدین کے ہاں وہ چاند کے ٹکڑے ہی

ہوتے ہیں۔ سو اب جب یعقوب علیہ السلام کا یوسفِ گم گشتہ مل گیا تھا، دکھ درد کے ایامِ تلخ کافور ہو گئے تھے اور اولاد اعترافِ جرم کے بعد طلبِ معافی کی خواستگار تھی تو پدرانہ شفقت کے تحت باپ نے ان کی درخواست منظور فرما لی، مگر فوراً دعا کرنے کی بجائے وعدہ فرمایا کہ میں جلد ہی تمھارے لیے دعائے مغفرت کروں گا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ تاخیر اس لیے فرمائی کے سحری کے وقت بعد از تہجد دعا فرمانا چاہتے تھے، ایک قول یہ بھی ہے کہ جمعہ کی رات کو دعائے استغفار کرنا چاہتے تھے۔ ایک یہ بھی قول ہے کہ مظلوم کی رائے لیے بغیر ظالم کو کسی اور کا معاف کر دینا بھی محل نظر ہے۔ ابھی تک یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کا قول ﴿ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ﴾ نہیں پہنچا تھا۔ سو انھوں نے کہہ دیا کہ میں عنقریب تمھارے لیے دعا کروں گا۔

دعا کی بالخصوص قبولیت کے کچھ اوقات ہیں اور کچھ جگہیں بھی ہیں جہاں دعا کی قبولیت حدیث سے ثابت ہے۔ ویسے تو ہر وقت ہی اللہ سنتا ہے اس لیے کہ وہ سمیع بھی ہے، علیم بھی ہے اور بصیر بھی، ارشاد ربانی ہے:

﴿ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ﴾ [البقرة : ١٨٦]

''میں پکارنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔''

تہجد کا وقت اور جمعے کا روز بھی دعاؤں کی قبولیت کا وقت ہے۔ اذان اور اقامت یعنی تکبیر کا درمیانی وقفہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق قبولیت دعا کا وقت ہے۔'' روزہ رکھا ہو تو افطاری کا وقت بھی دعا کی قبولیت کا وقت ہے، بارش ہو رہی تو یہ بھی قبولیت کے اوقات میں سے ہے اور جب کفر کے ساتھ بڑی سخت لڑائی جاری ہو تو یہ شدید معرکے کا دورانیہ بھی قبولیت کے اعتبار سے وقتِ دعا ہوتا ہے۔

جمعے کے روز ایک خاص گھڑی ہوتی ہے، اس میں دعا کی جائے تو رب العزت رد نہیں فرماتا۔ دعا تو کرتے ہی رہنا چاہیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے، یہ جتنے اوقات ہیں ان میں دعا ضرور کرنی چاہیے۔ دعا تو مومن کا ہتھیار ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:

((اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ)) [مستدرك حاكم : ١/٤٩٢، ح : ١٨١٢]

''دعا مومن کا ہتھیار ہے۔''

مومن دعا کی اہمیت سے کبھی غافل نہیں ہوتا، دعا عبادت کا مغز ہے، دعا مومن کا سہارا اور اس کا ہتھیار ہے ایک روایت میں ہے کہ دعا ہی عبادت ہے، تو وہ لوگ جن کے مقابلے کفر سے جاری ہوں۔ وہ جن پر راہیں بند ہوں اور رکاوٹیں شدید ہوں۔ جہاد کے راستے اور دعوت کے میدان کی صعوبتیں اور دشواریاں ہوں تو ایسے لوگوں کا سب سے بڑا سہارا دعا ہی ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دعا کا یہ طریقہ نہیں جو ہمارے ہاں مروج ہو گیا ہے کہ جونہی سلام پھرا، امام صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور ساتھ ہی مقتدیوں نے بھی آمین کہنا شروع کر دی۔ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں، پھر اس میں عجب کیفیت دکھائی دیتی ہے، توجہ کہیں اور ہے دل و نگاہ میں تصورات جانے کیا ہیں مگر آمین کہی جا رہی ہے۔ پھر سلام کے فوراً بعد یہ سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے جو ایک تو اس لیے مناسب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں دوسرا اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ ذکر اور وظائف رہ جاتے ہیں جو نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ سے پوری طرح ثابت ہیں، یہ ہمیشہ ہی ہوتا ہے یعنی بدعت جہاں آتی ہے وہ لازماً کسی سنت کی جگہ لے لیتی ہے پھر لوگ سنت کو فراموش کر دیتے ہیں اور بدعت پھیلنے لگتی ہے۔ نماز کے بعد دعا کرنا بدعت نہیں ہے۔ خاص ضرورت کے تحت کر لی جائے تو کوئی حرج نہیں البتہ ہر نماز کے بعد اس کو لازم کرنا اور ہاتھ نہ اٹھانے والے کو دعا کا تارک کہنا درست نہیں۔ کسی عمل کو لازم قرار دینے کے لیے شرعی دلیل چاہیے جبکہ نبی ﷺ سے نماز کا سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا اور صحابہ کا بھی ہاتھ اٹھا کر دعا میں شامل ہونا اجتماعی کیفیت پیدا کر کے دعا کا اہتمام ثابت نہیں۔ بعض لوگ اجتماعی دعا کو نماز با جماعت کا حصہ قرار دیتے ہیں یہ بدعت ہے کیونکہ وہ اس کے بغیر نماز کو مکمل ہی نہیں سمجھتے۔ شریعت میں یہ کام نیا ہے۔ اگر نبی ﷺ کے بعد کوئی شخص چاہے عالم ہی کیوں نہ ہو اپنی طرف سے تعیین

کرے گا تو بدعت ہوگی۔

ہمیں ہر معاملے میں پیروی سیدالابرار ہی کی کرنی چاہیے۔ اپنی خواہشات، اپنے خیالات یا اپنے علماء کے نظریات کی ہرگز نہیں، اس لیے کہ جس کا کلمہ پڑھا ہو پیروی اسی کی کی جاتی ہے۔

بہرحال سیدنا یعقوب علیہ السلام نے وعدہ فرمالیا کہ میں تمھارے لیے دعا کروں گا اور ساتھ ہی انھیں امید دلائی کہ اللہ ضرور معاف فرما دے گا، اس لیے کہ وہ بڑا بخش دینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

❁❁❁

والدین کی تکریم اور امن کی ضمانت

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰۤى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾

”پھر جب وہ یوسف کے پاس داخل ہوئے تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی اور کہا مصر میں داخل ہو جاؤ، امن والے، اگر اللہ نے چاہا۔“

بشارت دینے والے نے جہاں قمیصِ یوسف کو چہرۂ یعقوب پہ ڈالا، جہاں یوسف کے حیات ہونے اور شاہِ مصر بن جانے کی خبریں سنائیں، وہیں سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی سنایا کہ آپ سب لوگوں کو وہ مصر بلا رہے ہیں۔ چنانچہ سیدنا یعقوب علیہ السلام اور آلِ یعقوب سب تیار ہو کر عازمِ مصر ہوئے۔ ادھر سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور خاندان کے استقبال کے لیے مصر کی سرحد پر انتظار فرمایا۔ چنانچہ وہیں جہاں ان دو ملکوں کی سرحدیں، ملتی تھیں، یہ بچھڑا خاندان بھی جا ملا۔ مفسرین کی صراحت کے مطابق سیدنا یوسف علیہ السلام نے نہایت پرتپاک اور شایانِ شان استقبال کیا، چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے باپ کی خدمت میں گزارش کی کہ والدِ گرامی اب وہ رنج وکلفت کے دن تمام ہوئے۔ چنانچہ اب خوف و اندیشے تصور

سے جھٹک دیجیے اور نہایت امن و اطمینان اور سکون و راحت کے ساتھ مصر میں داخل ہو جائیے۔ اب یہاں ان شاء اللہ نہ سابقہ جدائی کے رنج و محن کا شائبہ ہے اور نہ قحط سالی و خستہ حالی کا کوئی اندیشہ۔ نہ چوری چکاری کا ڈر ہے اور نہ تلفِ اموال کا خوف ہے، سو آپ نہایت اطمینانِ قلب اور کشادہ دلی سے تشریف لائیے۔

آج سیدنا یعقوب علیہ السلام پر مصر کی سرحد کشادہ کر دی گئی ہے اور انھیں ہر پابندی سے مستثنیٰ قرار دے کر خوش آمدید کہا جا رہا تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہر تنگی اور تکلیف کے بعد آسانی اور فراوانی آیا کرتی ہے۔ تکلیفوں کے بعد آرام اور راحت ضرور نصیب ہوا کرتی ہے آزمائش سے اللہ عافیت دے، مگر آ جائے تو استقامت کی دعا کرنی چاہیے اور ایک اچھے انجام کی امید میں ایسے وقتِ ابتلا کو گزارنا چاہیے، اس بات پر کامل یقین رکھتے ہوئے کہ اس صبر و رضا پر اللہ رب العزت ضرور کشادگی اور آسانی کی جزا سے نوازے گا، رب کا وعدہ ہے۔

﴿ فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ۝ إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا ﴾ [الانشراح : ٥، ٦]

''پس بے شک ہر مشکل کے ساتھ ایک آسانی ہے۔ بے شک اسی مشکل کے ساتھ ایک اور آسانی ہے۔''

❀❀❀

خواب حقیقت بن گیا

وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝١٠٠

''اور اس نے اپنے ماں باپ کو تخت پر اونچا بٹھایا اور وہ اس کے لیے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے اور اس نے کہا اے میرے باپ! یہ میرے پہلے کے خواب کی

تعبیر ہے، بے شک میرے رب نے اسے سچا کر دیا اور بے شک اس نے مجھ پر احسان کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا اور تمھیں صحرا سے لے آیا، اس کے بعد کہ شیطان نے میرے درمیان اور میرے بھائیوں کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ بے شک میرا رب جو چاہے اس کی باریک تدبیر کرنے والا ہے، بلاشبہ وہی سب کچھ جاننے والا، کمال حکمت والا ہے۔"

شاندار استقبال کے بعد یوسف علیہ السلام نہایت تکریم اور بہت احترام کے ساتھ اپنے والدین کو شاہی محل میں لے گئے اور وہاں نہایت قدر افزائی کے ساتھ انھیں تخت شاہی پر متمکن کر دیا۔

والدین کا مقام اس قدر رفیع الشان ہے کہ اولاد خواہ کیسے ہی عہدہ و مقام پر فائز ہو جائے والدین کا حق اس سے کسی صورت ساقط نہیں ہوتا۔ والدین کا مقام ہے ہی اتنا زیادہ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ﴾ [بنی إسرائیل : ۲۳]

"یعنی والدین کو اُف نہ کہو اور انھیں اکیلے بھی نہ چھوڑو۔"

یہاں ہمارے ہاں اولاد پڑھ لکھ جاتی ہے اور جب مختلف عالیشان مناصب پر پہنچ جاتی ہے تو وہ ان پڑھ والدین کو تحقیر کا نشانہ بنانے لگتی ہے اور اللہ معاف فرمائے بعض تو ایسے جاہل ہوتے ہیں جو سادہ دیہاتی والدین کو اپنے دوستوں کے سامنے والدین کہہ کر متعارف کروانے میں بھی اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔ یہ نہایت مکروہ اور ناپسندیدہ طرزِ عمل ہے اور کبیرہ گناہ، اولاد جہاں پہنچ جائے والدین کا حق اسی طرح ان پر واجب رہتا ہے۔ یہاں سیدنا یوسف علیہ السلام کا طرزِ عمل بھی اسی کی دلیل اور اسی کا عکاس ہے۔

تو یاد رکھنا چاہیے کہ آدمی کچھ بھی بن جائے، اسے کتنا ہی اعلیٰ مقام مل جائے تو اسے والدین کے حضور پہلو جھکائے اور نرم رویہ اپنائے رہنا چاہیے۔ دیکھیے سیدنا یوسف علیہ السلام سے بڑھ کر اب کسی کو کیا مقام ملے گا۔ اللہ رب العزت نے سحر انگیز شخصیت دی، نبوت کی نعمت دی اور مصر کے تخت کا وارث بنا دیا، اس کے باوجود وہ والدین کے کتنے فرمانبردار ہیں۔ کہہ رہے ہیں کہ ابا جان، مجھے اللہ تعالیٰ نے اس تخت پر بٹھایا ہے تو میں آپ کو بھی اس تخت پر بٹھاتا ہوں۔

یہاں قرآن مجید نے یہ بتایا کہ یوسف علیہ السلام نے والدین کو تخت شاہی پر رونق افروز کیا، تو کیا ان کی والدہ ابھی حیات تھیں؟ کچھ مفسرین اسی کے قائل ہیں کہ والدہ ابھی زندہ تھیں مگر ایک رائے یہ ہے کہ بنیامین کی ولادت کے موقع پر وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھیں، بعدازاں سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی خالہ سے نکاح فرما لیا تھا اور یہاں والدہ کے قائم مقام ہونے کے باعث انھی کو والدہ کا درجہ دیتے ہوئے والدین کا لفظ بولا گیا ہے۔

جب والدین کو نہایت قدر و احترام اور شان و شوکت کے ساتھ تخت شاہی پر براجمان کر دیا تو ادھر ہمیشہ یوسف کی قدر گھٹانے والے بھائی اس کی شان اور دبدبہ سے اس قدر سحر زدہ اور مرعوب ہوئے کہ بے اختیار سجدے میں گر گئے، اب یہ وہی منظر بن گیا تھا ٹھیک چالیس یا اسی سال پہلے جو اک شب سیدنا یوسف علیہ السلام نے دیکھا تھا، وہی منظر جسے قرآن مجید با ایں الفاظ بیان کیا تھا:

﴿ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ﴾ [یوسف : ٤]

''میں نے خواب میں گیارہ ستارے، سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔''

وہ منظر جس کی تاب نہ لا کر بھائیوں کے حسد نے کیا کیا گل کھلائے تھے مگر آج وہ خود اس منظر کا حصے تھے۔ کل جس منظر سے انھیں کراہت تھی آج بخوشی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور تب سیدنا یوسف علیہ السلام نے اسی دیرینہ خواب کو یاد کیا اور اپنے باپ کو بھی یاد دلایا:

« یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ » یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ یہ سجدۂ عبادت نہ تھا سجدہ تعظیمی تھا۔ جو پہلی بعض شریعتوں میں جائز تھا اور اب اس کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

ایسا کئی معاملات میں ہوا ہے، بعض چیزیں پہلی شریعتوں میں جائز تھیں، اب ان کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ مثلاً سیدنا آدم علیہ السلام کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا مگر اب نہیں۔ اب کوئی اس کو دلیل نہیں بنا سکتا، اس طرح سجدہ تعظیمی بھی جب منع ہو گیا تو یہ دلیل نہیں بن سکتا۔ یہاں یہ بات جان لینا چاہیے کہ دراصل 'توحید' رب کے حکم کی فرمانبرداری کا

نام ہے۔ جس چیز کا رب حکم دیں اسے کرنا اور جس سے منع فرما دیں اس سے رک جانا ہی توحید ہے۔ مثلاً آپ دیکھیں شیطان کو حکم تھا کہ وہ آدم کو سجدہ کرے۔ اب یہاں سجدہ کرنا توحید تھا تو اصل چیز رب کے حکم کی اطاعت ہے۔ بس سر جھکایا ہوا ہو کہ جو بھی حکم ہو گا اسے ماننا ہے، اپنی قیاس، اپنی رائے اور اپنی عقل کو بیچ میں لائے بغیر، بس اطاعت کی تصویر بن جانا بندگی اور اطاعت ہے۔

اب جب خواب کی تعبیر سامنے آ گئی اور یوسف کو رب کی عطا کردہ رفعتِ شان کے سامنے اپنوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا تو چند باتیں تھیں جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے والدین اور بھائیوں کے گوش گزار کیں، دراصل اس گفتگو میں نہایت بلیغ اختصار کے ساتھ پوری داستانِ یوسف کی سرگزشتِ مصائب سمٹ آئی ہے۔

اگر ہم دیکھیں تو سیدنا یوسف علیہ السلام کے مصائب کی داستان تین حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے:

① بھائیوں کی طرف سے پہنچنے والے مصائب۔ ② محبوب والدین سے طویل جدائی۔

③ قید خانے کی دردناک زندگی۔

سیدنا یوسف علیہ السلام وہ تھے کہ جنھیں اللہ رب العزت نے گفتگو کا سلیقہ دیا تھا اور حرمتِ حرف کا شعور بخشا تھا، پھر وہ اک ایسے انداز کریمانہ سے مالا مال تھے کہ جس میں دوسروں کے دل دکھانے سے ہر صورت اجتناب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس فن میں کمال عظمت ملاحظہ کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے واقعات ذکر کرنے میں ترتیب تبدیل فرما دی، یعنی بھائیوں کے جور و ظلم سے آغاز فرمانے کی بجائے اپنی قید خانے کی زندگی سے گفتگو کا آغاز کیا دوسرا ایک نبی اور صالح شخص کی یہ ادا بھی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ سخت ترین حالات میں بھی شکر کے پہلو کس طرح تلاش کر لیتا ہے۔ یعنی قید خانے کا ذکر تو کیا مگر اس دور کی اذیتوں کو دہرانے کی بجائے رب کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے قید خانے سے آزادی عطا فرمائی۔

یہاں یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ قید خانے سے نجات کا تو ذکر کیا مگر کنویں سے آزادی کا ذکر نہیں کیا، تاکہ بھائیوں کو شرمندگی نہ ہو، دراصل وہ پہلے انھیں کہہ چکے تھے:

«لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ» اب آپ لوگوں پر کوئی ملامت نہیں، چنانچہ محض اعادۂ کلام میں بھی اور صرف برائے تذکرہ بھی آپ نے کنویں کا ذکر نہیں فرمایا۔

اب ذکر تھا والدین سے طویل فرقت کا تو اس میں بھی صرف خوش کن انجام پر اور رب کا شکر کرنے پر اکتفا کیا، یعنی یوں کہ اللہ کن صحراؤں سے ہمیں ایک متمدن اور مہذب شہر میں لے آیا، برسوں کے بچھڑوں کو ایک دوسرے کے ملاپ سے شاد کام کیا۔ دیہات کی سخت اور پر مشقت زندگی کی بجائے شہر کی سہولیات سے بہرہ ور فرمایا اور شاہی اعزازات مقدر فرما دیے۔

اب تیسرے نمبر پر اس چیز کو ذکر کیا جو واقعاتی اعتبار سے پہلے آتی تھی مگر حسنِ اخلاق اور عفو و درگزر کے باعث اس کا ذکر مؤخر کر دیا تھا۔ اب جو ذکر بھی کیا ہے تو بھائیوں کو الزام نہیں دیا، کہا کہ شیطان نے بھائیوں سے یہ سب کروا دیا وگرنہ وہ تو ایسے نہ تھے اور اس طرح یوسف علیہ السلام نے ساری تکلیفیں سہہ لیں مگر کسی کے دل کو آزردہ نہیں کیا۔

اخلاق کریمہ کا یہی تقاضا ہے کہ جب صلح کر لی جائے تو دل پوری طرح صاف ہو جائے پھر بات بے بات طنز و تشنیع اہل وفا کا شیوہ نہیں ہوتا۔ یہی کردار ہمیں بھی اپنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

«إِنَّ رَبِّي لَطِيفٌ لِّمَا يَشَاءُ»: یعنی اللہ تعالیٰ بڑے لطف و کرم والا ہے۔ اس کی تدبیر جاننا اور سمجھنا انسانوں کے بس میں نہیں ہوتا، کبھی بظاہر حالات بڑے کڑے ہوتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے سب حالات کو انسانوں کے موافق کر دیتا ہے۔ یہاں اس خاندان کی داستان پر غور کیجیے، کیسے سخت حالات تھے، بظاہر ملنے کے آثار نہ دکھائی دیتے تھے مگر یہ لطف و کرم والے اللہ کی باریک بینی ہے کہ انھی حالات میں سے میل ملاقات کی راہیں یوں نکالیں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔

ہم نے بہت سے بھائیوں کو دیکھا ہے کہ وہ دشمن کی جیلوں سے رہائی پا کر اپنے بھائیوں میں واپس آ گئے ہیں۔ بظاہر کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی لیکن اللہ کی رحمت اور نصرت سے ایسا ہوا۔ اس سے سبق ملتا ہے کہ مشکلات میں مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اللہ پر توکل کر

کے دعائیں جاری رکھنی چاہییں۔ اللہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ محض اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب رب پر تکیہ ہونا چاہیے۔

❀❀❀

مصیبت پر صبر، نعمت پر شکر!

رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

”اے میرے رب! بے شک تو نے مجھے حکومت سے حصہ دیا اور باتوں کی اصل حقیقت میں سے کچھ سکھایا، آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا یار و مددگار ہے، مجھے مسلم ہونے کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔“

ان الفاظ پر قرآن مجید سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصہ کا اختتام کرتا ہے۔ اب ایک طویل مدت کی جدائی اور اس کی کوکھ سے جنم لیتے پر درد واقعات انجام کو پہنچے ہیں۔ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے مل گیا۔ ساری مشکلات اور سارے مصائب راحت و آرام میں ڈھل گئے ہیں۔ باپ بیٹے کے ہمراہ ہے اور بیٹا مصر کی عظیم الشان سلطنت کا حکمران ہے۔ سارا خاندان آرام و سکون سے اپنے شب روز بتا رہا ہے تو سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے رب کے حضور دعا کرتے ہیں۔ یہ ایک مرد مومن اور دانا شخص کی علامت ہے کہ وہ خوشحالی اور بدحالی دونوں میں رب کو یاد رکھتا ہے۔ وہ آزمائش میں تو رب کو پکارتا ہی ہے آسائش میں بھی کبھی اپنے پروردگار کو فراموش نہیں کرتا، عیش ہو کہ طیش ہر دو حالتوں میں رب کے نیک بندے اپنے رب کو یاد رکھتے ہیں اور جبین نیاز اسی کے در پر جھکائے رکھتے ہیں۔ ساری سرگزشتِ یوسف گواہ ہے کہ مصائب کے اس پورے دورانیے میں کہیں سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے رب کو فراموش نہیں کیا، اب دیکھ لیجیے کہ جب تمام تر غم و فکر کے بادل چھٹ گئے اور آسائش کا چاند طلوع ہو گیا تو پھر بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کے دست اپنے رب کے حضور دعا کے لیے دراز ملتے

ہیں۔ یہی اللہ کے مخلص بندوں کی صفت ہے۔

دعا کا سلیقہ یہ ہے کہ پہلے جس سے مانگنا ہے اس کی تعریف کی جائے۔ یہی ترتیب سورۃ الفاتحہ میں بھی ملتی ہے تو سیدنا یوسف علیہ السلام پہلے اپنے پروردگار کی تعریف بجالاتے ہیں۔ اس کے احسانات کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اے رب تو نے مجھے مصر کا حکمران بنا دیا ہے یہ ایک بہت بڑی مادی نعمت ہے۔ پھر روحانی نعمتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔فہم وبصیرت دی ہے اور اے میرے رب! یہ ساری سلطنتیں،حکومتیں، اقتدار اور اختیار لے کر بھی میں یہی کہتا ہوں کہ تو ہی میرا دوست،تو ہی میرا کارساز اور تو ہی میرا سرپرست ہے۔ دنیا میں بھی تو ہی ہے اور آخرت میں بھی تیرے سوا کوئی غمخوار نہیں، اب استدعا یہ ہے کہ خاتمہ بالخیر فرمانا، حالتِ ایمان ہی میں فوت فرمانا اور اپنے نیک بندوں کے گروہ میں شامل فرمالینا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہاں رب سے یہ دعا فرمائی۔ یہ دعا ہمیں بتاتی ہے کہ ایک مومن ہمیشہ معاملات کے انجام پر نظر رکھتا ہے۔ وہ دنیاوی اعزازات وآسائشات کے جتنے بھی گھیراؤ میں ہو،موت کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ دنیا کی رغبتیں اور راحتیں اس سے کبھی اس کے انجام کی فکر چھین نہیں سکتیں، اسے مصر کا تاج وتخت بھی میسر آ جائے تو وہ اپنی موت کو یاد رکھتا ہے۔ رب سے گہرا تعلق رکھتا ہے اور اپنے خاتمہ بالایمان کیلئے اللہ کے حضور ہمیشہ گڑگڑاتا رہتا ہے۔

❀❀❀

اللہ کا رسول اللہ ﷺ سے خطاب

ذٰلِكَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهِ اِلَيۡكَ‌ۚ وَمَا كُنۡتَ لَدَيۡهِمۡ اِذۡ اَجۡمَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ وَهُمۡ يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾

’’یہ غیب کی کچھ خبریں ہیں، جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو ان کے پاس نہ تھا جب انھوں نے اپنے کام کا پختہ ارادہ کیا اور وہ خفیہ تدبیر کر رہے تھے۔‘‘

قصہ کی شانِ نزول میں ہم نے دیکھا کہ سورۂ یوسف مکہ کے چند لوگوں کے مطالبہ کے

جواب میں نازل ہوئی تھی، اہل مکہ نے یہودیوں کی شہ پر رسول اللہ ﷺ کو عاجز کر دینے کی نیت سے ایک منصوبہ بنایا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے آل یعقوب کے مصر آنے کے بارے میں پوچھیں تو یہاں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما کر انھی لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے اور آپ کی نبوت کی صداقت پر نا قابل تردید دلائل مہیا فرمائے جا رہے ہیں کہ یہ وہ قصہ ہے جو جب پیش آ رہا تھا، جب برادرانِ یوسف اس سازش کے تانے بانے بن رہے تھے۔ جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف یہ منصوبے بن رہے تھے، تب آپ تو وہاں نہ تھے۔ آپ کو تو اس کا بالکل پتا نہ تھا، چونکہ آپ نہ جانتے تھے اور نہ وہاں موجود تھے تو اسی بات نے تو ان سوال کرنے والوں کو اکسایا کہ وہ آپ سے پوچھیں۔ کیوں کہ انھیں تو خوب علم ہے کہ آپ نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی، کسی مکتب، کسی مدرسہ میں نہیں پڑھا، کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیے، سابقہ کتبِ سماوی یا کتب تاریخ مطالعہ نہیں فرمائیں۔ جب یہ طے ہے کہ آپ غیب نہیں جانتے، کہیں سے آپ نے یہ پڑھا بھی نہیں اور نہ سنا ہی تھا پھر اس کے باوجود جب یہ سب قصہ صحیح صحیح بتا دیا تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ سچے نبی ہیں، چنانچہ ہم نے آپ کی صداقت ان بدبختوں پر عیاں کرنے کے لیے پوری سورت نازل فرما دی ہے۔ آپ وہاں نہ تھے مگر ہم نے لمحہ بہ لمحہ رپورٹ آپ کے سامنے بیان کر دی۔

برادرانِ یوسف کے مکر و فریب سے بھری سازش کے تمام پہلو آپ کے سامنے عیاں کر کے ان اہل مکہ کی سازش کے تار و پود بکھیر کے رکھ دیے ہیں، تاکہ اہل مکہ بھی جان لیں، عیسائی بھی جان لیں، بلکہ کل اہل کائنات کو خبر ہو جائے کہ آپ غیب نہیں جانتے نہ وہاں حاضر تھے نہ ناظر، بلکہ آپ تو رب کے سچے نبی ہیں اور آپ کی طرف وحی نازل ہوتی ہے اور یہی ایک نبی کی شان ہے۔ وہ سچی شان جو رب عطا فرماتا ہے وہ جھوٹی شان نہیں جو لوگ قائم کرنا چاہتے ہیں۔

دیکھیے اس آیت مبارکہ کو لا کر رب کائنات نے ان تمام عقائد کا بطلان فرما دیا جن کے

تحت گمراہیاں عام کی جاتی ہیں۔ نبی ﷺ کو عالم الغیب ثابت کیا جاتا ہے۔ کبھی علم غیب ذاتی اور علم غیب عطائی کی تقسیم کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ کبھی رسول اللہ ﷺ کو حاضر و ناظر قرار دیا جاتا ہے۔ مگر یہ سب عقائد قرآن سے نہیں لیے گئے بلکہ قرآن سے شریعت کی اصلی فکر سے متصادم ہیں۔ یہ سب لوگوں کی گھڑی ہوئی باتیں اور خود تراشیدہ افسانے ہیں۔ اصل بات تو قرآن کی بات ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے ماسوا کوئی غیب نہیں جانتا، نبی بھی نہیں اور ولی بھی نہیں۔ قرآن مجید کا فیصلہ ہے:

﴿ قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴾ [النمل : ٦٥]

''کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

قرآن مجید، سورۃ الکھف میں ہمیں بتاتا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کچھ دریافت کیا، رسالت مآب نے جواب دیا کل بتا دوں گا۔ خیال تھا کہ وحی سے خبر ہو جائے گی تو پوچھنے والوں کو مطلع فرما دیا جائے گا۔ مگر یہاں رسولِ رحمت 'ان شاء اللہ' کہنا بھول گئے۔ اللہ رب العزت کی نبی کی تربیت ہر آن رو بہ عمل رہتی ہے۔ اب وحی کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ لوگ پوچھتے ہیں مگر نبوت کے لب خاموش ہیں۔ رسول پریشان ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ وحی کیوں نہیں آئی، لوگ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں مگر رسول اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہتا، پھر وحی آ گئی اور سوالوں کا جواب دے دیا گیا مگر یہ بھی بتا دیا گیا کہ:

﴿ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۝ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ۡ ﴾

[الکھف : ٢٣، ٢٤]

''اور کسی چیز کے بارے میں ہرگز نہ کہہ کہ میں یہ کام کل ضرور کرنے والا ہوں۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔''

آئندہ کبھی یہ نہیں کہنا کل بتاؤں گا، یہ کہنا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو پھر کل بتاؤں گا، خبر

مل جائے گی تو پھر بتاؤں گا۔ جب تک آپ ان شاء اللہ نہیں کہیں تب تک کل کے بارے میں کچھ نہ کہیں، یہ آپ پر پابندی ہے۔ یہ سبق ہمارے لیے بھی ہے۔ ہمیں بھی ان شاء اللہ کو خود پر لازم کرنا ضروری ہے۔ بہر حال بات عقیدے کی ہو رہی تھی قرآن سے میسر آنے والا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء کو غیب کا علم نہیں ہوتا۔

آپ نے سورۂ یوسف دیکھی، یہاں سارے حالات و واقعات سیدنا یعقوب علیہ السلام کو علم غیب ہونے کی نفی کرتے ہیں، سیدنا یوسف علیہ السلام کے علم غیب کی نفی کرتے ہیں، اب یہاں قصے کے آخر میں واضح آیت لا کر بتا دیا گیا کہ اے سردارِ رسل! آپ بھی غیب نہیں جانتے ...... قرآن مجید کھول کھول کر یہ وضاحتیں فرما رہا ہے۔ مگر آج کا مسلمان کب مانتا ہے؟ اس کا تو عقیدہ ہے کہ انبیاء ہی نہیں، پیروں کو بھی، بلکہ یہاں تو پیروں کی بلیوں کو بھی غیب کا علم ہوتا ہے۔ العیاذ باللہ!

یہ لوگ سمجھتے ہیں، اس سے نبی کی عظمت ثابت ہوتی ہے؟ ہر گز نہیں ہمارے ثابت کرنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا، عظمت وہی ہے جو رب دے، اسی کے دینے سے ملتا ہے اور اسی کے ثابت کرنے سے ثابت ہوتا ہے اور وہ وہی ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا، وہ نہیں جو ہماری فکر کا نتیجہ ہے اور جو قرآن سے متصادم ہے۔ نبی کی عظمت یہ ہے کہ اس کے پاس وحی آتی ہے۔ وحی کے ذریعے نبی کو سارا علم دیا جاتا ہے۔ علم غیب صرف اللہ کا خاصہ ہے۔

❁❁❁

اکثریت کی نفسیات پر قرآنی تبصرہ

وَمَآ أَكْثَرُ ٱلنَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٣﴾

''اور اکثر لوگ، خواہ تو حرص کرے، ہر گز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ سے خطاب جاری ہے۔ رسول رحمت کو تسلیاں، دی جا رہی ہیں، حقائق بتائے جا رہے ہیں۔ تبلیغ دین کے سلسلے میں آپ کی خواہشات و مساعی جمیلہ کا اعتراف کیا جا

رہا ہے، سراہا جا رہا ہے مگر ساتھ ہی لوگوں کی نفسیات بتائی جا رہی ہیں کہ اے پیغمبر! آپ نے انھیں یہ قصہ سنا دیا، اب دل میں یہ ہے کہ اب تو یہ ایمان لے آئیں گے، ان کا مطالبہ تو پورا کر دیا گیا، دلائل تو مہیا فرما دیے گئے سو اب تو انھیں ایمان لانا چاہیے، یہ آپ کی خواہش ہے۔ آپ لوگوں کی ہدایت کی شدید حرص رکھتے ہیں۔ ہر آن آپ کو یہی فکر کھائے جاتی ہے۔ دل و دماغ میں یہی تاثر جاگزیں رہتا ہے کہ یہ بھی مسلمان ہو جائے، وہ بھی ایمان قبول کر لے۔ سارے لوگ جنت میں چلے جائیں، کوئی جہنم کی کھائی میں نہ گرے رسول کی تو یہ کوشش ہوتی ہے اور وہ اس سلسلے میں بڑا فکر مند اور حریص ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴾ [التوبۃ : ١٢٨]

”بہت حرص رکھنے والا ہے، ایمان والوں پر بہت شفقت کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔“

مگر رب کا قرآن رسول اللہ ﷺ کو بتا رہا ہے کہ آپ کی اس شدید محنت، خواہش اور حرص کے باوجود اکثر لوگ ایمان قبول نہ کریں گے۔ آپ کی خواہش بجا اور قابل احترام مگر ان کی سرکش طبیعت کو رب بہت جانتا ہے چنانچہ آپ کی خواہش کے باوجود نہ مانیں گے۔ دراصل آپ کا منصب یہ ہے کہ آپ راہِ ہدایت دکھا تو سکتے ہیں، اس پر دلائل لا کے اسے نہایت واضح تو فرما سکتے ہیں مگر:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ [القصص:٥٦]

یہاں وہ لوگ بھی ہیں، اپنے تئیں رسول اللہ ﷺ کے سچے عاشق اور پکے محبّ، جو نبی کو حاضر ناظر اور عالم الغیب کے بعد مختار کل بھی ثابت کرتے ہیں جبکہ قرآن مجید یہاں ان کی اس ٹیڑھی فکر کی بھی اصلاح کر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں رسول تمام اختیارات کا مالک ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اے نبی! آپ خواہش کریں، کوشش کریں تب بھی یہ سارے لوگ

ایمان نہ لائیں گے۔ یہ نہیں ماننے والے، اکثریت نہیں مانا کرتی، رسولوں کے پیروکار تو تھوڑے ہی ہوتے ہیں، چنانچہ:

﴿ وَمَآ اَكۡثَرُ النَّاسِ وَلَوۡ حَرَصۡتَ بِمُؤۡمِنِيۡنَ ﴾

''اور اکثر لوگ، خواہ تو حرص کرے، ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

❀❀❀

بے لوث داعی، بے مثال دعوت!

وَمَا تَسۡـَٔلُهُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۰۴﴾

''حالانکہ تو ان سے اس پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا۔ یہ تو جہانوں کے لیے ایک نصیحت کے سوا کچھ نہیں۔''

یہاں بتایا جا رہا ہے کہ آپ منکرین کے رویے سے پریشان خاطر نہ ہوں۔ اگر انھوں نے ماننا ہوتا تو پھر ان کے لیے دلائل کیا کم تھے۔ جو ماننے والے ہوتے ہیں وہ معجزات طلب نہیں کیا کرتے، وہ ہٹ دھرمی کی راہ نہیں چلتے، وہ تو ایک ہلکے اشارے سے سب جان لیتے ہیں اور پھر ایک لمحہ تامل کیے بنا مان لیتے ہیں۔ اب کیا یہ نہیں دیکھتے کہ آپ انھیں جو منوانا چاہتے ہیں اس میں آپ کا مفاد ہی کیا ہے؟ آپ ان سے کسی دنیاوی چیز کا سوال تو نہیں کرتے، کوئی اجر اور کوئی مزدوری نہیں مانگتے کسی منصب وعہدہ اور کسی عزت و وقار کا سوال نہیں کرتے، آپ کی دعوت تو ایک بے طمع اور بے حرص دعوت ہے۔ یہ دعوت دنیاوی مطالبات اور مفاد پرستی پر مبنی سوالات سے قطعی پاک دعوت ہے۔ اگر یہ سوچتے تو ان کے ایمان لانے کے لیے یہی بات ہی کافی تھی۔

یہ بات جو یہاں رسول اللہ ﷺ کے متعلق بتائی جا رہی ہے کم و بیش سب انبیاء نے اپنی قوم سے کہی ہے۔ دراصل یہ ایک سچے داعی کا وصف ہے کہ وہ اپنی دعوت کے عوض کبھی دنیاوی مفادات ملحوظ نہیں رکھتا۔ وہ ہمیشہ اپنے رب سے سوال کرتا ہے ہمیشہ اسی سے مانگتا

ہے۔ دراصل دعوت وہ بیش بہا اور انمول کام ہے جس کا صلہ دنیا والے دے ہی نہیں سکتے۔ اس کی مزدوری دنیا کا کوئی سا بھی انعام یا معاوضہ بن ہی نہیں سکتا۔ اس کام کی فضیلت رب ہی جانتا ہے اور اس کے شایانِ شان معاوضے سے وہی ہمیں نواز سکتا ہے۔ سو ایک سچا داعی کبھی ذہن میں دنیاوی مفادات نہیں رکھتا۔ وہ ذہن میں ایک ہی بات رکھتا ہے کہ وہ یہ سب اپنے رب کے لیے کر رہا ہے اور اسی سے اس نے اس کا اجر لینا ہے۔

ایمان لانے کے لیے ایک تو یہ بات بھی کافی تھی کہ نبی ان سے کچھ نہیں مانگتا، پھر یہ قرآن مجید تو خود ایک نصیحت ہے، فرمایا:

﴿ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾

جو سارے جہان کے لیے نصیحت ہے۔ ماننے والوں کے لیے اس میں دلائل کیا کم ہیں؟ یہ تو اک جہانِ دلائل ہے۔ اس میں تو توحید کے دلائل کا ایک سمندر موجزن ہے۔ رب کا تعارف وتعریف ہے، اس کی قدرت وحکمت کے دلائل ہیں اور یہ تو ایسا جامع بیان ہے جو ساری کائنات کے لیے ایک کھلی دعوت ہے مگر یہ لوگ نصیحت لیتے ہی کب ہیں۔

یہ مطالبات کے عادی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں، جو ماننے کے لیے نہیں عاجز کر دینے کی نیت سے سوال کرتے ہیں۔ سو دل تنگ مت کیجیے۔ دعوت کا کام کیجیے اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیجیے۔

❀❀❀

اہل تسلیم کے لیے دلائل کم نہیں

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۱۰۵

’’اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے گزرتے ہیں اور وہ ان سے بے دھیان ہوتے ہیں۔‘‘

دیگر آیات ونشانیوں کے ساتھ ساتھ سورۂ یوسف بھی ان کے لیے ایمان لانے کی ایک

علامت، ایک نشانی اور ایک دلیل ہو سکتی تھی مگر یہ تو وہ لوگ ہیں جو روزانہ آسمان وزمین میں توحید الٰہی اور قدرت الٰہی کی ان گنت علامتیں دیکھتے ہیں۔ دلائل ملاحظہ کرتے ہیں مگر اندھوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ کیا یہ بغیر ستونوں کے آسمان نہیں دیکھتے اور کیا نہیں سوچتے کہ یہ کس بے پناہ طاقت کا ایک محیر العقول کارنامہ ہے؟ کس نے بنایا ہے یہ آسمان در آسمان:

﴿ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ۟ۙ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ﴾ [الملك : ۲،۳]

''وہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے اور وہی سب پر غالب، بے حد بخشنے والا ہے۔ وہ جس نے سات آسمان اوپر نیچے پیدا فرمائے۔ رحمان کے پیدا کیے ہوئے میں تو کوئی کمی بیشی نہیں دیکھے گا۔ پس نگاہ کو لوٹا، کیا تجھے کوئی کٹی پھٹی جگہ نظر آتی ہے؟''

آسمان کتنی بڑی دلیل ہے۔ آسمان پہ ستاروں کے بے شمار جھرمٹ، بادلوں کے اڑتے ہوئے مرغولے، پھر آسمان سے نزول کرتی بارش اور سات رنگوں سے مزین قوسِ قزح، رات کی تاریکیوں کو چیرتا ماہتاب اور اس کی معیت میں شب بھر ٹمٹماتے تارے، آگ برساتا سورج اور پھر ان میں قائم ایک ترتیب، ایک تنظیم، ایک نظام اور ایک سلیقہ۔ کیا یہ ایسا ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے؟

سورج روزانہ کس پابندیٔ وقت سے طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ صدیاں بیت گئیں کبھی اس کی چال میں، رفتار میں یا اوقات کار میں فرق نہیں آیا۔ یہاں تک کہ تم کئی کئی سال پہلے ہی اس کے اوقات ترتیب دے لیتے ہو، کیلنڈر بن جاتے ہیں، ڈائریاں اور جنتریاں چھپ جاتی ہیں، جن میں طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کے منٹ اور گھنٹے ہی نہیں سیکنڈ تک متعین ہوتے ہیں۔

زمیں کی کوکھ بھی اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلائل وعلامات سے بھری ہوئی ہے۔

مردہ زمین جس کے بطن سے انگوریاں نکلتی ہیں۔ سرسبز و شاداب پودے اگتے ہیں۔ ایک دانہ بوتے ہو تو سترہ سترہ دانے زمین تمھیں واپس پلٹا دیتی ہے۔ زمین جس کی کوکھ سے معدنیات نکلتی ہیں۔ خزانے نکلتے ہیں۔ یہ کس نے چھپایا ہے اتنا کچھ اس زمین کے اندر، کوئی ہے اس سارے نظام کے پیچھے یا نہیں؟ یہ سارا نظام ہستی جو چل رہا ہے، کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے۔

مگر یہ سمجھتے ہیں نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ انھیں اللہ نے عقل دی تھی، شعور دیا تھا اور فہم و فراست کی صلاحیت دی تھی مگر انھوں نے کسی سے کبھی کام نہ لیا، انھوں نے اپنی زندگی جانوروں کے ڈھب میں ڈھال لی کہ دیکھتے تو جانور بھی ہیں، ان کی بھی آنکھ ہے، کان ہیں اور وہ دل بھی رکھتے ہیں مگر وہ شعور نہیں رکھتے جو انسانوں کو ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن ادھر کئی انسان ہیں جنھوں نے اپنے شعور سے کام نہ لے کر خود کو جانوروں کی سطح تک گرا لیا ہے۔

انھوں نے اپنے آپ کو غفلت کے اس مقام پر پہنچا لیا ہے کہ دل و دماغ سے کام ہی نہیں لیتے، اپنی مقصدِ تخلیق تک سے غافل ہو گئے ہیں، جانوروں کی طرح کھانا پینا اور شام کو سو رہنا ان کا معمول بن کے رہ گیا ہے۔ تو یہ لوگ کون ہیں؟ اور ایسے طرزِ فکر و طرزِ عمل کے لوگوں کا انجام کیا ہے؟ اللہ محفوظ رکھے یہ جہنم میں وارد ہونے والے لوگ ہیں:

﴿ وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ﴾ [الأعراف : ١٧٩]

”اور بلا شبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن کے ساتھ وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن کے ساتھ وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن کے ساتھ وہ سنتے نہیں، یہ لوگ چوپاؤں جیسے ہیں، بلکہ یہ زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں، یہی ہیں جو بالکل بے خبر ہیں۔“

ایسے لوگ جو کائنات کی کھلی کتاب کو دیکھتے ہیں مگر اس کا مطالعہ نہیں کرتے، وہ اپنی اپنی

بے حسی کی بند گلیوں میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ ارد گرد بکھرے دلائل ملاحظہ نہیں کرتے کائنات میں پنہاں وعیاں رب کی ربوبیت والوہیت کے دلائل نہیں دیکھتے تو وہ ایک سورۂ یوسف کی دلیل سے کیا ایمان لائیں گے، اے پیغمبر! یہ اپنا طریقہ اور روش جاری رکھیں گے، آپ اپنی مبارک دعوت جاری رکھیے۔

تاہم جس کے قلب میں احساس اور ذہن میں شعور ہے۔ جو سوچنا جانتا ہے اور جو پرکھ سکتا ہے۔ جسے تحقیق اور جستجو سے کوئی تعلق ہے وہ ضرور اس سے راہِ راست پہ آ جائے گا۔ باقی سب ایسے ہی ہیں زندوں کی شکل میں مردہ لاشیں، سو آپ ان کی فکر چھوڑیئے ان سے ان کا رب نمٹ لے گا۔ یہ نہیں ایمان لانے والے۔

❀❀❀

مسلمان بھی اور مشرک بھی؟

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ ﴿١٠٦﴾

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

یہ آیت اس حوالے سے بڑی اہم ہے کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ کافر تو رہے ایک طرف خود اہل ایمان بھی اکثر ایسے ہیں جو ایمان لانے کے بعد بھی حیلے بہانوں سے شرک کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور خطرناک بات ہے کہ کافر اور مشرک کو تو صاف پتا ہے کہ وہ شرک کر رہا ہے مگر یہ مسلمان بے چارہ ایک طرف کفار کو مشرک سمجھتا ہے دوسری طرف خود بھی گاہے شرک میں مبتلا ہے مگر اس کو پتا ہی نہیں کہ اصلاح کی فکر بھی کرے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ شرک والی آیات تو مکہ کے کافروں کے لیے ہیں آپ انھیں مسلمانوں پہ چسپاں نہ کریں۔ بھئی آیات سارے زمانوں اور سارے انسانوں کے لیے ہیں۔ جس وصف کی مذمت یا مدح کے لیے جو آیات نازل ہوئیں وہ قیامت تک کے ایسے وصف والے

انسان پر چسپاں ہوتی رہیں گی۔ پھر یہ آیت کتنا واضح اور دو ٹوک بتا رہی ہے کہ اہل ایمان میں سے تھوڑے نہیں، بہت سے لوگ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ لوگ کلمہ بھی پڑھ لیتے ہیں، اپنے آپ کو مسلمان بھی کہلا لیتے ہیں ایمان والوں میں اپنے آپ کو شامل بھی کر لیتے ہیں اور نام بھی مسلمانوں والے رکھ لیتے ہیں لیکن اپنے ملک کے اندر سفر کر کے دیکھ لیں، آپ کو کسی درخت پر کپڑے بندھے نظر آئیں گے۔ ہری شاخوں پر سرخ ٹاکیاں بندھی دکھائی دیں گی۔ کیا ہے جی کہ اس درخت کے نیچے بزرگوں نے آرام فرمایا تھا، بس یہاں برکت ڈال گئے ہیں اور اب ہم نے یہاں سے برکتیں اکٹھی کرنی ہیں۔ افسوس اس اصل برکتوں والے رب کو چھوڑ کر کتنے دھوکے میں ہیں یہ لوگ ان درختوں سے ان پتوں سے برکتیں حاصل کرتے ہیں، کوئی بے چارہ کہیں بھٹکتا پھرتا ہے کوئی کہیں جاتا ہے، کہیں گدیاں بنی ہیں، آستانے بنے ہیں۔ شرک کی بھی ایک دعوت ہے اور دعوت دینے والے بھی آپ کو بہت ملیں گے، چنانچہ اس کو اللہ تعالیٰ نے افسوس کے ساتھ بیان کیا ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ﴾ [یوسف : ۱۰۶]

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

یہ لوگ کلمہ پڑھیں گے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلائیں گے، ایمان کے دعوے دار بنیں گے مگر عقیدے وہ رکھیں گے جو مکے والے مشرکوں کے تھے، شرکیہ عقیدے۔ افسوس تو ان پر بھی ہے جو ہندو ہیں تین کروڑ خداؤں کے پجاری ہیں، بے وقوف تو وہ بھی ہیں، انسانیت سے گرے ہوئے تو وہ بھی ہیں جو کیڑوں مکوڑوں کو بھی خدا سمجھتے ہیں جو بندر کو سب سے بڑا خدا سمجھتے ہیں، ہنومان ان کا رب ہے، ہنومان کیا ہے؟ بندر! اور ہر وہ چیز جس کا تھوڑا سا خوف ہو اس کو وہ رب سمجھتے ہیں۔ آلۂ تناسل کو بھی خدا سمجھتے ہیں۔ افسوس ان پر بھی ہے بظاہر دیکھیے انفارمیشن ٹیکنالوجی میں کیا کیا مہارتیں حاصل کر رکھی ہیں، ہندوؤں نے اس فیلڈ میں

کتنا کام کیا ہے، پر احمقوں کو اتنا پتا نہیں ہے کہ رب کون ہے۔ اتنے عقل کے مارے ہوئے ہیں لیکن اس سے زیادہ افسوس ان مسلمانوں پر ہے جو کہتے ہیں، ہم تین کروڑ خداؤں کی پوجا نہیں کرتے ہمارا رب ایک ہے، یہ لوگ کلمہ پڑھ کے مسلمان تو ہو گئے لیکن عقیدے پھر بھی ہندوؤں والے ہی رکھے۔ افسوس ان پر زیادہ ہے، یہ رسم و رواج انھی کے چلاتے ہیں اور ان میں بدعات وخرافات ایمان کے بعد بھی جاری ہیں۔ کیسا ہے ان کا طرزِ عمل! زندگی میں کبھی کبھار عید پڑھنے آ جائیں گے لیکن جب بیٹی یا بیٹے کی شادی ہو گی تو ہندو اور مسلمان کی شادی میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔ ایک جیسے رسم و رواج، ایک جیسے طور طریقے، ایک جیسا کلچر، ایک جیسا عقیدہ اور سب ایک جیسے معاملات، دلیلیں وہی دیں گے جو ہندوؤں کے پاس اپنی مڑیوں کی پوجا کے لیے ہیں، مسلمانوں کے پاس قبروں کی پوجا کی بھی وہی دلیلیں ہیں، کوئی فرق نہیں ہے۔ تو کیا خیال ہے ان حالات میں مسلمان کہلوانے والوں پر افسوس ہے ہونا چاہیے نا...... اسی کو پھر اللہ نے بیان بھی فرمایا ہے:

﴿ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُم بِاللَّهِ إِلَّا وَهُم مُّشْرِكُونَ ﴾ [یوسف : ١٠٦]

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ نے اکثر کہا ہے اور جو کچھ اللہ نے کہا ہے ہم وہی دیکھ بھی رہے ہیں، اکثر لوگ ابھی بھی شرک کے اندر مبتلا ہیں۔ صحیح ایمان والے، صحیح عقیدے والے، صحیح توحید والے لوگ بہت تھوڑے نظر آئیں گے گو کہ انبیاء کی دعوت سب کے لیے تھی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ اے نبی! ہم نے آپ کو تمام انسانوں، قوموں اور علاقوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ آپ نے اپنی دعوت کو محدود دائروں تک رکھنا ہے۔ یہ نہیں کہ آپ نے اپنی ایک چھوٹی سی جماعت بنا لینی ہے۔ ایک چھوٹا سا گروہ منظم کر لینا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کرنا، نہیں نہیں بھائی، اسلام کی دعوت میں توحید کی دعوت میں عموم ہے۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ کہ ہر شخص اور ہر قوم تک دعوت پہنچنی چاہیے یہ عموم ہے۔ یہ الگ

بات ہے کہ ماننے تھوڑے ہیں اور زیادہ غلط عقیدوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، لیکن ہمارا فرض لا الہ الا اللہ کی دعوت کو محدود دائروں میں بند رکھنا نہیں بلکہ سب تک پہنچانا ہے۔ تاہم یاد رہے اس دعوت کو دلوں میں ڈال کر پھر لوگوں کو مسلمان بنا دینا ہمارے بس میں نہیں ہے یہ اللہ کا کام ہے۔ یہ مسئلہ تقدیر ہے۔ ہمارا مسئلہ محنت اور تدبیر کا ہے تقدیر کا نہیں۔ تو اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے کہہ دیا کہ زیادہ تو مشرک ہی رہیں گے تو پھر تمھیں زیادہ تکلیف اور زیادہ بھاگ دوڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ نہیں سوچنا۔ اس آیت کا یہ معنی بالکل نہیں ہے۔ ایسی غلط فہمی بالکل نہیں ہونی چاہیے، ایسے بہت سارے دیکھے ہیں۔ ''اوہ چھوڑو جی، چھوڑو، انھوں نے تو کرنا ہی شرک ہے، بدعتی کو کیا کہنا، کیا سمجھانا اور کیا دعوت دینا۔'' یہ مطلب بالکل نہیں ہے اس آیت کا، قطعاً اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، کیا نبی ﷺ نے دعوت کو اس طریقے سے محدود رکھا تھا۔ بعض لوگوں کے متعلق تو اللہ نے اپنے نبی کو بتا بھی دیا تھا کہ انھوں نے نہیں ماننا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو منافقوں کے بارے میں بتا دیا تھا ان کے نام بھی بتا دیے تھے کہ یہ یہ منافق ہیں اس کے باوجود نبی ﷺ نے دعوت عام رکھی تھی۔ اللہ نے ہمیں تو نہیں بتایا ہمارے پاس تو اللہ نے کوئی فیصلہ نہیں بھیجا کہ تو جتنی بھی محنت کرے فلاں نے مشرک کا مشرک ہی رہنا ہے، اس نے منافق کا منافق ہی رہنا ہے، ہمارے پاس تو اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

عبداللہ بن ابی مر گیا۔ ان کا بیٹا بڑا مخلص مسلمان تھا آ کر کہنے لگا، اے اللہ کے نبی! میرے باپ نے ساری زندگی آپ کو بہت ستایا ہے، پر وہ مر گیا ہے تو میری خواہش ہے کہ آپ اس کا جنازہ پڑھا دیں۔ نبی ﷺ تیار ہو گئے بلکہ اپنی قمیص مبارک بھی دی کہ کفن کے نیچے قمیص پہنا دینا، نبی ﷺ کے اخلاق بھی کس قدر اعلیٰ ہیں کہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والا، عبداللہ بن ابی، وہ نبی کے گھر پر ہاتھ ڈالنے والا، ہر موقع پر سازشیں کرنے والا، اسلام کو نقصان پہنچانے والا یہودیوں سے ساز باز کر کے مسلمانوں کو ایذا پہنچانے والا شخص ہے مگر نبی ﷺ نے جا کر اس کا جنازہ پڑھا دیا، جب جنازہ پڑھانے نبی ﷺ گئے ہوں گے تو

بہت سارے صحابہ بھی گئے ہوں گے۔ میں عجیب حکمت دیکھ رہا ہوں کہ اللہ پہلے بھی تو روک سکتا تھا کہ اے نبی ! جنازہ نہیں پڑھانا، وحی پہلے بھی آ سکتی تھی لیکن نہیں آئی، جب جنازہ پڑھا دیا تو پھر کہا:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ﴾ [التوبة : ٨٠]

”اے نبی ! آپ ان کے لیے بخشش طلب کریں یا نہ کریں اللہ نے معاف نہیں کرنا، اللہ کا یہ فیصلہ ہے۔“

آپ دیکھتے ہیں کہ اللہ نے تو اپنے نبی کو بتا دیا تھا کہ یہ منافق ہے نبی ﷺ نے صحابہ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو کچھ نام بتائے تھے، سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ڈرتے تھے اور چپکے چپکے پوچھتے تھے، اے حذیفہ! کہیں ان میں میرا نام تو شامل نہیں ہے، دیکھو کتنے پکے اہل ایمان تھے لیکن اپنے ایمان کی فکر بھی کتنی تھی۔ وہ یہ فکر ہمیں بھی ہونی چاہیے، ایمان کا یہ شعور و احساس ہمیں بھی ہونا چاہیے۔ بہر حال نبی ﷺ کا انداز ذرا دیکھو کہ جس نے اتنی دشمنی کی ہے اس کے ساتھ بھی رویہ نبی کریم ﷺ کا کیسا ہے تو بعد میں وحی آنے میں شاید یہی حکمت پوشیدہ ہے کہ کبھی یہ نہیں کہنا یہ مشرک ہے اسے دعوت نہیں دینا اگر آج مشرک ہے تو ممکن ہے کل آپ کا ساتھی بنے، ممکن ہے اس کا توحید کا عقیدہ ہم سے بھی اچھا ہو جائے اور پھر وہ میدانوں میں ہم سے پہلے پہنچ کر رب کی جنتوں میں چلا جائے اور ہم دیکھتے ہی رہ جائیں۔

اور ایسا ہوا بھی ہے، آپ نے اپنے سامنے دیکھا ہے کہ اسی معاشرے سے وہ شرکیہ عقیدے رکھنے والے آئے، آ کر ان کی توحید اتنی پکی ہوگئی کہ ہم ایسے لوگ ان کو اپنے لیے مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں، ہم ان کو مثال سمجھتے ہیں کئی ان میں سے شہید ہو گئے ہیں، کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ماں باپ مخالفت کرتے ہیں، روکتے ہیں، لیکن دیکھ لو وہ کسی چیز کی پروا نہیں کرتے، خاندانوں نے بہت سے لوگوں کا بائیکاٹ کیا ہوا ہے لیکن یہ کتنے مخلص ہیں، تو بھائیو! کسی کے بارے میں فتوے نہ دیا کرو، آپ اپنی دعوت کا کام کرو، اخلاص، اخلاق

اور محبت کے ساتھ، فیصلہ تو رب العالمین کا ہے، ماننا ہے یا نہیں ماننا اس کا کام ہے، توفیق دینا اللہ کا کام ہے، ہمارا کام بس پہنچا دینا ہے۔سو اس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

نبی ﷺ اتنی دعوت دیتے تھے، بار بار رابطے کرتے تھے، بار بار جاتے تھے کہ اللہ نے کہا اے میرے نبی ! کہیں آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی نہ کر بیٹھو کہ یہ مسلمان کیوں نہیں ہوتے، ایمان والے کیوں نہیں ہو جاتے، اتنی محنت کی میرے نبی نے کہ اللہ کو ترس آ گیا اور اللہ نے ترس کھا کر کہا، اے نبی ! آپ اتنی محنت کرتے ہیں، اتنا کام کرتے ہیں اور اتنا بار بار پیچھے پڑ کے یہ دعوت پہنچاتے ہیں، کہیں آپ اپنے آپ کو ہلاک ہی نہ کر بیٹھیں۔ ہمارے لیے بھی دعوت کا مزاج وہی ہے اس لیے بھائیو! دعوت کا اسلوب سمجھو، انبیاء کی دعوت کا انداز دیکھنے کی کوشش کرو اور فتویٰ بازی نہ کرو، لوگوں کو کافر کہنے کی بجائے دعوت و تبلیغ کا کام کرو۔ نفرتیں پھیلانے کی بجائے دعوت پھیلاؤ۔ دعوت دلیل کی قوت، اچھے اخلاق اور مسلسل محنت سے پھیلتی ہے۔ دعوت میں بہت زیادہ صبر کرنا پڑتا ہے۔ آج کی بڑی خرابی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی کافر قرار دینے پر کوشش ہو رہی ہے جبکہ حکومت سے لے کر عوام تک دعوت دینی چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے ابھی اس اسلوبِ دعوت کو سمجھا ہی نہیں۔

❀❀❀

رب کے باغی ڈرتے کیوں نہیں؟

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٠٧﴾

”تو کیا وہ بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر اللہ کے عذاب میں سے کوئی ڈھانک لینے والی آفت آ پڑے، یا ان پر قیامت اچانک آ جائے اور وہ سوچتے بھی نہ ہوں۔“

اللہ فرماتے ہیں کہ یہ کس طرح نڈر ہو کر شرکیہ عقیدے میں مبتلا ہیں۔ اللہ کی ذات اور اس کی صفات میں شرک کرتے ہیں، بہت سوں کو اللہ کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں، پھر مختلف

انداز و اطوار میں ڈھکے چھپے یا کھلم کھلا ان کی عبادت کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان کو اس بات سے ڈر نہیں لگتا کہ اس سے اللہ کتنا ناراض ہو گا۔ بھائی شرک سب سے زیادہ اللہ کو ناراض کرنے والی چیز ہے، کیوں کہ کائنات میں سب سے بڑی حقیقت اللہ کی توحید ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی غلطی شرک ہے، تو شرک کرنا اور شرکیہ عقیدے رکھنا اللہ کو بہت ناراض کرنے والی چیز ہے اور پھر جب ایک دو کریں تو اللہ قوموں پر عذاب نہیں لاتا لیکن جب یہ وبا پھیلنے لگ جائے اور عام لوگوں تک پھیل جائے، اکثر لوگ شرک کے مرتکب ہو جائیں تو پھر اللہ کے عذاب کا کوڑا ضرور برستا ہے، پھر انھیں اللہ چھوڑتا نہیں، یہ قرآن کہہ رہا ہے:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ﴾ [الروم: ٤١، ٤٢]

”خشکی اور سمندر میں فساد ظاہر ہو گیا، اس کی وجہ سے جو لوگوں کے ہاتھوں نے کمایا، تاکہ وہ انھیں اس کا کچھ مزہ چکھائے جو انھوں نے کیا ہے، تاکہ وہ باز آ جائیں۔ کہہ دے زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے، ان کے اکثر مشرک تھے۔“

اللہ فرماتے ہیں، ان لوگوں سے کہو کہ تم قوموں کی تاریخ جانتے ہو کہ عرب کے ان خطوں میں پہلے کون کون لوگ رہے ہیں اور اس شرک کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کے کیسے کیسے عذاب ان پر آئے ہیں۔ تم سب جانتے ہو۔ ان سے کہو ذرا چل پھر کے دیکھیں تو سہی کیا یہ حقیقت ان کی اب تک سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قوم کے اکثر لوگ مشرک ہو جاتے تھے تو اللہ کی طرف سے عذاب نازل ہوتا تھا، یہ اللہ کا قانون ہے اللہ کا یہ نظام ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ بتا رہے ہیں کہ جب من حیث القوم شرک کا ارتکاب کیا جا رہا ہو تو پھر ایسی قوم عذاب سے نہیں بچ سکتی۔ آج آپ پاکستان میں فروغِ شرک دیکھتے ہیں تو پھر ساتھ ساتھ

دیکھیے آج یہ قوم کس قدر مصائب و مسائل کا شکار ہے۔ طرح طرح کے عذاب مسلط ہو کر رہ گئے ہیں تو اس سے بچنے کے لیے ہمیں پوری طرح اللہ کی توحید لازم پکڑنا چاہیے۔ ورنہ معاملہ حل نہ ہو گا۔

❀❀❀

رسول کی دعوت کا منہج کیا ہے؟

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۰۸

’’کہہ دے یہی میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، پوری بصیرت پر، میں اور وہ بھی جنھوں نے میری پیروی کی ہے اور اللہ پاک ہے اور میں شریک بنانے والوں سے نہیں ہوں۔‘‘

رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے کہ آپ لوگوں کو بتا دیں کہ آپ کی دعوت ذاتی مفاد کی طرف نہیں ہے یہ کوئی معاشرتی، معاشی یا اقتصادی دعوت بھی نہیں ہے بلکہ یہ تو دعوت الی اللہ ہے۔ دراصل دعوت ہمیشہ اِلی اللہ یعنی پورے دین کی طرف ہونی چاہیے۔ کچھ لوگ دین کے دسترخوان سے اپنی اپنی پسند کے لقمے چن لیتے ہیں اور پھر اس کی دعوت دیتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس کو پورا دین سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ کچھ لوگوں کو ہمارے بارے میں بھی یہی غلط فہمی ہے کہ شاید ہم نے جہاد کے علاوہ دین کی باقی دعوت کو فراموش کر رکھا ہے۔ ہرگز نہیں، درست ہے کہ عصر حاضر میں جہاد کی ضرورت و اہمیت دو چند ہو گئی ہے اور اکثر مسلمان رنگا رنگ تاویلات کا شکار ہو کر جہاد چھوڑ چکے ہیں۔ نفس کے لیے سہل چند دوسری چیزوں کو جہاد قرار دے کر یہ لوگ خوش ہیں کہ جہاد کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ پاکستان میں کیوں جہاد نہیں کرتے۔ یاد رکھیے جہاد کتاب و سنت کے قواعد و ضوابط اور حدود و آئین کی پابندی سے کیا جانے والا ایک نہایت

اعلیٰ اور منظم عمل ہے۔ کسی کی اپنی من مانی کا نام جہاد نہیں۔ جیسے نماز، روزہ اور حج وزکوۃ کے لیے رسول اکرم ﷺ کی سیرت ہمارے لیے نمونہ ہے ایسے ہی جہاد کے اسلوب بھی سیرت ہی سے لیے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں منافقین کی موجودگی کے باوجود ان سے جہاد یعنی قتال نہیں کیا۔

سو یہی ہمارا بھی عمل ہے اور ہماری دعوت بھی پورے اسلام کی دعوت ہے۔ توحید سب سے مقدم ہے۔ اس کے بغیر تو جہاد بھی قبول نہیں۔ ہم جہاد کی بات بعد میں کرتے ہیں اور عقیدہ توحید پہلے سکھاتے ہیں۔ یہی منہج رسول ہے اور یہی سلف کا طریقہ کار ہے۔ پھر بتایا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت بصیرت پر مبنی دعوت ہے۔ بصیرۃ کا مطلب ہے وحی، رسول وحی کی بصیرت کی روشنی میں دین کی دعوت کا کام کرتا ہے اور اس کے پیروکاروں کے لیے بھی طریقہ یہی ہے کہ وحی کی روشنی میں دعوتِ دین کا کام کریں۔ آخر میں پھر بتا دیا کہ میرا کام یہی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی بیان کرتا رہوں۔ لوگ شرک کریں تو میں اس آلودگی شرک سے رب کی صفات نکھارتا رہوں، اس لیے کہ مشرکین کا اپنا فعل ہے، وہ شیطان کی صفوں میں کھڑے رب کو للکارتے ہیں تو میں ان میں سے نہیں، میں رحمان کی دعوت کا امین ہوں۔

دعوت الی اللہ نبیوں والا کام ہے۔ یہی صحابہ کا کام رہا ہے، چنانچہ یہی ہمارا طرزِ عمل ہونا چاہیے۔ آیت مبارکہ میں دعوت کو بصیرت سے وابستہ رکھا گیا ہے۔ بصیرت میں ہر نبی پر اترنے والی وحی مراد ہے کیونکہ ہر نبی کو اللہ ہر قسم کے حالات میں دعوت کے طریقے سمجھاتا تھا۔ بصیرت میں دعوت کے اسلوب کو سمجھنا بھی شامل ہے۔ مختلف اسالیب اور طریقوں میں حالات کے اختلاف کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ توحید تو ایک ہی ہے لیکن ہر نبی کے لیے حالات مختلف رہے ہیں۔ آج بھی آپ کو دونوں چیزیں مدنظر رکھنا ہیں، حالات کو سمجھنا ہے اور دعوت توحید کو ہر صورت قائم رکھنا ہے۔ حالات کو دعوت کے تابع کرنا ہی بصیرت ہے۔ بعض

لوگ حالات کے تقاضوں کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دعوت ہی کو گدلا کر بیٹھتے ہیں۔ یہ بصیرت نہیں اگرچہ اس کا نام لوگوں نے بصیرت رکھ چھوڑا ہے۔

❀❀❀

سنت اللہ کا ایک عالمگیر اصول

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٠٩﴾

''اور ہم نے تجھ سے پہلے نہیں بھیجے مگر کچھ مرد، جن کی طرف ہم ان بستیوں والوں میں سے وحی کیا کرتے تھے، تو کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیسا ہوا جو ان سے پہلے تھے اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو متقی بنے۔ تو کیا تم نہیں سمجھتے؟''

اس آیت میں متعدد مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اللہ رب العزت نے اپنا ایک یہ اصول بیان فرمایا کہ آج تک جتنے رسول مبعوث ہوئے، وہ سب کے سب مرد تھے۔ عورتیں اس سلسلے میں مردوں کے تابع ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد جن احمقوں نے نبوت کے جھوٹے دعوے کیے ان میں ایک عورت بھی تھی۔ ایک جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب نے اس سے شادی کر لی تھی۔ یہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کی بات ہے، بعد ازاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جہادی یلغار سے جھوٹی نبوتوں کے اس اکٹھ کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ بہر حال یہ طے ہے کہ اللہ رب العزت نے اعزازِ نبوت کا وقار صرف مردوں کو بخشا ہے۔ کسی نوری یا ناری مخلوق کو بھی یہ اعزاز عطا نہیں فرمایا، یہ رفعت و بلندی ایک خاکی ہی کے حصے میں آئی ہے۔

پھر فرمایا: «نُوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ» یعنی یہ نہیں کہ جس کا دل چاہا اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، نہیں، بلکہ اللہ رب العزت کی طرف سے باقاعدہ سلسلۂ وحی کا آغاز ہوتا تھا۔ نورِ ہدایت کی روشنی آتی تھی، نبی سب سے پہلے خود وحی پر ایمان لاتے تھے اور پھر جمیع انسانوں کے سامنے

یہ دعوت پیش کرتے تھے۔

بعد ازاں آیت میں منکرینِ نبوت، جو تب کفارِ مکہ تھے، کے متعلق فرمایا کہ کیا انھیں رب کی پکڑ، اس کے عذاب و آفات سے ڈر نہیں آتا۔ کیا یہ اپنے ارد گرد قومِ عاد و ثمود کے جا بجا بکھرے نشان ہائے عبرت نہیں دیکھتے، کہ جب انھوں نے رسول کو جھٹلایا تو پھر کس قدر شدت و سختی سے انھیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ یہ ان چیزوں سے عبرت اور سبق کیوں حاصل نہیں کرتے۔

بعد ازاں اللہ رب العزت نے نبوت کے انکار کے سلسلے میں ایک اہم رکاوٹ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وہ ہے مادہ پرستی، جعلی عزت اور جھوٹی انا، جو حبِ دنیا اور حبِ جاہ کی شکل میں دین کی طرف آنے میں ہمیشہ اور اکثر رکاوٹ بنتی ہے۔ تاہم جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، ان کا مطمحِ نظر دنیا نہیں ہوتی، وہ آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں۔ دنیا کے بندے، مادہ پرست تو دنیا کے لیے محنت کرتے ہیں، وہ اپنی اقتصادیات و معاشیات کے لیے سر توڑ محنت و کاوش کرتے اور خوش رہتے ہیں کہ کیا عروج و ترقی پائی ہے مگر اللہ رب العزت نے اس اہم ترین نکتے کی وضاحت فرما دی کہ انسان کے لیے آخرت کا انتخاب کہیں اچھا اور کہیں عمدہ چناؤ ہے۔ وہ اہل دنیا نہیں بلکہ وہ جو تقویٰ شعار ہوتے، جو تقویٰ کی بنیاد پر عمل کرتے ہیں، وہی اصحابِ بصیرت اور اربابِ عقل و دانش ہیں اور انھیں کی کمائی بہترین اور انھی کا زادِ راہ عمدہ ترین ہے۔ قرآن مجید نے تو دنیا و آخرت ہر دو کی حیثیت و حقیقت نہایت وضاحت و فصاحت سے کھول کر بیان کر دی ہے تو اب تم کیوں عقل نہیں کرتے؟

❀❀❀

دعوت، پھولوں کا تاج نہیں کانٹوں کا بستر

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَايْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۰﴾

"یہاں تک کہ جب رسول بالکل ناامید ہوگئے اور انھوں نے گمان کیا کہ بے

شک ان سے یقیناً جھوٹ کہا گیا تھا تو ان کے پاس ہماری مدد آ گئی، پھر جسے ہم چاہتے تھے وہ بچا لیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے ہٹایا نہیں جاتا۔''

یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ دعوت پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ جتنا اس کا اجر ہے اور جتنی اس میں روحانی تسکین ہے، اتنا ہی یہ مرحلہ کٹھن بھی ہے۔ یہاں آزمائشیں اور تکلیفیں ہر آن رو برو ہوتی ہیں۔ نبی کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کٹھنائیوں کا سفر اور اذیتوں کی راہِ گزر۔ نورِ ہدایت کے فروغ کا یہ سفر مشکلات و مصائب کے سایوں میں طے ہوتا ہے۔ یہاں اپنوں اور بیگانوں ہر دو کی طرف سے طعن کے تیر ہوتے ہیں اور دشنام کی سنگ باری ہوتی ہے اور مقابل بس توکل، تحمل اور صبر و برداشت کی ڈھال ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھی ایسی ہی تھی۔ جیسا کہ ابتدائے سورت میں ذکر ہوا۔ یہ سورۂ بھی ایسے ہی تنگ و ترش اور تند و تلخ حالات میں بطور تسلی نازل ہوئی تھی تو یہاں رسول اللہ ﷺ کو بتایا جا رہا ہے کہ مشکلات و مصائب کا یہ معاملہ صرف آپ کے ساتھ ہی خاص نہیں۔ یہ سنت پہلے بھی ہر نبی کے ساتھ جاری رہی ہے۔ اتنی محنت و ریاضت اور اتنے خلوص کے باوجود جب منکرین کی ضد اور عناد نرم نہیں پڑتا تھا تو رسول سوچنے پہ مجبور ہو جاتے تھے قدرے مایوس ہو جاتے تھے کہ آیا یہ لوگ ایمان لائیں گے بھی کہ نہیں؟ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب رسولوں کی دعوت کو فوری پنپتے نہ دیکھا تو دعوت کے مخاطبین یہ سمجھنے لگے کہ شاید خود رسولوں ہی سے جھوٹ بولا گیا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آزماتا ہے۔ کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ کون اک ذرا سی آزمائش سے منہج بدل لیتا ہے اور کون ہے جو رکاوٹوں کے مقابل تن کے کھڑا ہو جاتا ہے، بہر حال آزمائش سے اللہ تعالیٰ کی عافیت طلب کرنا چاہیے اور دین کی دعوت اور جہاد کے نتائج کے سلسلے میں جلد بازی اور عجلت پسندی اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ صبر، حوصلے اور استقامت سے تکالیف برداشت کرنی چاہییں اور رب کے وعدوں پر یقین رکھتے ہوئے مدد اور نصرت پہ ایمان رکھنا چاہیے۔ دیکھیے انبیائے کرام کے منہج کی

مشکلات کے حوالے سے واضح کیا جا رہا ہے کہ جب مشکلات انتہا پر پہنچتی ہیں اور مرحلہ یہ آ تا ہے کہ ہر طرف مایوسیاں ہونے لگتی ہیں تو اللہ کی رحمت مدد کی شکل میں اتر پڑتی ہے اور تب ایسے مناظر سامنے آتے ہیں کہ جن کی بندہ توقع بھی نہیں رکھتا ہوتا، ابتلا اور آزمائشیں بھی اللہ کی سنت ہیں اور بندوں کی مدد کرنا بھی اللہ کی سنت ہے۔ داعیانِ حق کو اللہ کی سنتوں کی آگاہی سے خوب بہرہ ور ہونا چاہیے پھر ہی داعی میدان دعوت میں کامیاب ہوتا ہے اس کے لیے دعوت الرسل کو خوب سمجھنا چاہیے۔ خصوصاً ان واقعات کے حوالے سے جو قرآن نے بیان کیے ہیں۔

❀❀❀

قرآنی قصوں پر دو رویے

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴿١١١﴾

"بلاشبہ یقیناً ان (قصوں) کے بیان میں عقلوں والوں کے لیے ہمیشہ سے ایک عبرت ہے، یہ ہرگز ایسی بات نہیں جو گھڑ لی جائے اور لیکن اس کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے ہے اور ہر چیز کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔"

آخر میں فرمایا کہ یہ جو ہم واقعات اور قصص بیان فرماتے ہیں تو اس میں اہل عقل و دانش کے لیے بڑی نصیحت، بڑی عبرت اور بہت بڑا سبق ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ یہ سبق صرف 'اولی الابصار' یعنی بصیرت و دانش رکھنے والے ہی حاصل کر پائیں گے، احمق اور بے عقل ہرگز نہیں۔ یہ لوگ کبھی اللہ تعالیٰ کی آیت وقصص سے عبرت حاصل نہیں کر پاتے، یہ ہر معاملہ معروضی حالات کے کھاتے میں ڈال کر عقل پر قفل چڑھائے رکھتے ہیں۔ حالانکہ

یہی کائنات، اس میں تسلسل و تواتر سے چلتا ہوا نظام اور پھر قرآن مجید کی زندہ جاوید آیات سے عقل والے وعظ و درس لے کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔

چنانچہ آخر میں رسول اللہ ﷺ کو ایک بار پھر تسلی دی جا رہی ہے کہ گو یہ سورۂ بہت بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں نے خود آپ سے یہ قصہ سنانے کو کہا تھا۔ آزمائش کہ آیا آپ بتا بھی سکتے ہیں کہ نہیں، اب جبکہ وحی الٰہی کی روشنی میں آپ نے سب بتا دیا تو اصولاً انھیں آپ پر ایمان لے آنا چاہیے مگر یہ بات ذہن نشین رکھیے گا کہ قرآن اور اس میں مذکور قصے صرف اہل عقل و دانش ہی کے لیے ہی موثر، معتبر اور پر اثر ہیں، جو غور کرنا ہی نہیں چاہتے، ان کے لیے انتہائی مؤثر دعوت بھی بے اثر ہے، مگر آپ تسلی رکھیے ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ تاہم یہ اہل ایمان کے لیے ضرور مفید اور مؤثر ثابت ہو گی۔ ارباب بصیرت اور اہل ایمان اس قصہ سے اپنے ایمان میں اور اضافہ محسوس کریں گے۔

قرآن نے قصص انبیاء کی ایسی تفصیلات بیان کی ہیں کہ داعیانِ اسلام کے لیے ان میں بڑی رہنمائی ہے اور جب مخلص داعی اللہ کی رہنمائی میں محنت کرتا ہے تو اسے اللہ کی رحمت ملتی ہے۔ اسے اللہ کی طرف سے تسلیاں حوصلے اور مزید محنت کی توفیق میسر آتی ہے۔ دعوتی کام کرتے ہوئے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کبھی داعی شکوک و شبہات میں گھرنے لگتے ہیں۔ وہ اختلاف کی مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کا اصل باعث یہ ہوتا ہے کہ داعیانِ دین قرآنی منہج کی بجائے اپنی پسند یا دوسرے کے بیان کردہ فلسفوں کے پیچھے چلتے ہیں۔ آیت میں اس کی اصلاح کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اسی پر سورہ کا اختتام ہوتا ہے۔ اللہ سمجھنے، سوچنے اور سچے دل سے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

«وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ، وَإِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ»



دارالاندلس ®
اسلام کی نشرواشاعت کا عالمی مرکز
۴۔لیک روڈ، چوبرجی لاہور، پاکستان
Ph: 92-42-7230549 Fax: 92-42-7242639 www.dar-ul-andlus.com